''چہارسُو''

۔۔۔۔ کتھا چار جنموں کی ۔۔۔۔

لدھیانہ کے رفیوجی کیمپ میں بیوہ ماں اور تین چھوٹے بہن بھائیوں کو چھوڑ کر شہر میں نکلا۔ چوڑا بازار میں ہفتہ وار ''صداقت'' کا سائن بورڈ دکھائی دیا۔ میرے پاؤں وہیں رک گئے۔ میز کے پیچھے ایک سردار جی بیٹھے تھے ''میرا نام ستیہ پال آنند ہے۔ میں اردو بہت اچھی لکھتا ہوں۔ کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ کیا کوئی نوکری ملے گی؟'' سردار جی نے نظر بھر کر دیکھا ''رہتے کہاں ہو؟'' ''نیچے زمین ہے اور اوپر آسمان'' سردار جی داڑھی کھجانے لگے۔ خوب، شاعروں کی طرح باتیں کرتے ہو۔ ملازمت ملے گی، لیکن پینتالیس روپے ماہوار کی۔

چنڈی گڑھ یونیورسٹی میں مجھے لانے کا جو احسان میرے لدھیانہ کے گورنمنٹ کالج میں استاد ڈاکٹر راج کمار نے کیا اسے میں کہاں بھلا سکتا تھا، اس لیے میں ہمیشہ ہی ان کا مرہونِ منت رہا، لیکن فیکلٹی میں کچھ لوگ ایسے تھے جن کی رفاقت میں بہت کچھ سیکھنے پر مجھے مجبور کیا پروفیسر ایش کمار جو خود اردو کے ادیب اور شاعر تھے اور آکسفورڈ سے ڈگری لے کر آئے تھے۔ ساٹھ برس کی عمر میں نوجوانوں کا سا دم خم رکھتے تھے اور اقبال پر سیر حاصل گفتگو کر سکتے تھے۔

منشی تلوک چندؔ محروم صاحب کی رائے کے مطابق میرا مزاج صرف نظم کے لیے موزوں ہے پھر جوش ملسیانی صاحب نے بھی اس بات کی تائید و تصدیق کی۔ اس کے بعد کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے ارشادات بھی قلمبند کر چکا ہوں ''اس نوجوان کو غزل کہنے پر مجبور نہ کریں۔ جس طرح کی نظمیں یہ لکھ رہا ہے کیا پتہ آنے والے برسوں میں ان کے بل بوتے پر اسے اردو کا شیلےؔ یا کیٹسؔ قرار دیا جائے۔''

مجھے ۱۹۵۷ء میں اپنی شادی کا دن یاد آتا ہے۔ باراتیوں میں نریش کمار شاد، پریم وار برٹنی، رام لال، کلام حیدری، موہن راکیش، رویندر کالیہ، کپل دیو، جوہر ادیب، ہیرا نند سوز، کرشن ادیب، سریندر پرکاش، کمار وکل، رمیش کپلا، شرون کمار ورما کے علاوہ ایک درجن سے زائد پنجابی شاعر اور نثر نگار شامل تھے۔

مجھے یہ باور کرنے میں کچھ تامل ہوا کہ اگر بریخت کہتا ہے کہ ادیب کو ایماندارانہ طور پر اپنی اس شخصیت **Persona** پر ہی بھروسا کرنا چاہیے جو اس کی تخلیقیت کا منبع ہے تو اس میں ترقی پسندوں کو اعتراض کیوں ہے؟ وہ ان ادیبوں پر الزام کیوں لگاتے ہیں کہ اکثر ادیب ایماندار نہیں ہیں اور ''بے تعلقی کے پردے میں عوام مخالف طاقتوں کا ساتھ دیتے ہیں۔'' نقّادوں کے استادِ گرامی احتشام حسین نے یہ لکھنے سے بھی گریز نہیں کیا: ''جب ہم موجودہ دور کے عالمی ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عوام دوست ادیب اپنی جانبداری کا اعلان کرتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں شعوری طور پر عوام کے مفاد کے لیے لکھتے ہیں، لیکن وہ ادیب جو سرمایہ دار حاکم طبقے کا ساتھ دینا چاہتے ہیں اپنی غیر جانبداری کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ان کا مشاہدہ اور تجزیہ ان سے کوئی ایسی چیز لکھوا دیتا ہے جس سے عام انسانوں کے مفاد کا کوئی پہلو نکلے تو اس کی تاویلیں کرتے ہیں۔''

''غزل ہماری شاعری کی جان ہے، روح ہے، آبرو ہے، ناموس ہے۔۔۔'' وغیرہ وغیرہ یہ الفاظ تو ہم بہت سُن چکے ہیں (میں نے ڈاکٹر نارنگ سے بجنسہ یہ الفاظ سُنے ہیں، ان سے اختلاف ضرور کیا ہے، لیکن بحث نہیں کی، کہ میں جانتا ہوں پانی کو بلونے سے کچھ نکلنے والا نہیں۔

بیکٹؔ کی بات پہلے ہو چکی ہے۔ اس نے موضوع سے زیادہ ''فارم'' اور اُسلوب کی طرف توجہ مبذول کی۔ جب ۱۹۶۹ء میں اسے نوبل پرائز سے نوازا گیا تو **Meta-literary** تجربات کے لیے تیار تھا۔ انہی تجربات سے مملو اس کی زندگی کی آخری تحریر **Stirrings Still** تھی۔ اس میں دیگر اُمور کے علاوہ بیکٹؔ نے ڈرامہ، فکشن اور شاعری کے درمیان حدودِ فاصل کو ملیا میٹ کرتے ہوئے (اپنی دانست میں) ایک نئی صنفِ ادب ایجاد کرنے کی سعی کی۔ لیکن نتیجہ جو برآمد ہوا وہ خاطر خواہ نہیں تھا۔ یہ تحریر اس کی پرانی تحریروں کی بازگشت بن کر رہ گئی اور نقّادوں نے اسے **Substance** کی جگہ پر **Shadow** کہا۔ پھر بھی یہ بات مسلّم ہے کہ بیکٹؔ ''پوسٹ ماڈرن ازم'' کا جنم داتا ہے۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب کی تازہ خودنوشت ''**کتھا چار جنموں کی**'' سے درج بالا اقتباسات مشتے، نمونے، از خروارے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں وگرنہ کتاب مذکور میں علم و ادب کے دریا کی روانی اور جولانی پڑھنے والے کو اس طرح بہا لے جاتی ہے کہ وہ خود کو خلدِ بریں میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ کتاب ہذا پانچ سو باون صفحات مجلد پر محیط ہے جس کی قیمت چھ سو روپے، دس پونڈ، پندرہ ڈالر مقرر کی گئی ہے جو بزمِ تخلیقِ ادب پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶۶۷، کراچی۔ ۷۵۳۰۰ پر دستیاب ہے۔

......محمد انعام الحق (اسلام آباد)

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۲' شمارہ: ستمبر، اکتوبر۲۰۱۳ء

رابطہ: 537/D-1' ویسٹرریج-III' راولپنڈی، پاکستان۔

فون: 5462495,5490181-51-(92+)

فیکس: 5512172-(92+)

موبائل: 0558618-336-(92+)

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

''حُسنِ سیرت''

اپنا جلوہ دکھا رہے ہیں آپ
''چاند'' سے جگمگا رہے ہیں آپ

نغمۂ دل سنُا رہے ہیں آپ
ساری محفل پہ چھا رہے ہیں آپ

سب کی نظروں کو بھا رہے ہیں آپ
سب کے دل میں سما رہے ہیں آپ

ہوش والے بھی ہوش کھو بیٹھے
کیسا جادو جگا رہے ہیں آپ

حُسنِ صورت سے حُسنِ سیرت سے
سب کو اپنا بنا رہے ہیں آپ

آج پھر فن شناس لوگوں میں
گوہرِ فن لٹا رہے ہیں آپ

اہلِ دل، آپ کو نہ کیوں چاہیں
دل کی دنیا بَسا رہے ہیں آپ

چاؔند صاحب! یہ خوش نصیبی ہے
حالی ایوارڈ پا رہے ہیں آپ

اُس کا دلِ آج ہو رہا ہے شاد!
اپنے حاؔفظ کی لیں مبارکباد!

قاری محمد اسحاق حاؔفظ سہارنپوری
(انبالہ، بھارت)

☆ ہریانہ وقف بورڈ کا خواجہ الطاف حسین حالی ایوارڈ پانے پر

☆
☆☆
☆❍☆
☆☆☆☆

قرطاسِ اعزاز

❍☆❍

مہندر پرتاپ چاؔند

❍☆❍

کے نام

☆☆☆☆
☆❍☆
☆☆
☆

متاعِ چہارسو

''وفاؤں کا صلہ''

مہندر پرتاپ چاند

نام وتخلص:

مہندر پرتاپ چاندؔ

یومِ ولادت:

یکم اگست ۱۹۳۵ء

جائے پیدائش:

کروڑلعل عیسن (ضلع مظفرگڑھ) حال ضلع لیہّ، پاکستان

والد:

سوبھراج نارنگ (مرحوم)

والدہ:

دیاوَنتی (مرحومہ)

اولادیں:

(i) سنگیتا بہل (زوجہ ڈاکٹر اونی بہل) جو مقامی ڈی اے وی کالج میں انگریزی ادب کی پروفیسر ہے۔(ii) وِویک (جو ۲۷مئی ۱۹۹۱ء کی شب کو کرنال کے پاس ایک سڑک حادثے کا شکار ہو کر واصلِ بحق ہو گیا۔(iii) منوج (جو امریکہ میں ایک معروف کمپنی کا وائس پریذیڈنٹ ہے)

تعلیم:

ادیب فاضل۔ ایم۔ اے (اردو)، ایم۔ اے (لائبریری سائنس) ان سبھی میں اوّل درجہ حاصل کیا۔(میٹرک اور بی۔اے کے امتحانات فارسی مضمون کے ساتھ پاس کیے)

رفیقۂ حیات:

نرملا (مرحومہ) جس کے ساتھ ۱۰/اکتوبر ۱۹۵۹ء سے ۱۲/نومبر ۲۰۰۹ء تک رفاقت کا ساتھ رہا۔

ملازمت:

ریٹائرڈ یونیورسٹی لائبریرین وٹیچر انچارج شعبۂ اردو و فارسی کوروکشیتر یونیورسٹی، کوروکشیتر (ہریانہ) اس دوران میں تین سال تک لائبریری سائنس کے طلباء اور چھبّیس (۲۶) برس تک اردو کے طلباء کو تعلیم دی۔

تلمیذ:

علاّمہ (امرچند) قیس جالندھری

قلمی ابتداء:

۱۹۴۸ء میں جب میری عمر تیرہ سال کی تھی اور میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔

علمی وادبی خدمات:

(۱) کتابیں......۱۶

(۲) مضامین......۳۵

(۳) تبصرے ومقدّمے وغیرہ......۲۰

(۴) سفرنامے......۲

(۱) ''حرف راز'' (مجموعہ کلام) ۱۹۷۴ء (۲) ''زخم آرزوؤں کے'' (دوسرا مجموعہ کلام دیوناگری رسم الخط میں) ۱۹۸۲ء (۳) ''اردو کی ساتویں کتاب'' (صوبہ ہریانہ کے اسکولوں کی ساتویں جماعت کے طلباء کے نصاب میں ۱۹۸۶ء سے شامل)، (۴) ''حالی پانی پتی کی غزلیں'' (دیوناگری رسم الخط میں) ۱۹۸۹ء (ہریانہ اردو اکادمی نے اسے خود اپنی طرف سے شائع کیا)، (۵) ''حرفِ آشنا'' (تیسرا شعری مجموعہ) ۱۹۹۰ء (ہریانہ اردو اکادمی کی مالی معاونت سے شائع کیا گیا)، (۶) ''لاوا'' (مثنوی مصنّفہ حضرت قیس جالندھری)، مرتب ۱۹۹۸ء (۷) ''آزارِ غمِ عشق'' (چوتھا شعری مجموعہ) ۲۰۰۱ء (ہریانہ اردو اکادمی کی مالی معاونت سے شائع ہوا)، (۸) ''دیش ودیش کی کہانیاں'' (ہندی میں) مشترکہ مصنّف کے طور پر ۲۰۰۴ء (۹) ''دودھ کا مولیہ'' (مختلف ممالک کی لوک کہانیاں، ہندی میں، ۲۰۰۵ء (بچوں کے لیے)، (۱۰) لائبریری سائنس کی کتاب (Colon Classification-A Programmed Text) انگریزی میں دو ایڈیشن ۱۹۷۸ء، ۱۹۸۴ء (۱۱) ہندی ایڈیشن، ۲۰۰۴ء (لائبریری سائنس میں پروگریمڈ ٹیکسٹ لکھنے والا ملک بھر کا پہلا اور ابھی تک کا واحد مصنف ہوں، (۱۲) ''دودھ کی قیمت'' (مختلف ممالک کی لوک کہانیاں، بچوں کے لیے ۲۰۰۷ء (ہریانہ اردو اکادمی نے اسے اپنی طرف سے شائع کیا)، (۱۳) ''اجالوں کے سفیر'' (تحقیقی تنقیدی وشخصی مضامین کا مجموعہ) ۲۰۱۰ء (ہریانہ اردو اکادمی نے اس کتاب پر گیارہ ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا ہے) (۱۴) ''نشاطِ قلم'' (تحقیقی، تنقیدی وشخصی مضامین کا دوسرا مجموعہ) ۲۰۱۲ء (۱۵) ''اے جاتے ہوئے لمحو!'' (پانچواں شعری مجموعہ) (۱۶) ''A Passage to Pakistan'' (سفرنامہ پاکستان، انگریزی میں)

زیرِ اشاعت کتابیں:

(۱) ''اردو زبان وادب کے فروغ وارتقا میں ہریانہ کا حصّہ'' (۶۲۵ صفحات پر مشتمل ایک تحقیقی پروجیکٹ جسے ہریانہ اردو اکادمی نے راقم السطور سے لکھوایا تھا اور اب اسے شائع کیا جا رہا ہے)۔(۲) ''یہ دنیا یہ رشتے ناطے'' (ہندی)

انعام واعزاز:

(۱) سید مظفر حسین برنی ایوارڈ (ہریانہ اردو اکادمی) ۹۳-۱۹۹۲ء

(۲) نسیم لیہّ ایوارڈ'' (انٹرنیشنل بزم علم وفن، لیہ پاکستان) ۲۰۰۴ء، ۲۰۱۰ء

(۳) خواجہ الطاف حسین حالی ایوارڈ (ہریانہ وقف بورڈ) ۲۰۰۶ء

(۴)''مہتاب سخن'' کا خطاب (نورنگ ادبی ادارہ، لدھیانہ پنجاب) ۲۰۰۶ء
(۵) بھارت ایکسی لینسی ایوارڈ (Bharat Excelence Award)
فرینڈشپ فورم آف انڈیا، نئی دہلی۔ ۲۰۰۹ء
(۶) ابر سیمابی ایوارڈ (ساہتیہ سبھا رجسٹرڈ، کیتھل) ۲۰۱۰ء

متفرق حصولیابیاں:

(۱) اردو کے علاوہ ہندی، پنجابی، انگریزی اور اپنی مادری زبان سرائیکی میں بھی لکھتا ہوں۔
(۲) آکاش وانی کے مختلف اسٹیشنوں سے کئی گلوکار مدت سے میرا کلام گا رہے ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں امریکہ میں میرے قیام کے دوران'' Voice of America'' واشنگٹن ڈی سی نے میرا پندرہ منٹ کا انٹرویو ریکارڈ کیا تھا جسے بعد میں انہوں نے اپنے ہفتہ وار پروگرام ''ادب اور ادیب'' میں دو قسطوں میں براڈ کاسٹ کیا۔ ریڈیو کے علاوہ ٹیلی ویژن پر بھی میرا کلام ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے۔
(۳) وزیر اعلیٰ ہریانہ کی طرف سے دو بار ہریانہ اکادمی کا مدعوئے خصوصی، ایک بار زونل کنوینر اور دو بار اکادمی ہذا کی گورننگ باڈی کا رکن نامزد کیا گیا۔ یہ رُکنیت اس وقت بھی برقرار ہے۔
(۴) ڈائریکٹر جنرل براڈ کاسٹنگ (نئی دہلی) کی طرف سے دو بار آکاش وانی روہتک کے لیے ان کی Audition Committee کا ممبر نامزد کیا گیا۔
(۵) حصار (ہریانہ) کی ایک محترمہ مسز مونیکا سچدیوا نے میرے فن اور شخصیت پر تحقیقی مقالہ تحریر کرکے ۲۰۰۹ء میں ہندی میں ایم۔فل کی سند حاصل کی۔
(۶) جموں یونیورسٹی کی طالبہ عزیزہ کوشل کرن میری شخصیت اور فن پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ تحریر کر رہی ہیں۔
(۷) ۱۹۵۴ء میں اپنی طالب علمی کے دوران گورنمنٹ کالج لدھیانہ کے کالج میگزین ''ستلج'' کے حصہ اردو کا اسٹوڈنٹ ایڈیٹر رہا۔
(۸) چار برس تک حصار سے شائع ہونے والے سہ ماہی ہندی رسالہ ''پنجابی سنسکرتی'' کی مجلس ادارت کا رکن رہا۔
(۹) اس وقت ممبئی سے شائع ہونے والے ماہ نامہ ''تریاق'' کی مجلسِ مشاورت کا رکن ہوں۔
(۱۰) قریب دو درجن حوالہ جاتی ڈکشنریوں اور فرہنگوں میں میرے مفصّل کوائف شامل کیے جاتے ہیں۔

غیر ممالک کی سیاحت:

انگلینڈ، امریکہ، کینیڈا، رُومانیہ، سنگاپور، ایتھوپیا، تھائی لینڈ اور پاکستان۔

موجودہ پتہ:

۱۴۲۰/سیکٹر۔۹، اربن اسٹیٹ، انبالہ شہر ۱۳۴۰۰۳ (ہریانہ، بھارت)

ٹیلی فون: 0171-2532001
موبائل: 09416155918

☆

انسانیت مر نہیں سکتی

تقسیم کے چند ماہ بعد میں نے اپنے اسکول میں آنے والے ایک رسالے میں ثاقب زیروی صاحب کا ایک دل گداز مضمون پڑھا تھا جس میں انہوں نے بیان کیا تھا کہ کس طرح زیرہ میں ان کے ایک سکھ دوست (سردار گورمکھ سنگھ درزی) نے ان کی جان بچائی تھی۔ ان فسادات کے دنوں میں ثاقب اپنے اسی دوست کے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ بلوائیوں کو معلوم ہوا تو وہ انہیں قتل کرنے کے لیے وہاں پہنچ گئے۔ گورمکھ سنگھ جی کو جب اور کچھ نہ سوجھا تو انہوں نے اپنے دوست ثاقب کو ایک کمرے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی اپنی بیمار بیوی کے ساتھ سُلا دیا تھا اور اوپر سے اسی کمبل سے ثاقب کو بھی ڈھک دیا تھا جو ان کی اہلیہ نے سردی لگ جانے کی وجہ سے اوڑھ رکھا تھا۔ حملہ آوروں نے سارے گھر کی تلاشی لی۔ جب اس کمرے میں پہنچے تو گورمکھ سنگھ جی نے کہا کہ یہاں میری بیمار بیوی لیٹی ہوئی ہے۔ ان کی بیوی کا منہ کمبل سے باہر نظر آ رہا تھا اور ان درندوں نے کبھی اپنے خواب و خیال میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ کوئی غیر مسلم (سکھ) اپنے مسلمان دوست کی خاطر اتنی بڑی قربانی بھی دے سکتا ہے! لہٰذا وہ لوگ واپس چلے گئے اور اس طرح ثاقب زیروی کی جان بچ گئی اور بعد میں حالات جب سازگار ہوئے تو وہ ہجرت کرکے پاکستان پہنچ گئے۔

یہ مضمون پڑھ کر مجھے سردار گورمکھ سنگھ جیسے عظیم انسان کو دیکھنے اور انہیں سلام کرنے کا اشتیاق ہوا اور میں نے اُسی شام کو بازار جا کر ان کی دکان کا پتہ لگایا اور انہیں سجدہ ادا کیا تھا۔ بعد میں بھی جب کبھی بازار سے میرا گزر ہوتا میں ضرور اُن کی دکان پر جا کر ان کی قدم بوسی کرتا تھا اور ان کی دعائیں حاصل کرتا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہر ملک اور ہر قوم میں آج بھی بہت سے ایسے نیک نفس اور فرشتہ صفت انسان موجود ہیں۔ اور جب تک ایسے پاک طینت اور نیک نہاد انسان اس دھرتی پر زندہ ہیں انسانیت کبھی مر نہیں سکتی۔

O

''گلستانِ خیال''

ریتو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

۲۱/اکتوبر ۱۹۹۸ء......جگادھری۔

آپ کا گرامی نامہ منظر نواز ہوا۔ یاد آوری کے لیے شکریہ۔ میں گاؤں گیا ہوا تھا حال ہی میں واپس لوٹا ہوں۔ آپ کا نوحہ آپ کے نا قابل برداشت غم کی کماحقہٗ ترجمانی کرتا ہے۔ اس کو پڑھتے وقت کئی بار آنکھیں نم ہو گئیں۔ ادبی نقطۂ نظر سے بھی اس کی داد دئے ہی بنتی ہے۔ اس کے کئی مصرعے حالؔی کے مرثیۂ غالب کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس میں جو اہم بات ہے وہ صبر وتحمل اور فلسفہ وہدایت کی روشنی میں دئے گئے پند ونصائح کا حسین امتزاج ہے۔ اسی کا نام ہی تو زندگی ہے۔ تسلیم ورضا، حوصلہ آور بخت، راست روی اور راست کرداری۔

اس نظم کی جتنی تعریف کی جائے کم۔ یہ آپ کے شاعرانہ کمال کی مظہر ہے۔ آج کل نظم کہنا کس کو آتا ہے؟ غزل کی اہمیت اپنی جگہ مسلم مگر نظم سے اس طرح کی بے اعتنائی شعر وادب کے لیے بے حد مضر ہے۔ نظم کا اپنا مقام ہے اس کا اپنا رول ہے۔

آپ کا قطعہ بھی خوب ہے۔ نیت کی صفائی کے بغیر آدمی کہیں نہیں پہنچ پاتا۔ دکھاوے کی شیریں زبانی اور ریاکارانہ پوجا پاٹ سب بیکار ہیں۔ من صاف ہو جائے تو خدا خود بندے سے پوچھتا پھرتا ہے ''بتا تیری رضا کیا ہے؟''

من رسیون مل بھیو جیوں گنگا کو بیر
پاچھے پاچھے ہری پھرے کہت کبیر! کبیر!

(صابر ابوہری)

۱۰/دسمبر ۲۰۰۱ء......پانی پت۔

برادرم جناب چاند صاحب، تسلیم ونیاز۔

آپ کا گرامی نامہ بھی موصول ہوا اور ''آزارِ غم عشق'' بھی۔ کیا حسین وجمیل تحفہ ہے یہ ''شعری مجموعہ''۔ کم سے کم اردو زبان میں تو میں نے آج تک ایسا خوبصورت گیٹ اپ دیکھا نہیں۔ اور کلام! اس سلسلے میں صرف یہی دہرانا چاہوں گا:

چاند بھی فکر وفن کا ساگر ہے
اس کی گہرائی کا حساب نہیں
اس کی غزلیں بھی خوبصورت ہیں
اس کی نظموں کا بھی جواب نہیں

میری عظمت کو آنکنے والو
میرے احباب پر نظر ڈالو

فیض (مرحوم) کے الفاظ میں:

''شعر کہنا جرم نہ سہی لیکن بے وجہ شعر کہتے رہنا بھی کوئی ایسی عقلمندی نہیں''

اور پھر فیضؔ ہی کے الفاظ میں:

''کسی شاعر کو زندہ رکھنے کے لیے محض دو چار تخلیقات یا پھر دو چار اشعار بھی کافی ہوتے ہیں''

(کمار پانی پتی)

۱۳/ستمبر ۲۰۰۳ء......لاہور۔

برادر مکرم چاند صاحب، تسلیمات وآداب۔

آپ کی ارسال کردہ دو کتابیں یعنی آپ کا مجموعہ کلام ''آزارِ غم عشق'' اور ''زار علامی نمبر'' ۱۱/ستمبر کو ملے لیکن آپ کا کوئی خط اب تک نہیں ملا ہو سکتا ہے ایک دو روز میں مل جائے۔

''آزارِ غم عشق'' بہت سنبھلے ہوئے اور محتاط اسلوب کی شاعری ہے۔ ماضی کی روشن اور حیات بخش اقدار سے آپ کی محبت قابلِ داد ہے۔ حیات افروزی کا جذبہ بھی جا بہ جا دامن کش دل ہوتا ہے۔ زبان وبیان کے حوالے سے بھی یہ کلام جاذب اور تاثر آفریں ہے۔ زار علامی نمبر میں آپ کا مضمون بھی لطافت ونفاست کے کئی پہلو رکھتا ہے اس مضمون سے آپ کی دانش دوستی اور ادب نوازی کے کئی شواہد ملتے ہیں۔ اللہ کریم آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ زار علامی نمبر کے حصول کے بعد اب میرے لیے شارق انبالوی صاحب کے مکاتیب کے حواشی کو مکمل کرنا آسان ہو گیا ہے۔ جزاک اللہ فی الدارین۔

(جعفر بلوچ)

۴/مارچ ۲۰۰۵ء

برادرِ عزیز جناب مہندر پرتاپ چاند سلامت۔

خلوصِ فراواں خط ملا۔ آپ کی نظم میں ایک چیز دیکھی جس نے مجھے کوئے حیرت کر دیا۔ وہ ہے انسانی جذبۂ ہمدردی کی سلیقہ مندانہ ترجمانی۔ روحِ احساس فرطِ غم سے سلگتی رہی پھر عالمِ وجدان میں گم ہو گئی۔ اشعار میں اظہار کا تیکھا پن، لفظوں کی مینا کاری اور معنویت کی آتش ریزی نے ذہن ودل پر جلوہ باری کی۔ نظم کیا ہے ایک مرقعہ ہے غم کا، کرب کا، تیر افگنی کا، اشک شوئی کا، سینہ کوبی کا۔ یا اللہ! یہ شاعری ہے یا جادوگری؟؟ ہو نہ ہو یہ الہامی کیفیت قدرت کی ودیعت ہے ''تو جسے چاہے اسے کیا چاہیے'' والا معاملہ۔

مخدومی آزاد سونی پتی کو خط لکھ دیا ہے جس میں آپ کی کرم فرمائیوں کا تذکرہ بھی کر دیا ہے۔ زمنیات کا معاملہ طے نہ ہو پایا۔ توقف ہی بہتر ہوگا۔ امید کہ آپ سب بعافیت ہوں گے۔

(آزاد ساحری)

محترم و مکرم جناب مہندر پرتاپ چاند صاحب، آداب۔

اُمید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوں گے۔ آپ کا نوازش نامہ مل گیا تھا۔ اُستاد علامہ قیس جالندھری کی مکمل غزل نے لطف دوبالا کر دیا۔ میں نے گلوکار عطاء اللہ خان عیسیٰ خیلوی کو بھی اس کی نقل بھیج دی ہے اور اب اُنہوں نے اپنی ویب سائٹ پر بھی علامہ صاحب کا نام اس غزل کے شاعر کی حیثیت سے تصحیح کر دی ہے۔ ''چہارسُو'' میں آپ کے سفرنامہ کو پڑھ کر یہ احساس ہوا کہ آپ نہ صرف اجالوں کے بلکہ محبتوں کے بھی سفیر ہیں۔ کوئی ایک جملہ ایسا نہ تھا جس میں اپنی جنم بھومی کے حوالہ سے کسی منفی ردِعمل کا اظہار پایا جاتا ہو۔ جس نے بھی پڑھا، تعریف کی۔

محترم! میں ایک عرصہ سے ہیرانند سوز کے بارے میں جاننے کی جستجو کر رہا ہوں۔ آپ سے بھی ذکر کیا تھا اور آپ نے بھی وعدہ فرمایا تھا۔ تاحال یہ معلوم نہیں کر پایا کہ وہ یہاں کس علاقہ میں پیدا ہوئے تھے۔ دیگر حالاتِ زندگی بھی انٹرنیٹ پر موجود معلومات ادھوری ہیں۔ اُن کا سرائیکی کلام تو میرے پاس موجود ہے۔ تصویر (واضح) کا بھی مسئلہ ہے۔ اگر ممکن ہو تو ان کے بارے میں رہنمائی فرمائیں تاکہ سرائیکی زبان و ادب کے شیدائیوں میں اُن کا تعارف مضمون کی صورت کرا سکوں۔

محترم ڈاکٹر شباب للت صاحب کے حوالہ سے بھی ایک مضمون لکھا ہے۔ چھپنے کے بعد آپ کی خدمت میں ارسال کر دوں گا۔ ان دنوں نیویارک میں مقیم آپ کے دوست اور میرے مشفق و مہربان بزرگ واحد بخش بھٹی واحدی کے کالموں کا تیسرا مجموعہ ''انڈس سے ہڈسن تک'' اشاعتی مراحل سے گزر رہا ہے۔ جس کی تمام تر ذمہ داری اُنہوں نے مجھے سونپی ہے۔ چھپنے کے بعد آپ کی خدمت میں روانہ کر دوں گا کیونکہ اس میں آپ سے اُن کی محبتوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔

(تنویر شاہد زئی)

۲۲/نومبر۲۰۱۱ء......بیکانیر۔

محترم مہندر پرتاپ چاند صاحب، آداب!

طالب خیر بہ خیر۔ آپ کا ارسال کردہ فرمودہ نوازش نامہ موصول ہوا۔ ان دنوں ''اجالوں کے سفیر'' زیرِ مطالعہ ہے۔ واقعی آپ نے ''کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کر'' والی کہاوت کو سچ ثابت کر دیا ہے۔ آپ کے بیش تر مضامین ماہنامہ ''تعمیرِ ہریانہ'' میں شائع ہوئے ہیں، براہِ کرم مجھے اس رسالے کے مکمل پتے سے مطلع فرمائیں۔ ان دنوں ''تعمیرِ ہریانہ'' کی ادارت کون صاحب فرما رہے ہیں۔ آپ کی نثری تحریروں نے مجھے ازحد متاثر کیا ہے۔ آپ کے مضامین کے موضوعات لائقِ توجہ ہیں۔ ادبی شخصیات یا کسی رجحان پر خامہ فرمائی کرنا، ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ آپ نے موضوع کا حق ادا کر کے اپنے صاحبِ علم اور صاحبِ قلم ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

(معین الدین شاہین)

۲۰/جولائی۲۰۱۲ء

حضرت مہندر پرتاپ چاند صاحب، السلام علیکم۔

اُمید کرتا ہوں کہ آپ بفضلِ تعالیٰ بہ عافیت ہوں گے۔ گذشتہ دس برسوں سے ''شاعر'' میں اور دیگر رسائل میں آپ کی شعری تخلیقات پڑھتا رہا ہوں۔ ''شاعر'' کا تازہ شمارہ پیشِ نظر ہے جس میں آپ کی مرصّع غزل کا مطلع مجھے دیگر اشعار کے مقابلہ میں بے حد پسند آیا۔

کوئی جتن، کوئی تدبیر کارگر ہی نہیں
میرے خلوص میں شاید کوئی اثر ہی نہیں

میری خواہش ہے کہ آپ کا شعری مجموعہ پڑھوں اور آپ کے فکری رویّہ کو سمجھوں اور زبان کی شیرینی و لطافت سے محظوظ ہو کر کچھ آپ کے مطالعہ و حاصلِ مطالعہ کے ساتھ علم و ادب کے مطالعہ سے اور حاصل مطالعہ سے آپ کی شخصیت و شاعری کو سمجھوں اور اپنے ذہن و فکر کو منور کروں کیونکہ میں اردو زبان و ادب کا ایک طالب علم ہوں۔ براہِ کرم اپنا شعری مجموعہ بذریعہ وی۔ پی راقم الحروف کے درج ذیل رہائشی پتہ پر ارسال فرما دیں تو نوازش ہوگی۔

(ڈاکٹر زبیر قمر بنگلوری)

۴/نومبر۲۰۱۲ء......دہلی۔

میرے بھائی مہندر پرتاپ چاند! آداب۔

آپ کی ''نشاطِ قلم'' نشاطِ قلب روپ میں باصرہ نواز ہوئی اس کا آخر سے شروع تک ہر مضمون کئی ہی بار پڑھ ڈالا مگر تشنگی ہے کہ اپنی جگہ قائم رہی۔ آپ کے قلم کی روانی پر رشک آتا ہے۔

حالی پانی پتی اور اُن کے خاندان کی سماجی، علمی اور ادبی خدمات تفصیل سے پڑھ کر آپ کا وسیع اور جامع مطالعہ کی داد دینا پڑتی ہے۔ پڑھتے پڑھتے آپ کی رازِ تحریر دل کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جاتی ہے جو بار بار مطالعہ کے لیے اُکساتی ہے۔ ہر مضمون اپنی جگہ خوب ہے کس کس کا ذکر کیا جائے۔ ساقی قبا حق کہ نور احمد نور، کہ فکر و احساس ہے۔ شاعر نیرّ قریشی اور پھر مجھے یاد بھی سب ذرا ذرا'' کیا خوب ہے۔ آپ کا نشاطِ قلم تسکین روح بن کر رہ گیا، اس کے لیے میری جانب سے مبارکباد قبول کیجیے۔

(یوگیندر بہل تشنہ)

۹/اکتوبر۲۰۱۲ء......دہلی۔

محترم مہندر پرتاپ چاند، سلامتی کی دعائیں۔

بصد شکریہ تمام آپ کی نہایت شاندار کتاب ''نشاطِ قلم'' دستیاب ہوئی۔ میں اس حوالے سے آپ کی خصوصی طور پر مشکور ہوں کہ آپ نے ہمارے خاندان کے حوالے سے بالغ نظر تحقیق فرما کر ہریانہ کی ادبی تاریخ میں سنہرے باب کا اضافہ کیا ہے۔

(سیدہ حمید)

ساز خاموش

مہندر پرتاپ چاندؔ

ادیب اعظم، سید القلم پدم شری جناب برہم ناتھ دت قاصرؔ کی زندگی محنت، ایثار، خدمت خلق، خدمت ادب اور خدمت قوم و وطن کی طویل داستان ہے۔ وہ ۱۸۹۰ء میں ''ویریم دتّاں'' کے ایک متمول، صاحب علم اور علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد بابو گورانددتہ مل اپنی نواح میں پہلے انٹرنس پاس تھے۔ دادا منشی شنکر داس فارسی کے جید عالم تھے۔ پردادا منشی مہیش داس دت مہاراجہ سچیت سنگھ کے مشیر اور صلاح کار تھے۔

ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد دت صاحب نے ڈی اے وی کالج اور دیال سنگھ کالج لاہور سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۵ء میں کالج چھوڑنے کے بعد انہوں نے پولیس کی نوکری اختیار کر لی مگر رول آنے پر حاضر نہ ہوئے اور اس لیے ان کا نام کاٹ دیا گیا۔ والد کو معلوم ہوا تو وہ اتنے ناراض ہوئے کہ انہیں گھر سے نکال دیا۔ ماں زندہ نہ تھی کہ راستہ روکتی۔ ناچار بٹالہ میں ایک بنیئے کے ہاں نوکری کر لی جو انہیں اپنے ساتھ دلی لے گیا۔ وہاں سے وہ امرتسر میں منتقل ہو گئے اور اپنا کاروبار شروع کیا۔ تجارت میں انہوں نے بڑا نام کمایا اور خوب دولت بھی۔ اپنی ذہانت، محنت اور ایمانداری کے طفیل یہ ہر جگہ تعظیم اور احترام سے دیکھے جاتے تھے۔

ہندوستان کی جنگ آزادی میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا۔ جلیاں والا باغ کے خونیں مناظر انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے اور ان کے حساس دل نے ان کا گہرا اثر لیا۔ کئی بار انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی سہیں مولانا آزاد، ڈاکٹر کچلو، شیخ حسام الدین علامہ مشرقی، سوہن سنگھ جوشؔ جیسے مجاہدین آزادی ان کے خاص ملنے والوں میں سے تھے اور ان کے ہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ یہ چاہتے تو اونچے سے اونچا عہدہ حاصل کر سکتے تھے مگر ان کی خدمات ہمیشہ بے غرضانہ رہیں۔

اخلاقی طور پر ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ علامہ عرشیؔ ان کے فرزند کو لکھتے ہیں:

آں برہم ناتھؔ، دیوتا سیرت ‏ ‏ ‏ ‏ سینہ بے کینہ بے ریا سیرت
جوہر آدمے دُرو دیدم ‏ ‏ ‏ ‏ شرفے عالمے دُرو دیدم
علماء دیدم اولیا دیدم ‏ ‏ ‏ ‏ بشرے مثل اُو کجا دیدم؟

ایک اور جگہ عرشیؔ صاحب فرماتے ہیں: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعدیؔ و تلسی داس نے دوبارہ ایک ہی قالب میں جنم لینے کی ضرورت محسوس کی ہے اور موجودہ دور کے مذاق و حالات کو سامنے رکھ کر یہ گلدستہ تیار کیا ہے جو ہر نیکی پسند، انسانیت دوست، تعلیم یافتہ شخص کی میز پر آراستہ ہو کر ہمیشہ اپنے ماحول کو معطر کرتا رہے گا اور اس کی خوشبو کبھی ختم نہ ہو گی، نسل در نسل آگے چلتی جائے گی بالکل اسی طرح جس طرح ''گلستان'' اور ''رامائن'' زندہ و پائندہ چلی آ رہی ہیں۔

شاعری میں یہ اپنے وقت کے جید عالم اور معروف استاد حکیم فیروز الدین طغرائیؔ کے شاگرد ہوئے۔ دت صاحب ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے سات پر پنجاب سرکار نے اور ایک پر مرکزی سرکار نے اول انعام سے انہیں نوازا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں پنجاب سرکار نے انہیں ''ادیب اعظم'' کے خطاب سے سرفراز کیا اور سروپا، توصیفی سند اور گیارہ سو روپے کی رقم بھی عنایت کی۔ ۱۹۶۹ء میں صدر جمہوریہ ہند نے انہیں سونے کے تمغے اور ''پدم شری'' کے خطاب سے نوازا۔ ۱۹۷۱ء میں مرکزی سرکار نے ان کی ایک تصنیف پر انہیں ایک سند، اعزاز نامہ اور ایک ہزار روپیہ عنایت فرمایا۔ ان کی ایک اور تصنیف ''ڈال ڈال، پات پات'' پر مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''یہ کتاب نہیں دامان باغبان و کف گل فروش ہے۔''

پدم شری نیازؔ فتح پوری نے ان کی نگارشات سے متعلق لکھتا تھا۔ ''وہاں صرف عرش ہی عرش ہے، فرش کہیں نہیں۔''

ڈاکٹر ہردے ناتھ کنجرو تحریر فرماتے ہیں کہ ''کتاب کو شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا'' ڈاکٹر فرمانؔ فتح پوری اور ڈاکٹر وارث سرہندی انہیں مولانا آزاد اور ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر زورؔ اور علامہ کیفیؔ کا ہم قدم تصور کرتے ہیں۔ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ کی رائے یہ ہے کہ ''دت صاحب پر جن دو فن کاروں کا اثر ہے وہ ہیں مرزا غالبؔ اور مولانا ابوالکلام آزادؔ، ان کی نظم میں وہی والہانہ شگفتگی ہے اور ان کی نثر ویسی ہی پر شکوہ اور دل آویز ہے۔''

اس کے علاوہ جناب غلام قادر مہرؔ، سر ظفر اللہ خان، ڈاکٹر رادھا کرشن، جسٹس رحمان و دیگر کتنے ہی مشاہیر وقت نے بھی ان کے کلام اور شذرات کو موزوں و مناسب الفاظ میں سراہا ہے۔

اپنی آخری عمر میں بھی جب کہ ان کی عمر لگ بھگ ۸۵ سال کی تھی وہ ہر روز باہر سے آئے ہوئے درجنوں خطوط خود پڑھتے اور ان کے جوابات لکھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ نئے مضامین بھی لکھتے یا انگریزی مضامین کے ترجمے کرتے رہتے تھے۔ موت سے چند ماہ پہلے انہوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں و دیگر مشاہیر وقت کی طرف سے آئے ہوئے خطوط کو یک جا کر لیا تھا اور اسے ''من کہ مکتوب الیہ'' کے نام سے شائع کروانا چاہتے تھے مگر افسوس کہ ان کی یہ خواہش اپنی زندگی میں پوری نہ ہو سکی۔

دت صاحب ایک نہایت ہی شفیق باپ تھے۔ جب ان کی عمر محض ۳۶ برس کی تھی تو ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تھے مگر انہوں نے ان کے لیے نئی ماں لانے کی بجائے خود ''ماں'' بن کر ان کی پرورش کی اور

انہیں اس قابل بنایا کہ آج ان کے اکلوتے فرزند پروفیسر وشواناتھ دت (سابق صدر شعبہ تاریخ کورکشیتر یونیورسٹی) ایک قابل قدر مصنف اور ایک ممتاز ترین تاریخ داں اور مورّخ ہیں۔ اس کے علاوہ قاصر صاحب کی ایک بیٹی ہندوستان کے مشہور و معروف ڈاکٹر ''پدم شری'' و ''پدم بھوشن'' بلدیو سنگھ صاحب کی اہلیہ تھیں۔ دوسری بیٹی ریاست جموں و کشمیر کے ریٹائرڈ ڈی۔ آئی۔ جی پولیس بخشی وشوامتر کی رفیقۂ حیات تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے تعلقات مہتہ دیوان چند، ریٹائرڈ آئی۔ پی۔ ایس مرحوم کرنل وی۔ آر۔ موہن، بخشی رام کشن صاحب سابق ایم ایل اے جیسی عظیم شخصیتوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔

قاصر صاحب اپنی اولاد سے بے حد مطمئن تھے۔ بیٹا اور بیٹی تو ان کے آخری دنوں میں جی جان سے ان کی خدمت کرتے ہی تھے کہ وہ ان کا اپنا ہی خون تھا مگر یہ اپنی فرماں بردار اور نیک سیرت بہو محترمہ کملا دتہ کا بھی اکثر ذکر کیا کرتے تھے اور انہیں بے حد سراہتے تھے۔

قاصر صاحب خلوص و محبت کی سچی تصویر تھے اور نمائش، تکلف و تصنع سے بہت دور رہتے تھے۔ وہ بے حد حلیم تھے اور چھوٹوں سے خاص طور پر نہایت مروت سے پیش آتے تھے۔ کبھی کوئی کلرک یا چپراسی ان کے ہاں اخبار یا ڈاک وغیرہ دینے جاتا تو اسے بہت پیار سے بلاتے اس سے ہاتھ ملاتے اور چائے وغیرہ پوچھتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ اپنے آخری ایام میں اپنے بیٹے پروفیسر وشواناتھ دتہ کے ہاں کورکشیتر یونیورسٹی کے کیمپس میں ان کے سرکاری مکان میں آ کر قیام پذیر ہو گئے تھے۔ موت سے چند لمحے بیشتر جہاں انہوں نے سبھی اہل خانہ کو باری باری بلا کر گلے لگایا وہاں اس وقت گھر میں کام کر رہی مہترانی کو خاص طور پر بلوا کر اسے ہاتھ جوڑ کو نمسکار کیا اور اس کی خدمات کے لیے اظہارِ تشکر کیا تھا۔

دوسروں کی تکلیف کا انہیں اتنا احساس تھا کہ موت سے چند گھنٹے پیشتر جب انہیں دل کا شدید دورہ پڑا تو ان کی حالت کافی نازک ہو گئی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اب آخری وقت قریب آ رہا ہے لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ ڈاکٹر کو بلایا جائے تو انہوں نے اپنا درد اور تکلیف چھپاتے ہوئے محض اس لیے انکار کر دیا کیوں کہ اس وقت صبح کے پونے پانچ بجے تھے اور اس گھڑی ڈاکٹر کو بے آرام نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اپنے ایک دوست اور مشہور ادیب مولانا عبدالماجد دریا بادی کی علالت کے بارے میں جب انہیں معلوم ہوا تو بجائے دوا کا نام لکھ بھیجنے کے انہوں نے پندرہ دن کی دوائی ہی خرید کر انہیں بذریعہ پارسل روانہ کر دی مولانا ان کے اس حسن سلوک سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔

قاصر صاحب کی دوست نوازی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جہاں ان کے والد ماجد کو قتل کر دیا گیا اور پاکستان میں ان کا گھر بار لوٹا گیا کیوں کہ وہ ایک ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہاں بھارت (امرتسر) میں ان کے مکان کو اس لیے جلایا گیا کیوں کہ انہوں نے اپنے گھر میں اپنے کچھ مسلمان دوستوں کو پناہ دی تھی۔

قاصر صاحب مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے اور مجھ سے بہت ہی محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ ہر روز قبل دوپہر پیدل چل کر میرے آفس میں تشریف لاتے۔ سردیوں کے دن تھے ہم لوگ باہر لان میں گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کر باتیں کرتے اور وہ اس دوران میں اردو اخبار (ہندسماچار) کی ورق گردانی بھی کرتے۔ ایک بار فرمانے لگے کہ ''آج شام کو گھر پر آ یئے گا۔ اکٹھے چائے پئیں گے''۔ میں نے معذرت پیش کی کہ ''آج شام تو میری کلاس ہے۔ کل حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔'' اس پر وہ ایک دم مایوس سے ہو گئے۔ پھر اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا۔ ''یہ بسکٹ خاص طور پر آپ کے لیے لایا تھا۔ لہٰذا یہیں بیٹھ کر کھا لیتے ہیں۔''

میں ان کے اس التفات پر بے حد متاثر ہوا۔ گھر پر چائے کے ساتھ ان کے ہاں بسکٹ وغیرہ سب کچھ موجود رہتا تھا لیکن پھر بھی وہ خود بازار سے مزید بسکٹ خرید کر لائے تھے۔ بظاہر یہ ایک معمولی بلکہ مضحکہ خیز سی بات لگتی ہے مگر اس معصوم اس بے ریا عمل کے پیچھے کس قدر بے پناہ محبت اور شفقت کا دریا موجزن تھا اس کا اندازہ ایک حساس اور دردمند دل ہی لگا سکتا ہے۔

غم و آلام میں بھی وہ کس طرح اپنے جذبات و احساسات کو ظرافت کا جامہ پہنا دیتے تھے اس سے متعلق ایک واقعہ بہت دل نشیں ہے: ایک بار گھر میں رکھی ہوئی اپنی ایک اداس تصویر کو جب انہوں نے دیکھا تو شاید انہیں قریب آتی ہوئی اپنی موت کا خیال آ گیا۔ لیکن فوراً ہی مسکراتے ہوئے انہوں نے تصویر کو مخاطب کیا اور کہا کہ ''میاں! تم کیوں اتنے اداس ہو رہے ہو؟ جانا تو ہم نے ہے تم نے تو یہیں رہنا ہے۔'' ان الفاظ میں کتنا کرب چھپا ہوا ہے لیکن دیکھیے انہوں نے اس حقیقت کو کس لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے!

۲۴ر نومبر ۱۹۷۵ء کو یعنی اپنی موت سے ایک روز قبل وہ حسب معمول میرے ہاں تشریف لائے تھے۔ اخبار وغیرہ دیکھ چکے تو واپس جانے کے لیے اٹھے۔ میں بھی ہر روز کی طرح انہیں سڑک تک چھوڑنے کے لیے ساتھ ہو لیا۔ انہوں نے مجھے راستے ہی سے واپس بھیجنا چاہا کہ ''آپ بیٹھیے میں اب چلا جاؤں گا۔'' میں نے سڑک تک ساتھ جانے کی ضد کی تو مسکرا کر کہنے لگے کہ ''آپ فکر مت کیجیے میں اب واپس نہیں آ ؤں گا''

اور واقعی وہ پھر لوٹ کر نہ آئے یعنی ۲۵ر نومبر ۱۹۷۵ء کو علی الصباح اپنے تمام عزیزوں، مداحوں اور ساری دنیائے ادب کو سوگوار بنا کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کی وفات حسرت آیات پر ایک قطعہ میں نے کہا تھا جو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے:

بجھ گیا علم و آ گہی کا چراغ ہو گئی شمعِ شاعری خاموش
کوئی آواز اب نہیں آتی ساز خاموش، نغمگی خاموش!

براہِ راست

ہر صاحبِ دل اور صاحبِ ذوق شخص کی مانند یکسانیت ہمیں بھی آرے کی طرح کاٹتی ہے مگر کیا کِیا جائے صاحبِ قرطاسِ اعزاز کے تعارف میں کلماتِ حُسن کا درآنا فطری امر ہے۔ جناب **مہندر پرتاپ چاندؔ** کے حوالے سے اگر اُس درد کو ہی بانٹ لیا جائے جو تقسیمِ ہند کے باعث لاکھوں، کروڑوں لوگوں کو سہنا پڑا اور جس کے ردِعمل میں بے پناہ رزمیہ ادب تخلیق ہوا اور ہو رہا ہے شاید اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی!

چاندؔ صاحب تقسیم کے عینی شاہد اور متاثرین ہونے کے باعث سراپا محبت، عاجزی اور انکساری کا پیکر ہیں، یہی محبت، عاجزی اور انکساری اُن کے کلام میں جابہ جا قاری کو چونکانے کے بجائے سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے پر اُکساتی ہے!!

سو طے ہوا! آج کی محفلِ چاندؔ ادب برائے ادب نہیں ادب برائے زندگی، ادب برائے عمل ہے جس میں آپ کی شرکت ہمارے اور چاند صاحب کے لیے کسی طور اعزاز سے کم نہ ہے!!!

گلزار جاوید

☆ کہا جاتا ہے کہ دنیا کا پہلا شاعر اُس وقت پیدا ہوا جب انسان کے اندر ہمدردی کا احساس جاگا۔ آپ کے اندر کا شاعر کب اور کس طور دریافت ہوا؟

☆☆ میری ابتدائی تعلیم کے دور میں اُردو زبان اور خصوصاً اردو شاعری کی مقبولیت ہندوستان بھر میں اپنے عروج پر تھی۔ یہ حکومت انگریزی کا زمانہ تھا اور پنجاب کے سبھی اسکولوں میں تعلیم کا میڈیم اردو تھی۔ حساب جیومیٹری، الجبرا، تاریخ، جغرافیہ اور سائنس وغیرہ سبھی مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ ان سبھی مضامین کی نصابی کتابیں بھی اردو ہی میں ہوتی تھیں۔ غالباً ۱۹۴۵ء کی بات ہے جب میں کلورکوٹ (ضلع میانوالی حال پاکستان) میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا، ہمارے ایک محترم استاد جناب بشر افغانی جو خود معروف شاعر تھے اور جوشؔ ملسیانی صاحب کے تلامذہ میں سے تھے، کلاس میں بیت بازی کروایا کرتے تھے۔ اُن کے دیے ہوئے عنوان یا موضوع پر ہمیں کچھ اشعار یاد کر کے جانا ہوتا تھا۔ بیت بازی کے دوران دیگر ہم جماعتوں کے یاد کیے ہوئے اشعار سُننے کا بھی موقع ملتا تھا۔ انہیں ایاّم میں اردو شاعری سے میری محبت کی ابتدا ہوئی۔ میرے بہنوئی جناب موتی رام راحتؔ (مرحوم) جو اُن دنوں گورڈن کالج راولپنڈی میں بی۔اے کے طالب علم تھے، جب کبھی چھٹیوں میں اپنے وطن کروڑلعل عیسن (حال ضلع لیہ، پاکستان) جاتے تھے یا گھر سے راولپنڈی واپس آتے تھے تو راستے میں ایک آدھ روز کے لیے کلورکوٹ میں بھی ہمارے ہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ اور مجھے یاد ہے کہ اُن کے اس قیام کے دوران میں اُن سے کئی اشعار لکھوا لیتا تھا جن کی مدد سے بیت بازی میں نہایت اعتماد کے ساتھ حصہ لیتا تھا۔

☆ یہ تو ادب و شاعری سے آپ کے عشق کی ابتدا تھی۔ اب اُن احساسات کی بابت بھی روشنی ڈالئے جن کے زیرِ اثر باقاعدہ شعر کہنے کی ابتدا ہوئی؟

☆☆ باقاعدہ شعر کہنے کی ابتداء تقسیمِ وطن کے بعد ہوئی جب ۱۹۴۷ء میں اپنی جنم بھومی کو چھوڑ کر ہم پہلے پہل زیرہ (ضلع فیروز پُور، پنجاب) میں آکر نئے سرے سے آباد ہوئے جہاں میرے والد (مرحوم) کی تقرری وہاں کے جیون مَل ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی اسکول میں ہوئی تھی۔ ملک کی تقسیم ایک خدائی قہر تھا یا سیاست کا کھیل یہ میری کم سنی اُس وقت کچھ سمجھ نہ سکی لیکن ہجرت کے سفر کے دوران ان آنکھوں نے کچھ خونیں مناظر بھی دیکھے تھے جن کا اثر لاشعوری طور پر دل نے ضرور محسوس کیا تھا اور میرے معصوم دل کو مضروب اور حیرت زدہ بھی کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کلورکوٹ اور اپنی جنم بھومی کروڑلعل عیسن کے اپنے ہم جولیوں سے بچھڑنے کا غم بھی ذہن میں کہیں نامعلوم طور پر میرے پوشیدہ شعری اظہار کے جوہر کو رفتہ رفتہ مہمیز کرتا رہا۔

☆ پہلی تخلیق کی صنف، وقت، مقام اور اشاعت کی روداد بتلایئے؟

☆☆ زیرہ ہی کے قیام کے دوران ایک بہت ہی پیارے ہم جماعت مہیش سے اس قدر دوستی ہوئی کہ لگ بھگ ہر روز بیشتر اوقات ہم دونوں ایک ساتھ رہتے تھے۔ اچانک اُس کے والد کا کسی دُور مقام پر تبادلہ ہو گیا تو اس نئے دوست سے بچھڑنے کے قلق سے کئی پرانے زخم پھر سے منہ کھولنے لگے۔ یہ غالباً ۱۹۴۸ء کے آخر کی بات ہے۔ مہیش کے چلے جانے کے بعد میں نے اپنے گھر میں خود کو ایک کمرے میں بند کر لیا اور دو دن تک نہ کچھ کھایا نہ پیا اور زار و قطار روتا رہا۔ اور پھر اسی عالم میں اچانک پہلی بار یہ دو شعر ہوئے تو دُکھی دل کو کچھ قرار حاصل ہوا:

چھوڑ کر مجھ کو اکیلا جا بسا ہے تو کہاں
کس نگر کی اَب ہوائیں راس تجھ کو آ گئیں؟
فاصلوں نے تجھ کو کتنا دور مجھ سے کر دیا!
دید کو ترسی ہوئی آنکھیں بھی اب پتھرا گئیں!

اُس وقت اوزان و عروض اور فنی لوازمات اور مختلف اصنافِ سخن سے حالانکہ میں یکسر بے بہرہ تھا لیکن قدرتی موزوئی طبع نے یہ دو اشعار کہلوا دیے۔ بعد میں عروضی نکات سے قدرے واقفیت حاصل ہوئی تو معلوم ہوا کہ دراصل یہ ایک قطعہ تھا اور چاروں مصرعے بھی بروزن نکلے۔ بہرحال میں نے یہ اشعار اُس وقت کے مقبول ترین اردو اخبار ''ہند سماچار'' (جالندھر) کو ارسال

کیے تو اس کے ایڈیٹر جناب نو ہر یارام درد نکودری نے نہ صرف انہیں نمایاں طور پر شائع کیا بلکہ چھ مہینے تک اس اخبار کا سنڈے ایڈیشن ڈاک سے میرے اسکول کے پتے پر روانہ فرماتے رہے۔

☆ کچھ تفصیل اس ماحول کی بتلایئے جس میں شعری سفر پروان چڑھا اور جسے احباب صحت منداد بی ماحول سے تشبیہہ دیتے ہیں؟

☆☆ ۱۹۵۱ء میں لمبی (ضلع فیروز پور) سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد حسن اتفاق سے میرے والد نے مجھے ڈی اے وی کالج جالندھر میں داخل کروادیا۔ جالندھر اُس وقت ادب اور صحافت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ''ہندسما چار'' کے علاوہ ''پرتاپ''، ''ملاپ''، ''پربھات''، ''اجیت'' اور ''پردیپ'' جیسے کئی روزانہ اردو اخبارات یہاں سے شائع ہوتے تھے اور دلی کے بعد شمال ہندوستان کا واحد ریڈیو اسٹیشن بھی جالندھر ہی میں تھا۔ مزید برآں اُس وقت پنجاب کے دو عظیم اور مستند استادِ فن شعراء لسان الاعجاز پنڈت میلا رام وفا اور ابو الفصاحت قبلہ جوش ملسیانی بھی دنیائے شعر و ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ خصوصاً جوش صاحب (جن کا مستقل قیام اُس وقت جالندھر ہی کے قریب قصبہ نکودر میں تھا) کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع تھا ان میں سے بیشتر حضرات بذات خود استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ ان میں پنڈت رلا رام رتن پنڈوروی، نسیم نورمحلی، جگن ناتھ کمال کرتار پوری، ہما ہرنالوی، قیس جالندھری، ساحر ہوشیار پوری، ساحر سیالکوٹی، سرشار سیلانی اور کالیداس گپتا رضا وغیرہ مشاہیر کا ایک خاصا کارواں تھا۔ جوش صاحب کے یومِ ولادت پر ہر برس نکودر میں ان کے بیشتر شاگرد یکجا ہوتے تھے جہاں ایک شاندار مشاعرے کا انعقاد کیا جاتا تھا۔ عموماً اگلے روز ان میں سے بیشتر حضرات جالندھر ریڈیو اسٹیشن کے مشاعرے میں شریک ہوتے تھے۔ جوش صاحب، وفا صاحب اور ان کے کئی شاگردان کے علاوہ اُس وقت جالندھر میں کچھ اور معروف شاعر بھی موجود تھے جیسے مخمور جالندھری، اختر رضوانی اور آتش بہاولپوری وغیرہ اور اسی لیے اکثر وہاں مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ اسی صحت منداد بی ماحول میں میرے تخلیقی شعور کو جلا ملی اور میں نے اپنے کالج کی تعلیم کے دوران جو چند نظمیں اور غزلیں کہیں وہ مذکورہ اخباروں میں شائع ہوتی رہیں۔ ان اخبارات کی وسیع سرکولیشن تھی اور کشمیر سے لے کر دلی اور قریبی یوپی اور ہماچل تک ان کی رسائی تھی۔ کالج کے اُن چار سالوں کے دوران میں کئی مقامی مشاعروں میں بھی شریک ہوا گو اُس وقت تک میں کسی استاد کے دامنِ فیض سے منسلک نہیں ہوا تھا۔

☆ اُن سینئر اہل قلم کے اسمائے گرامی سے آگاہ فرمایئے جن کا اثر آپ نے شدت سے محسوس کیا ہے؟

☆☆ اسکول کی نصابی کتابوں میں منشی پریم چند کی سماجی، سیاسی اور تعمیری و اصلاحی کہانیاں، میر، سودا، خواجہ میر درد، انشا اور مولانا حالی کی آسان آسان غزلیں اور نظیر اکبر آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، برق دہلوی، خوشی محمد ناظر، علامہ اقبال اور منشی تلوک چند محروم کی دل پذیر، موسیقیت سے معمور اور سبق آموز نظمیات ان سب نے مختلف اوقات پر اپنی اپنی طرح سے میرے بچپن کے معصوم عرفان و وجدان کو متاثر کیا۔ میٹرک میں میرے پاس فارسی کا اختیاری مضمون بھی تھا جس کے نصاب میں شیخ سعدی کی ''گلستان'' اور ''بوستان'' نے تادیر مجھے مسحور کیے رکھا۔ بی۔اے میں بھی جب میں نے پھر فارسی کا مضمون اختیار کیا تو سعدی کے ساتھ ساتھ جامی، خواجو، حافظ شیرازی، نظامی، فردوسی اور رومی (مولانا روم) کا کلام پڑھنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی جس سے ذہن و دل پر ایک عجیب سا سُرور طاری ہوتا تھا۔

☆ علامہ قیس جالندھری سے تعارف، تعلق اور اکتساب کا احوال بتلایئے؟

☆☆ لدھیانہ میں سکونت پذیر ہونے کے بعد غالباً اُسی برس یعنی ۱۹۵۱ء ہی میں وہاں پر ایک مشاعرے میں علامہ قیس جالندھری کو قریب سے دیکھنے اور سُننے کا موقع ملا۔ اُن کے کلام اور اُن کی درویشانہ شخصیت سے میں بے حد متاثر ہوا۔ خوش قسمتی سے اُس شب وہ میرے ہی غریب خانے پر ہمارے مہمان رہے تھے۔ رات کو بات چیت کے دوران انہوں نے میری اُس (ناپختہ) نظم کے بارے میں اپنے گراں قدر تاثرات اور ارشادات سے نوازا جو میں نے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ میں اُن کی نکتہ آرائی سے بہت متاثر اور مرعوب ہوا اور اُن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا تو انہوں نے بخوشی میری درخواست کو قبول کر لیا اور اس طرح میں اُن کے آستانۂ ادب سے وابستہ ہوگیا۔

☆ قارئین چہارسُو کی دلچسپی کے لئے علامہ قیس جالندھری کے مختصر حالات زندگی سے روشناس کرایئے؟

☆☆ اُستادِ محترم جناب (امر چند) قیس جالندھری کے بزرگ قصبہ بجواڑہ کے باشندے تھے جو بعد میں آوارۂ وطن ہو کر بسی کلاں میں مقیم ہوئے۔ یہ قصبہ بجواڑہ سے آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر اور ضلعی صدر مقام ہوشیار پور (پنجاب) سے لگ بھگ بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر اُس سڑک پر مشرق کی طرف واقع ہے جو ہوشیار پور سے چندی گڑھ جاتی ہے۔ یہیں پر ۱۹۰۲ء میں ایک نہایت ہی معزز گھرانے میں قیس صاحب کی ولادت ہوئی۔ ان کے والد لالہ ہری رام جی اپنے علاقے کے ملک اُلتجار مانے جاتے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی اور ہر طرح کی آسائش کے سبھی سامان موجود تھے لیکن امر چند بچپن ہی سے سادگی، منکسر مزاجی اور انسان دوستی کے پرستار تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہوشیار پور کے علاقے کا ماحول نہایت خوش گوار تھا۔ ہندو، سکھ اور مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں، میلوں اور موسمی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ ہندو لوگ، مسلم بھائیوں کے روزے افطار کراتے تھے اور تعزیوں کی تعظیم کرتے تھے نیز سینہ کوبوں کو شربت وغیرہ پلاتے تھے۔ مسلم حضرات، رام لیلا، ہولی، دیوالی

وغیرہ تہواروں میں دل چسپی سے شرکت کرتے تھے، سوانگوں میں مدد کرتے تھے۔ سکھوں کے گورودواروں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بھی لنگر جاری رہتا تھا۔ وہ بھی عید اور بسنت پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ اسی ماحول میں قیسؔ صاحب کی پرورش ہوئی اور اُنہوں نے ہندو، سادھوؤں، مسلم فقیروں اور سکھ مہاپُرشوں کی سنگت میں رہ کر خود شناسی کے لیے عبادت اور ریاضت شاقہ کی اور مُراقبہ کا عمل بھی اختیار کیا۔

قیسؔ صاحب یوں تو ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے مگر اُنہوں نے مختلف مذاہب کی الہامی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اُن کی اعلیٰ اقدار اور تعلیمات کا احترام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے کالج کے زمانہ میں ہی جہاں ایک طرف فلسفۂ گیتا کو نظم کیا وہاں دوسری طرف واقعات کربلا کو بھی منظوم کیا۔ بعدازاں اُنہوں نے غزلیات، نظمیات، منظوم ڈراموں اور دیگر کئی ملکی وغیر ملکی اصنافِ سخن میں لاکھوں اشعار کہنے کے علاوہ بے شمار سلام، نعتیں، بھجن، گیت، دوہے اور مثنویاں بھی تخلیق کیں۔ لیکن افسوس کہ میری ملاقات سے بہت پہلے اُن کا بیشتر کلام اور کتابیں ایک بھاری برسات میں اُن کے گاؤں کے گھر کی چھت ڈھے جانے کی وجہ سے تلف ہو چکی تھیں۔

☆ سنا ہے! قیسؔ صاحب آخری ایام میں آپ کے ہاں قیام پذیر تھے اُن دنوں کی کچھ تفصیل اگر بیان فرمائیں تو عنایت ہوگی؟

☆☆ جی ہاں! یہ غالباً ۱۹۹۳ء کی بات ہے جب وہ پٹیالہ (پنجاب) میں اپنے چھوٹے فرزند عزیزی نانک چند کے ہاں مقیم تھے۔ میں وہاں سے اُنہیں اپنے پاس لے آیا تھا اور وہ دو ماہ تک کورکشیتر یونیورسٹی کیمپس پر میرے سرکاری مکان میں ہمارے مہمان رہے تھے۔ ان کا یہ قیام میرے لیے ایک حسین یادگار بھی تھا اور باعثِ سعادت بھی۔ قریب ایک سال قبل ایک حادثے میں اُن کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے کے لیے گھسٹ گھسٹ کر چلتے تھے۔ گھر کے جس کمرے میں ان کا قیام تھا بیت الخلاء وہاں سے قدرے دور تھا۔ لہٰذا میں نے اُن کے کمرے میں ایک کموڈ رکھوا دیا تھا جسے حسبِ ضرورت دن میں دو تین بار میں خود صاف کیا کرتا تھا۔ اُنہیں دنوں ایک بار جب معروف شاعر اور ماہر عروض ڈاکٹر زارؔ علامی قبلہ قیسؔ سے ملنے کے لیے تشریف لائے تو میں اسی مقدس فریضے کو انجام دے رہا تھا۔ زارؔ صاحب نے یہ عالم دیکھا تو مجھے گلے سے لگا لیا اور بہت پیار سے میری پیٹھ تھپتھپائی۔ کہنے لگے ''تم بہت نیک بخت ہو کیوں کہ ماں باپ اور اُستاد کی خدمت بجا لانا سب سے بڑی سعادت ہے''۔

قیسؔ صاحب کی عمر اُس وقت قریب ۹۱ سال کی تھی لیکن اپنی عمر کی اس ڈھلان پر بھی اپنی بے شمار جسمانی معذوریوں کے باوجود وہ روزانہ سترہ اٹھارہ گھنٹے لکھنے پڑھنے میں گزارتے تھے۔ اُن دنوں وہ اپنی معرکہ خیز مثنوی ''لاوا'' کو مکمل کر رہے تھے جسے اُن کی وفات کے بعد ۱۹۹۷ء میں احقر نے کتابی صورت میں شائع کروایا تھا۔

☆ آپ کے کلام میں اضمحلال اور قنوطیت کس چیز کا ردِعمل ہے؟

☆☆ گلزار بھائی! یقین جانیے کہ نا اُمیدی اور پژمردگی کا میری فطرت میں کوئی دخل ہی نہیں۔ کبھی ناموافق اور ناسازگار حالات کے پیشِ نظر وقتی طور پر قدرے یاسیت کا احساس پیدا ہوتا بھی ہے تو اُمید کی کئی کرنیں بھی میرے آس پاس رہتی ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ موت کے علاوہ انسانی زندگی کے ہر مسئلے کا حل نکالا جا سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایسے عالم میں میری غزل یا نظم میں لاشعوری طور پر کوئی حُزنیہ شعر آ بھی جاتا ہے تو اس کے آخر میں یا غزل کے مقطع میں مثبت اور نہایت حوصلہ افزا خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ زندگی اور خدا کی رحمت و رہنمائی میں میرے بھرپور اعتقاد و اعتماد کا ثبوت ہے۔ حالانکہ زندگی جب کچھ نجی چرکے ذہن و دل پر لگاتی ہے تو ان کا اثر تادیر اُمٹ رہتا ہے اور یہ زخم ایک حساس فنکار کی تخلیقات میں کہیں نہ کہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اُبھر آتے ہیں۔ آخر دل ہی تو ہے۔۔۔

☆ شوخی، شرارت اور طنز بھی آپ کے ہاں جابجا نظر آتا ہے؟

☆☆ شوخی اور شرارت کے پہلو تو روایتی اشعار میں کئی بار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ غزل کا کینوس اب بہت وسیع ہو چکا ہے اور آج اس میں حالاتِ حاضرہ اور سماجی اور سیاسی بُرائیوں کو اکثر اجاگر کیا جاتا ہے تو اس میں طنز کا حربہ بارہا بہت کارگر ثابت ہوتا ہے کیوں کہ سیدھی بات کرنے سے وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو طنز کی کاٹ پیدا کر جاتی ہے۔ ایسے ایمائی اور اشاریتی اشعار کا مقصد تفنن سے زیادہ اصلاحِ معاشرہ ہوتا ہے کیوں کہ ان کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہوتا ہے۔

☆ مے کشی آپ کے شعری اظہار کا اہم وسیلہ کیوں ہے؟

☆☆ خدا معلوم آپ نے یہ نتیجہ کیسے اور کہاں سے اخذ کر لیا! میرے ابتدائی کلام میں ہر مُبتدی کی طرح ایسے کچھ اشعار ضرور در آئے ہوں گے لیکن بعد میں جہاں تک مجھے یاد ہے اس کا استعمال کسی نہ کسی علامت کے طور پر ہی کیا گیا ہے۔ ہماری کلاسیکی شاعری کی روایات میں عشق کے علاوہ مے کشی اور ذکرِ ساقی لوازماتِ شاعری کا ایک جزو رہے ہیں۔ ابتدائے شاعری میں نو آموز شاعر بھی ان مضامین کو بطور فیشن زیرِ مشق لاتا ہے بلکہ بقول نریش کمار شادؔ (آنجہانی) اُردو کے شاعر کے بارے میں یہ مفروضہ عام ہے کہ ''وہ شرابی ہوگا اور عاشق بھی''۔ ذاتی طور پر بھی شغلِ مے کشی میری زندگی کا جزو لازم نہیں تاہم میں قسم بھی نہیں کھا سکتا کہ دُخترِ رز کو آج تک کبھی منہ نہیں لگایا۔ اس سے مکمل بے نیازی تو اس گلفام حسینہ کی دل شکنی اور توہین کا گناہ گار قرار دیتی مجھ کو۔۔۔!

☆ آپ کی شاعری میں مکالمے کی کیفیت کب اور کیونکر در آئی؟

☆☆ یہ غالباً ۱۹۶۹ء کی بات ہے جب میں دہلی یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کے مضمون میں پوسٹ گریجویشن کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ایک ذاتی سانحے کے زیرِ اثر میں نے ایک طویل نظم کہی تھی ''تجدیدِ وفا'' جو ایک خط کے

جواب میں تھی۔اس نظم کا ذیلی عنوان بھی یہی تھا (ایک خط کے جواب میں)۔ چھبیس بندوں پر مشتمل اس نظم کی آمد اس قدر شدید اور رواں تھی کہ یہ دو ہی دن میں مکمل ہو گئی تھی اور اس کے دو بند تو اُس وقت نازل ہوئے تھے جب میں کمرۂ امتحان میں بیٹھا پرچہ لکھ رہا تھا۔اس کیفیت کا آغاز شاید یہیں سے ہوا تھا۔بعد کی کچھ نظموں میں بھی یہ کیفیت موجود ہے جو موضوع کی ضرورت کے تحت ہے۔

☆ آپ کے ہاں ایک سے زائد زبان اردو، ہندی، عربی، فارسی حتیٰ کہ انگریزی کے استعمال کا سبب دانستہ ہے یا غیر دانستہ اور اس کے فوائد کیا ہیں؟

☆☆ انگریزی الفاظ کا استعمال تو میرے ہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہندی میری قومی زبان ہے اور عربی و فارسی کے الفاظ تو اردو کے پیدائش ہی سے اس کے ذخیرہ ادب میں موجود ہیں یہاں تک کہ اردو زبان کا رسم الخط بھی عربی رسم الخط سے ماخوذ ہے۔قدرے تفصیل میں جائیں تو حقیقتِ حال یہ ہے کہ اردو میں لگ بھگ بیس فی صد عربی الفاظ ہیں جیسے کرسی، شہید، انقلاب، عینک، اثر، مرض، نقل، وصل، اثاثہ وغیرہ۔لگ بھگ بارہ فی الفاظ فارسی کے ہیں جیسے چشمہ، تاوان، جوش، جام، گم، گور، گوہر، کس وناکس وغیرہ۔اسی طرح قریب دو ڈھائی فیصد انگریزی، فرانسیسی، پُرتگالی، ترکی وغیرہ کے الفاظ ہیں، اردو خود ترکی لفظ ہے بمعنی لشکر، فوج۔

☆ آپ نے کچھ اضافی تراکیب بھی اپنے کلام میں متعارف کرائی ہیں۔اُن کی تفصیل اور جواز بتلائیے؟

☆☆ اضافتی تراکیب بھی فارسی ہی کی دین ہیں اور فارسی کی طرح اردو شاعری میں بھی ان کا استعمال بہت مفید ثابت ہوتا ہے خصوصاً غزل میں جہاں دو مصرعوں کے اندر ہی پورے مضمون کو سمیٹنا ہوتا ہے۔لہٰذا میں نے بھی حسبِ ضرورت جابجا کچھ اضافتی تراکیب کا استعمال کیا ہے جیسے نرگسِ بیمار، متاعِ درد، سازِ وفا، رنگِ حنا، حرفِ ملامت، خواہش بے جا، تجدیدِ وفا اور شکستِ ربط وغیرہ۔

مزید برآں بہت سے عربی الفاظ بھی اضافتوں اور حروفِ عطف کے اتصال کے ذریعہ فارسی الفاظ سے جڑ گئے ہیں اور غیر دانستہ طور پر عام زبان کا حصہ بن چکے ہیں جیسے کرسی نشیں (کرسی عربی زبان کا لفظ ہے اور نشین فارسی کا)۔ اسی طرح شہیدِ ناز، حیات بخش، روح افزا، روح فرسا، نصیبِ دُشمناں، قیدِ قفس، دستِ قضا وغیرہ۔

☆ جدیدیت سے آپ کا تعلق جوڑنے والے حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں یا محض آپ کی دلجوئی؟

☆☆ بھائی جان! جدیدیت کی چھاپ لگا کر کوئی میری دلجوئی کیا کرے گا کیوں کہ مجھے خود ہی اپنے بارے میں ایسا کوئی گمان نہیں ہے۔جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ میرا تعلق قبلہ جوش ملسیانی کے آستانہ ادب سے رہا ہے اور میرے اُستادِ محترم حضرت قیسؔ جالندھری بھی زیادہ تر قدامت پسندی اور روایت پسندی کے روادار رہے۔لیکن اس کے باوصف میں نے اس خاندان کی شعری روایات کی کچھ پابندیوں سے انحراف کرنے کی گستاخانہ جسارت بھی کی جو اس ناچیز کی نظر میں غیر ضروری تھیں۔میرے نزدیک وہی ادب لائق قدر ہے جس میں مناسب فنّی لوازمات اور روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ عصری تقاضوں کا اظہار بھی ہو۔اور وہ اظہار بامقصد بھی ہو اور بامعنی بھی یعنی محض لفاظی یا فارسیت کا لبادہ پہنا کر اسے گنجلک نہ بنا دیا جائے۔لہجہ یا ذخیرۂ الفاظ جدید ہو لیکن شعر کا خیال اور موضوع واضح اور قابلِ فہم ہو۔ایسی متوازن روش جس میں نئے اور پُرانے کا حسین امتزاج ہو یقیناً مجھے قابلِ قبول بھی ہے اور میرے دل کے قریب بھی۔

☆ اس کا تعلق کسی طور ترقی پسندی سے بھی بنتا ہے؟

☆☆ یقیناً جدیدیت کا اصل اور منظم دور بھی اُسی وقت سے شروع ہوتا ہے جب بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کا قیامِ عمل میں آیا۔اس انجمن کی پہلی کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے فرمائی تھی جنھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس تحریک کے مقاصد بیان کرتے ہوئے ارشاد کیا تھا کہ:

> ''ادب برائے ادب'' کا نظریہ زندگی سے فرار کے مترادف ہے۔ ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا جس میں تفکّر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سُلائے نہیں کیونکہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''

دراصل یہ تحریک ایک طرح سے ہمارے ملک کی تحریکِ آزادی ہی کی ایک کڑی تھی جس میں بے شمار مشاہیرِ ادب شامل تھے۔مولانا حسرت موہانی نے بھی اپنی تقریر میں واضح طور پر فرمایا تھا کہ

> ''ہمارے ادب کو قومی آزادی کی تحریک کی ترجمانی کرنی چاہیئے''

ادب کے ان نئے تقاضوں کے پیشِ نظر نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ اسلوب اظہار میں بھی تبدیلیاں آنا لازمی تھیں۔لہٰذا اس انجمن کے کارواں میں شامل شعراء و ادباء کے تخلیق کیے گئے ادب کو ایک نیا اظہارِ بیاں ملا جس میں جدّت بھی تھی اور جوش بھی۔پھر تحریک آزادی کے مقاصد اور لائحہ عمل میں عوام کو مفلسوں اور محنت کشوں کو اُن کی ذلت آمیز زندگی سے نکال کر اقتصادی آزادی دلانا بھی شامل تھا۔لہٰذا غزل کی روایتی عشق پرستی سے ادب کو خارجیت کی جانب موڑ دیا گیا۔یہ ایک طرح سے جدیدیت کا آغاز تھا۔لیکن حصول آزادی کے ایک دہے بعد اس خارجیت کو پھر داخلی مایوسی، بیزاری، خود رحمی کے عناصر سے بوجھل کر کے اسے جدیدیت کا نام دے دیا گیا۔میں قطعاً اس کا قائل نہیں ہاں اگر عوامی مسائل وعوامل کے اظہار کو جدیدیت سمجھا جائے تو بلاشبہ میں اس کا معتقد ہوں۔

☆ مزاج صوفیانہ سے مراد کیا ہے؟

☆☆ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ درویشوں کی اصطلاح میں صوفی اُس پارسا اور پرہیزگار انسان کو کہتے ہیں جو اپنے دل کو دنیا کی آلائشوں سے پاک و

صاف رکھّے اوراس میں سوائے خدا کے کسی کا خیال نہ آنے دے اور چونکہ یہ اعلیٰ کردار درویش اکثر صوف یعنی اُون یا پشم کا لباس پہنتے تھے اس لیے صوفی کہلائے۔آپ کے اس سوال کی بنا غالباً میرے کسی کرم فرما کی تحریر ہے جس نے میرے بعض اشعار میں کچھ روحانی پُٹ دیکھ کر ان صفات کو مجھ خاکسار سے منسوب کر دیا ہوگا حالاں کہ سچائی تو یہ ہے کہ یہ گنہگار دنیا کی آلائشوں سے ہرگز پاک وصاف نہیں ہے۔ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں نیک نیتی میں مکمل یقین رکھتا ہوں اور میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ کسی کے ساتھ دغا فریب، دوستی میں استحصال اور کسی کا حق مارنا جیسے اعمال سے گریز کیا جائے اور کسی کے کیے گئے احسان کو کبھی بھُلایا نہ جائے۔اور اپنے اس مسلک کا اظہار میں نے جا بہ جا اپنے اشعار میں بھی کیا ہے۔غالباً اسی کے پیشِ نظر کسی اہلِ نقد ونظر نے میری نسبت اس صفت کا استعمال کر دیا گیا ہوگا۔یقیناً یہ اُن کی محبت ہے اور اعلیٰ ظرفی بھی، ورنہ مجھے اپنے بارے میں ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔

☆ ع شیشۂ دل سے کوئی یاد جو ٹکرائی

شعر کے مخاطب پر روشنی ڈالئے؟

☆☆ یہ ایک بہت پرانی غزل ہے لہٰذا اب یہ تو یاد نہیں کہ اس شعر کا تعلق کس سے تھا۔ہاں ماضی کی یادیں ایک حسّاس فنکار کو ہمیشہ بہت عزیز ہوتی ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات کچھ کڑوی یادوں کی کسک بھی میٹھی اور راحت بخش لگتی ہے۔لیجیے اپنی ایک غزل کا مقطع آپ کی نذر کر رہا ہوں جس میں اسی احساس کا اظہار کیا گیا ہے:

سینے سے لگا لو ، اِسے پلکوں پہ سجا لو

اے چانؔد! یہ بیتے ہوئے لمحوں کی چبھن ہے

☆ کچھ تفصیل اُس عشقِ مجازی کی بتلایئے جس کا ذکر احباب نے اپنی تحاریر میں جا بجا کیا ہے؟

☆☆ آپ کے اس سوال پر آنجہانی اداکارہ مینا کماری نازؔ کا یہ شعر ذہن میں آ رہا ہے۔

تم کیا کرو گے سُن کر مجھ سے میری کہانی

بے کیف زندگی کے قصّے ہیں پھیکے پھیکے

ویسے بھی وہ زمانہ وہ دَور اب بہت پیچھے رہ گیا ہے اور اُن قصّہ ہائے پارینہ کو بیان کر کے راکھ کریدنے اور دبی چنگاریوں کو سلگانے سے اب کیا حاصل!

☆ آپ کے ہاں محبوب کا تصور اور اُس کا بیان عدم توازن کا شکار نظر کیوں آتا ہے؟

☆☆ عشق مجازی کے ذکر میں جذبات کا دریا رواں دواں ہوتا ہے اس لیے اس کے اظہار میں احساسات کا شدت کے ساتھ اُمڈ کر آنا عین فطری بات ہے جبکہ عشق حقیقی کے بیان میں صالح وصدق دلانہ جذبات پر سنجیدگی کا پہرہ بھی ہوتا ہے۔اسی وجہ سے دونوں قسم کے عشق کے اظہار بیاں میں مماثلت نہیں ہو سکتی۔شاید اسی فرق کو آپ نے عدم توازن کا نام دیا ہے۔

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ عشق ومحبت کی بہتات نے اردو ادب وشاعری کو زمانے کی تیز رفتاری سے کسی قدر لاتعلق کر دیا ہے؟

☆☆ ایک زمانہ تھا جب صورتِ حال کچھ ایسی ہی تھی لیکن فی زمانہ علوم و فنون کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ بھارت، پاکستان و دیگر ممالک میں بھی جہاں جہاں اردو کے قلم کار قیام پذیر ہیں انہوں نے بہت بامقصد ادب کی تخلیق کیا ہے اور کر رہے ہیں۔لہٰذا میرے خیال میں آج کے اردو ادب پر یہ الزام عائد نہیں کیا جانا چاہیے۔شاعر معاشرہ کا ایک ذمہ دار فرد بھی ہے۔آج شاعر جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ ہے پھر اردو ادب وشاعری میں گذشتہ بیسویں صدی میں مختلف تحریکات جیسے مولانا حالیؔ کی نیچرل شاعری کی تحریک، ترقی پسندی، جدیدت اور مابعد جدیدیت سب نے اردو ادیبوں کے تخلیقی عمل کو متناسب اور متوازن بنانے میں اپنا اثر دکھایا ہے۔

☆ ماضی کے وہ کون سے زخم ہیں جن کی نشان دہی آپ کے کلام میں اکثر کی جاتی ہے؟

☆☆ دیکھا جائے تو اس دھرتی پر ہر شخص زخم خوردہ ہے۔لہٰذا میرے بھی اپنے کئی دکھ ہیں، کچھ غمِ جاناں، کچھ غم دوراں۔۳۳ سالہ نوجوان بیٹے کی سڑک حادثہ میں مرگِ ناگہانی، ماں باپ کا انتقال اور اس ڈھلتی عمر میں شریک حیات کا اچانک عارضہ قلب سے فوت ہو جانا۔اس طرح کے حادثے میری زندگی کو نڈھال کر گئے اور ان کا عکس میری شاعری پر پڑنا ایک فطری عمل تھا۔لیکن میرا عقیدہ ہے کہ انسانی زندگی کو متوازن رکھنے کے لیے نشاط وعیش کے ساتھ ساتھ غم و آلام کا ہونا بھی ضروری ہے۔ہاں حزنیہ جذبات واحساسات کو فن کے آئینے میں نکھارنے سے ان کی کثافت دور ہو جاتی ہے۔علاوہ ازیں الم نواز اور دردمند قارئین کو ایسی تحریریں پڑھ کر دلی سکون حاصل ہوتا ہے کیوں کہ اُنہیں یہ بیانیہ اپنے دل کے قریب لگتا ہے۔مزید حزنیہ شاعری میں جب قاری کو یہ عرفان ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہی غم خوردہ یا آفت زدہ نہیں تو وہ آپ بیتی میں جگ بیتی کے احساس سے ڈھارس اور تسکین پاتا ہے۔مجھے یاد ہے ۸۰-۱۹۷۹ء میں جب میں ایک Foreign Assignment پر عدیس اَبابا یونیورسٹی ایتھوپیا (مشرقی افریقہ) کے علے مایا کیمپس پر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا تو میں وہاں اکیلا تھا۔کیمپس پر تین ہندوستانی ساتھی اور تھے جن کے بیشتر افرادِ خانہ اُن کے ساتھ تھے۔ایک صاحب اکیلے تھے جو میری طرح اپنی ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے اپنی اہلیہ اور بچوں کو اپنے ساتھ نہیں لا پائے تھے۔مجھے تو وہاں گئے ہوئے ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا لہٰذا گھر والوں سے بچھڑنے کے زخم تازہ تھے وہ حضرت وہاں چھ ماہ سے مقیم تھے۔ایک روز میں نے اُن سے پوچھا ''مسٹر گھو

وِشی! کیا آپ کو اپنے بیوی بچوں کی یاد نہیں آتی؟" میرا اتنا کہنا تھا کہ وہ پھوٹ پڑے اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مجھے ان کے اس عمل سے راحت جاں حاصل ہوئی تھی جس کا اظہار میں نے بعد میں اپنی ایک غزل کے اس شعر میں کیا تھا:

ہائے! تنہائی کا احساس کہ جاتا ہی نہیں
ہاں، سکوں ملتا ہے کچھ درد کے ماروں سے مجھے

☆ آپ کا شمار تقسیم ہند کے عینی شاہدین میں ہوتا ہے کچھ آنکھوں دیکھا، کچھ جگ بیتا اور کچھ خود بیتا احوال بتلایئے؟

☆☆ تقسیم ملک کے وقت جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں میری عمر صرف بارہ سال کی تھی اور پھر خوش قسمتی سے ہمارے شہر کے نیک سیرت مسلم تھانیدار نے ہمیں آس پاس کے علاقوں سے آنے والے بلوائیوں سے پورے طور پر محفوظ رکھا (خدا اُسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین) شہر کے مسلمان بھائیوں کا سلوک بھی ہم غیر مسلموں کے ساتھ نہایت ہمدردانہ اور مثبت تھا۔ ہاں ہجرت کے وقت ریل کے سفر کے دوران کچھ دل خراش واقعات ضرور ان معصوم آنکھوں کو دیکھنے کو ملے تھے، کچھ متعصب ریلوے حکام اور ملازمین نے معاندانہ رویہ بھی دکھایا۔ اِدھر آنے کے بعد جب کچھ بڑا ہوا تو اس دور کے کئی ناخوش گوار سانحات کے بارے میں سُننے اور پڑھنے کو ملا جس سے دل دہل جاتا تھا۔ آج بھی اُن منحوس دنوں کی یاد آتی ہے تو دل رو اٹھتا ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا تھا اور آپس میں بھائیوں کی طرح مل جل کر رہنے والے لوگ، اُدھر بھی اور اِدھر بھی، یکا یک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہو گئے تھے؟ محض یہی نہیں کئی نابغۂ روزگار علماء، بلوائیوں کے قتل و غارت کا شکار ہو گئے اور یہ سب ہمارے سرحد کے دونوں طرف کے سیاسی لیڈروں کی ناعقبت اندیشی کا خمیازہ تھا جسے دونوں ملکوں کے عوام اب تک بھگت رہے ہیں۔

☆ ان ناخوشگوار یادوں سے فرار وقتی ہے یا حقیقی؟

☆☆ ان ناخوشگوار یادوں سے فرار ناممکن نہیں تو دشوار ترین ضرور ہے کیوں کہ وقت کے ساتھ پُرانے زخم بھر تو جاتے ہیں لیکن وہ اپنے دائمی نقوش چھوڑ جاتے ہیں جن سے کئی موقعوں پر وہ زخم پھر ہرے ہو جاتے ہیں۔ بس اب تو یہی دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر وہ وقت دوبارہ کسی پر نہ لائے! اگر دونوں ملکوں کے عوام نفرت کی جگہ پُر خلوص تعاون، صلح و سمجھوتہ سے کام لیں تو یہ فرار مستقل بھی ہو سکتا ہے۔ نوجوان نسل کو دُور اندیشی اور خیر سگالی کی بنا پر اسے مستقل بنانے کے لیے آگے آنا چاہیے۔

☆ یہ نیچرل شاعری کیا ہوتی ہے؟

☆☆ ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریکِ آزادی کے بعد اہلِ ہند اِنتشار کا شکار تھے۔ ناخواندگی اور پسماندگی کے اس عالم میں شعراء و ادباء کے اندازِ نظر میں تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آ رہی تھیں اور شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ جو ادب فلاحِ عوام کا حامل نہیں وہ بیکار اور بے معنی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مغربی ادب بھی تعلیم یافتہ طبقے پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ لکھنؤ اور دلّی کے مکاتبِ ادب کی غزل، جاگیردارانہ عیش کوشی، عُریانی، فحاشی اور ابتذال کا شکار ہو چکی تھی، فرسودہ مضامین اور بے مقصد قافیہ آرائی بن کر رہ گئی تھی۔

اسی تناظر میں ۱۸۷۴ء میں سررشتۂ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں لاہور میں ایک انجمن قائم کی گئی جس کے بانیوں میں حضرات محمد حسین آزاد اور مولانا حالؔی پیش پیش تھے۔ اس انجمن کے تحت نئی طرز کے مشاعروں کا آغاز ہوا تھا جس میں مصرع طرح یا قافیہ و ردیف کی پیروی کرنے کی بجائے کوئی موضوع دیا جاتا تھا۔ حالؔی کی یہ چار مقبول نظمیں "برکھا رُت"، "نشاطِ اُمید"، "مناظرۂ رحم و انصاف" اور "حبِ وطن" انہیں مشاعروں کی یادگار ہیں اور ایسی نئی طرح کی شاعری کو ہی پہلی بار "نیچرل شاعری" کا نام دیا گیا تھا جس میں عوامی دلچسپی کے موضوعات و مسائل کو ترجیح دی گئی۔ غزل اور فرسودہ روایتی قصیدہ کی جگہ نظموں نے لینی شروع کی۔ "ادب برائے زندگی" کی طرف یہ پہلا موثر قدم تھا جسے قریب نصف صدی بعد "ترقی پسند تحریک" نے مزید تقویت بخشی۔ یقیناً یہ خاکسار بھی ایسی ہی بامعنی اور بامقصد شاعری کا حامی ہے اور اسی وجہ سے کسی کرم فرمانے میرے کلام میں کہیں اس کی کوئی نشان دہی کر دی ہوگی۔

☆ آپ کی یہ رائے وضاحت طلب ہے کہ اردو شاعری کا اپنا کچھ نہیں سب کچھ فارسی سے مستعار ہے؟

☆☆ میں واضح کر دوں کہ یہ بیان خاکسار کا نہیں بلکہ ڈاکٹر سید حسن عباس گوپال پُوری صاحب (حال صدر، شعبہ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی) کا ارشاد ہے جنہوں نے ۱۹۸۴ء میں راقم السطور کے پہلے شعری مجموعہ "حرفِ راز" پر لکھے گئے ایک مضمون میں فرمایا تھا۔ دراصل موصوف نے بھی یہ جملہ کسی اور عالم فن کے ارشادات کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا۔ ویسے یہ تو صحیح ہے کہ اردو شاعری کے اوزان و بحور اور بیشتر اصنافِ سخن یہاں تک کہ اس کا رسم الخط بھی فارسی اور عربی ہی سے مستعار ہے۔ اوّل اوّل اردو شاعری کی تشبیہات و استعارات اور موضوعات پر بھی فارسی ہی کا غلبہ تھا لیکن اس روش میں غیر معمولی تغیر آ چکا ہے۔ غزل ہو یا نظم جذبے کے اظہار میں اب بہت تنوع پیدا ہو چکا ہے اور فی زمانہ اردو شاعری پر اس خیال کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اردو کی جملہ شعری و نثری اصناف پر مقامی اثرات نمایاں ہو رہے ہیں۔ گزشتہ نسل میں بھی اقبال اور محرومؔ کی شاعری میں ہمالہ، گنگا اور سندھ کا بکثرت ذکر ملے گا۔ بلا استثنا دینی ادب کے، اب ہم اپنی تخلیقات میں کوہِ طور اور کوہِ بے ستوں کی جگہ ہمالیہ اور ہندوکش کو دجلہ، فرات اور نیل کی جگہ گنگا، جمنا، راوی، ستلج، جہلم اور سندھ کو علائم بنا رہے ہیں۔ قلزم کی جگہ ڈل جھیل اور گوبند ساگر ڈیم نے لے لی ہے۔ محض یہی نہیں ہندی ادب میں بھی غزل نے ایک معتبر اور موثر مقام بنا لیا ہے اور اس لین

دین میں اردو ادب میں ماہیا، دوہا، گیت، سورٹھا، ثلاثی اور تکونی وغیرہ کو قبولِ عام ملا ہے۔ ہندی، پنجابی اصنافِ سخن نے اردو کو اور بھی متمول کر دیا ہے۔

☆ احباب جب آپ کی حالیؔ اور اقبالؔ سے نسبت کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کا مطلب کیا ہوتا ہے؟

☆☆ اپنے متذکرہ بالا مضمون ہی میں ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب نے میری کچھ تعمیری نظموں اور اسی نوع کے کچھ غزلیہ اشعار کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ ارشاد کیا تھا۔ شاید ان محترم اہلِ نقد و نظر کو اس خاکسار کے کلام میں کہیں کہیں افادیت اور مقصدیت کے عناصر نظر آئے ہوں گے۔ یقیناً یہ ان کا حسنِ نظر ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔

☆ کچھ لوگ میرؔ کے اثرات بھی آپ کے ہاں تلاش کرتے نظر آتے ہیں؟

☆☆ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرؔ کو واقعی میں بہت پسند کرتا ہوں کیوں کہ میری نظر میں ایک اچھے ادیب کو ایک اچھا انسان بھی ہونا چاہیے۔ اسی لیے میں میرؔ کو ایک افضل ترین شاعر و انسان مانتا ہوں کیوں کہ ان کے کردار اور اُن کی گفتار میں گہری مناسبت ہے۔ کہنے کو تو غالبؔ نے بھی فرمایا تھا کہ:

اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

لیکن عملی طور پر وہ اس قول پر کھرے نہیں اترے۔ میرؔ نے اپنی طویل (اسّی سالہ) عمر کے دوران کئی بار فاقے کیے ہزاروں غم و آلام سہے مگر اپنی خودداری کو کبھی نیلام نہیں کیا۔ بطور شاعر بھی میں میرؔ کو غالبؔ سے برتر مانتا ہوں۔ افسوس یہی ہے کہ میرؔ کو حالیؔ اور ڈاکٹر بجنوری جیسے مداحین نصیب نہ ہو سکے۔ اپنے خیال کی تائید میں ذیل میں ایک ہی موضوع پر دونوں کے محض دو شعر درج کر رہا ہوں۔ میرؔ کے مقابلے میں غالبؔ کی سوچ کی اُڑان کتنی محدود ہے اس کا فیصلہ میں، آپ اور قارئین پر چھوڑتا ہوں:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
(غالبؔ)

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا
(میرؔ)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کے وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے ، یہی انتظار ہوتا

یا

تیرے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
(غالبؔ)

اُن کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عُمر نے ہم سے بیوفائی کی
(میرؔ)

میرؔ کی شانِ عاشقی دیکھیے کہ اُنہوں نے غالبؔ کی طرح محبوب کو نہیں بلکہ عمر کو بے وفا کہا ہے۔ گو غالبؔ نے بعد میں میرؔ کی تقلید میں یہ شعر بھی کہا کہ:

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اور جو جیئے ہوتے

لیکن وہ بات پیدا نہ کر سکے۔ قاری خود اس بات کا منصف ہے۔ عموماً اردو شاعروں نے معتقدین کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور قدرتی طور پر میرؔ و غالبؔ سے اثر قبول کیا ہے۔ البتہ شاعری میں میں نے میرؔ کی طرح سلیس اور عام فہم زبان برتنے کی کوشش کی ہے حالاں کہ:

چہ نسبت خاک را با عالم پاک؟

☆ مذکورہ بالا جواب میں آپ نے غالبؔ کو میرؔ سے کم تر درجے کا شاعر گردان کر ایک متنازعہ در وا کیا ہے جبکہ احباب غالبؔ سے استفادے کا ذکر بھی آپ کے باب میں اکثر کیا کرتے ہیں جو بجائے خود وضاحت طلب ہے؟

☆☆ گو غالبؔ کے ہاں میرؔ کا سا دردو غم اور سوز و گداز، زبان کی صفائی اور بیان کی سادگی اور گھلاوٹ تو نہیں ہے لیکن غالبؔ کی معنی آفرینی اور منفرد اندازِ بیاں، شوخی اور ظرافتِ طبع اپنی جگہ پر مسلّم ہیں۔ سطحی شاعری سے اُنہیں نفرت تھی۔ اسی لیے ان کا اندازِ بیاں ایک انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مقبولیت آج بھی قائم ہے (حالانکہ یہ رتبہ بھی اُنہیں سلاست اپنانے کے بعد ہی میسّر آیا ورنہ ان کی مشکل پسندی تو اُنہیں کہیں کا نہ چھوڑتی)۔ شعوری یا لاشعوری طور پر ہر شاعر کسی نہ کسی طرح سے استفادہ کرتا رہا ہے جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے۔

☆ آزادؔ اور اکبرؔ سے آپ کی قربت کی نوعیت کیا ہے؟

☆☆ ناچیز کے کچھ اشعار میں کسی اہلِ نقد نے آزادؔ اور حالیؔ کی ''نیچرل شاعری'' کی حقیقت نگاری اور اکبر الہ آبادی کی سی شوخی اور تہہ داری کی کوئی جھلک دیکھ کر اس قربت کا ذکر فرمایا تھا جو اُن کے حسنِ نظر اور اُن کے حسنِ توجہ کا مظہر ہے۔

☆ فیض کی آواز اور اُس کی گونج آپ کی ہاں کن معنیٰ اور مفہوم میں سنائی دیتی ہے؟

☆☆ دراصل میری طویل رُومانی نظم ''تجدیدِ وفا'' پر تبصرہ فرماتے ہوئے کچھ احباب نے اس کے جذبۂ احساس اور بے روک بہاؤ کی دل کشی اور رُومانیت کے باوجود اس میں ضبط و توازن کی کوشش کو لائقِ تحسین مانتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اس نظم کا اسلوب فیض کی نظموں کی یاد دلاتا ہے''۔

☆ ''حرفِ راز'' میں شامل سانیٹ انگریزی ادب و شاعری سے آپ

کے شغف کی نشان کے لیے کافی ہیں۔ کچھ تفصیل پسندیدہ کتب اور اہلِ قلم کی بتلایئے؟

☆☆ یہ سانیٹ ان دنوں کی یادگار ہے جب میں ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں ایم۔اے (انگریزی ادب) کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ گو ایک سال کے بعد، کچھ خانگی مجبوریوں کے تحت مجھے یہ کورس بیچ ہی میں چھوڑنا پڑا تھا لیکن انگریزی ادب سے میرا لگاؤ بی۔اے کی پڑھائی کے وقت ہی سے تھا جو آج بھی برقرار ہے۔ اس وقت تھامس ہارڈی میرے پسندیدہ ناولسٹ اور شیلے، کیٹس، ورڈز ورتھ اور ابرٹ فراسٹ میرے محبوب شاعر تھے۔ ہارڈی کے مشہورِ زمانہ ناول ''Tess of the Durbevilles'' اور ''The Mayor of Casterbridge'' نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ انہیں دنوں میں نے کئی انگریزی کہانیوں اور مضامین کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا تھا اور یہ سب اُس وقت کے اخبارات میں شائع بھی ہوئے۔ بعدازاں چار پانچ بار اپنے لندن اور امریکا کے قیام کے دوران مجھے چارلس ڈکنس، ماریو پُوزو، جان گریشم اور ایفرو امریکن انعام یافتہ شاعرہ اور معروف ناول نگار ایلس واکر کی شہرۂ آفاق تخلیق ''The Colour Purple'' کے علاوہ وکرم سیٹھ کا ''The Suitable Boy'' انیتا ڈیسائی کا ''Fire on the Mountain'' ملک راج آنند، آر کے نارائن، کملا داس اور خوشونت سنگھ جیسے کئی انڈو انگلش ناول نگاروں کی تخلیقات پڑھنے کا موقع ملا۔ میری ذاتی لائبریری میں آج بھی قریب دو درجن انگریزی کی کتابیں موجود ہیں جن کا بشرطِ فراغت میں مطالعہ کرتا ہوں۔

☆ ہریانہ کی درسی کتب میں آپ کا کلام کب شاملِ نصاب ہوا اور کس درجہ کی کتب میں کونسا کلام پڑھایا جاتا ہے؟

☆☆ ہریانہ کی درسی کتب میں میرا کلام شاملِ نصاب نہیں ہوا تھا بلکہ میری تیار کردہ کتاب ۱۹۸۶ء میں شامل نصاب کی گئی تھی۔ ہریانہ کے محکمۂ تعلیم کے ایما پر میں نے یہ کتاب ساتویں جماعت کے طلباء کے لیے تالیف کی تھی جو ضلع میوات کے اسکولوں میں آج بھی رائج ہے۔ سر دست صوبہ ہریانہ میں یہی ایک ضلع ہے جہاں کالج کی سطح تک اردو کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔

☆ ہریانہ بالخصوص انبالہ میں اردو زبان و ادب کی صورت حال کیا ہے نیز مستقبل کے حوالے سے ہندوستان میں کیا صورت حال بنتی نظر آ رہی ہے؟

☆☆ ہریانہ میں صوبائی سطح پر ۸۶۔۱۹۸۵ء میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا تھا اور ان پچیس چھبیس سالوں میں اردو زبان و ادب کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ انعامات و اعزازات کے ذریعہ ریاست کے اہلِ قلم کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے۔ سیمینار اور مشاعرے منعقد کیے جاتے ہیں، کتابیں شائع کی جاتی ہیں اور اردو کی مفت تعلیم فراہم کرانے کے لیے کچھ جگہوں پر مراکز بھی قائم کیے گئے ہیں۔ لیکن مختلف اکادمیوں یا سرکاری و نیم سرکاری ادبی اداروں میں عہدے داروں کی تقرری، انعامات و اعزازات کے لیے انتخاب کس بنا پر کیا جاتا ہے یہ آپ بھی بخوبی جانتے ہوں گے۔ بارہا کسی قابل اور فعّال افسر کی برسوں کی محنت سے قائم کیے گئے اعلیٰ معیار یا عکس کو کوئی نااہل آ کر چند دنوں میں ہی مٹی میں ملا کر رکھ دیتا ہے۔ خیر، اس وبا کا شاید کوئی علاج ہی نہیں!

☆ اردو زبان کے رسم الخط کے حوالے سے جاری بحث میں آپ کی پوزیشن کیا ہے؟

☆☆ اردو زبان کی صحیح پہچان اس کے اپنے رسم الخط ہی سے ہے۔ دیوناگری میں لکھی گئی اردو زبان میں کئی خامیاں در آتی ہیں کیوں کہ ہندی زبان میں اردو و فارسی کی بہت سی آوازیں موجود نہیں۔ لہٰذا دیوناگری یا کوئی اور رسم الخط اس زبان کی بقا اور ترویج و ترقی کا کسی طور بھی ضامن نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم کسی بنگالی، تمل، کشرط (کیرل کے باسی) یا تیلگو دیشی سے کہیں کہ اپنا رسم الخط چھوڑ کر دیوناگری میں اپنی زبان لکھو تو وہ کبھی نہیں مانے گا۔ لہٰذا اردو کو بھی رسم الخط بدلنے پر مجبور کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ آپ کے ملک میں تو خوش قسمتی سے سندھی، بلوچی، پنجابی، سرائیکی وغیرہ سبھی فارسی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی ہیں۔

☆ کسی زمانے میں آپ سرائیکی زبان میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ آج کل اس حوالے سے صورت حال کیا ہے؟

☆☆ سرائیکی میری مادری زبان ہے اور میں آج بھی اس زبان میں شعر کہتا ہوں گو اس کی رفتار قدرے کم ہوگئی ہے کیوں کہ اب یہاں وہ ماحول ہی نہیں رہا۔

☆ ہندوستان میں سرائیکی ادب کا حال اور مستقبل کس طرح کا نظر آتا ہے؟

☆☆ تقسیم ملک کے بعد کچھ برسوں تک پاکستان کے سرائیکی علاقوں سے ہجرت کر کے آئے ہوئے سرائیکی ادیبوں کا ایک خاصا کارواں تھا جن میں ناز سونی پتی، رانا گنوری، اُودے بھانو ہنس، ہیرا نند سوز، شباب للت، منور سرحدی، ڈاکٹر ستیہ پال بیدار، شری آتم نندوانی، شری ستیہ پال جانباز پانی پتی اور یہ خاکسار کچھ سرائیکی مشاعروں اور کانفرنسوں کے طفیل کافی فعال رہے۔ لیکن اب اس زبان و ادب کے

''جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں''

اور اس کے لیے آبِ بقائے دوام لانے والے جو چند ساقی بچے ہیں وہ کچھ ہندی اور پنجابی جریدوں میں وقف کیے گئے چند صفحات میں آج بھی نظر ضرور آتے ہیں لیکن بیشتر سرائیکی نژاد گھرانوں میں نئی پود اس زبان سے ناواقف ہے۔ لہٰذا اس صورت حال کے پیشِ نظر آنے والے وقت میں اس زبان کا یہاں اللہ ہی والی ہے کیوں کہ یہاں اس زبان کی بقاء موجودہ پیڑھی تک ہی محدود ہے۔

☆ آپ کے نثری مضامین تحقیق و تنقید کے کس زمرے میں شمار کیے جانے چاہئیں مقصد کہنے کا یہ ہے کہ آپ کو محقق یا نقاد کی کس صف میں شامل کیا جانا چاہیے؟

☆☆ یہ صحیح ہے کہ حال ہی میں میرے تحقیقی وتنقیدی مضامین کی دو کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں اور ان کی خاطر خواہ پذیرائی بھی کی گئی ہے۔ ان کے علاوہ گو میں نے قریب دو درجن کتابوں پر تبصرے بھی لکھے ہیں اور چند عزیزوں کی فرمائش پر کچھ تعارفی مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں خود کو ایک نقاد کی صورت میں نہیں بلکہ ایک ادنیٰ محقق اور مورخ کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اس بارے میں یہ کمترین کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں لیکن مسلسل مطالعے اور تحقیق جاری رکھتے ہوئے میں ''خوب سے خوب تر'' کی جستجو میں ضرور لگا رہوں گا۔

☆ کچھ عرصہ پیشتر آپ پاکستان کے سفر پر گئے تھے جس کی روداد بھی آپ نے بڑی محبت سے لکھی اور احباب نے اُسے پسند بھی فرمایا۔ سوال ہمارا یہ ہے کہ ہندوستان، پاکستان کی موجودہ ادبی صورت حال کے حوالے سے اس سفر سے پہلے اور بعد آپ کے ذہن میں کس طرح کے تاثرات اور سوالات اُجاگر ہوئے اور آپ کے ذہن میں اُن کا حل کیا ہے؟

☆☆ پاکستان کے سفر کی خوش گوار یادوں کا سحر آج بھی میرے ذہن و دل میں تازہ ہے اور وہاں کے تمام نادیدہ احباب سے ملاقات اور ان کی بے پناہ محبت اور مہمان نوازی کی خوشبو میرے دل پر ہمیشہ نقش رہے گی۔ ہم لوگ زیادہ تر اپنے سرائیکی علاقوں ہی میں رہے اور وہاں جا کر میں نے دیکھا اور جانا کہ وہاں کی کئی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں سرائیکی کی اعلیٰ تعلیم کے وسائل کی فراہمی سے سرائیکی ادیب نہایت معیاری ادب تخلیق کر رہے ہیں جب کہ تقسیم ملک سے قبل یہ سب کچھ نہ کے برابر تھا۔ بے شمار سرائیکی رسالوں کے علاوہ اب وہاں سے تین چار روزانہ سرائیکی اخبار بھی باقاعدگی سے شائع کیے جا رہے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں بھی وہاں کے بہت سے ادیب نہایت انہماک سے کام کر رہے ہیں۔ میری خواہش بھی ہے اور دعا بھی کہ قریب مستقبل میں دونوں ملکوں کے شاعروں اور ادیبوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ کرنے اور تبادلۂ خیالات (interact) کرنے کی سہولیات مہیا کی جائیں اور ان ادباء کی تخلیقات کی دونوں ممالک میں دستیابی کے اسباب فراہم ہوں تاکہ اردو اور سرائیکی زبان و ادب کو فروغ و ارتقاء اور تقویت حاصل ہو اور باہمی رشتوں میں بھی مضبوطی قائم ہو سکے۔ اور اس طرح کا میل جول بھارت میں بھی سرائیکی زبان کے تادیر زندہ و پائندہ رہنے کا وسیلہ اور ضامن بن جائے!

☆ بطور شاعر اور ادیب اردو ادب سے آپ کی کیا توقعات ہیں اور اُن کے پورا ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟

☆☆ میری دلی آرزو ہے کہ ہمارے شاعر اور ادیب ایسا ادب تخلیق کریں جو ہماری زندگی کے قریب ہو اور ہمارے معاشرے کا عکاس ہو اور اس کی اصلاح کے لیے بھی معاون ثابت ہو۔ عصری اور قومی مسائل، معاشی اور اقتصادی مسائل سے صرفِ نظر نہ کرے۔ عالمی امن، خیر سگالی، دوستی، اخوت، ہمدردی اور نیک ہم سائیگی کی تلقین کرے۔

اردو زبان کے بیشتر ادیب اور شاعر جہاں کہیں اور جس ملک میں بھی قیام پذیر ہیں بہت لگن اور محنت سے اپنا تخلیقی سفر طے کر رہے ہیں اپنے امریکا کے قیام کے دوران میں نے دیکھا کہ وہاں کی کئی ریاستوں میں بہت فعّال ادبی تنظیمیں ہیں، خصوصاً نیویارک کا ''ادبی سنگم'' جو پروفیسر مامون ایمن کی قیادت اور رہنمائی اور ڈاکٹر مہتاب سیٹھی کی ان تھک کوششوں سے ہر ماہ ایک خوبصورت محفل سجاتا ہے جو دیر رات تک چلتی ہے اور اس میں پچاسوں شاعر، ادیب اور اہلِ ذوق شامل ہوتے ہیں۔

ہاں ہمارے یہاں کچھ باتیں، میری نظر میں، قدرے حوصلہ شکن ہیں۔ ایک تو آج کل کے مشاعرے میں ایک عجیب سا چلن آ گیا ہے کہ بہت سے معروف شاعر بھی آج کل اپنی اداکاری، گلوکاری یا بازی گری کے بل بوتے پر داد حاصل کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ کوئی تالی بجا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے تو کچھ دوسرے حضرات بار بار حاضرین سے خود کہہ کہہ کر داد وصول کرتے ہیں۔ پیشہ ور شعراء میں گُٹ بندیوں کی وجہ سے بھی مشاعروں کے معیار اور مزاج میں بہت گراوٹ آ گئی ہے۔ سب کچھ کمرشلائز ہو رہا ہے اور ادب دُکانداری بنتا جا رہا ہے۔

دوسرے حالانکہ دونوں ملکوں میں بے شمار اردو رسالے شائع کیے جاتے ہیں لیکن یہاں کے بہت سے مقتدر مجلّے بھی آج اچھا خاصہ پیسہ لے کر گوشے وغیرہ شائع کرنے پر مجبور ہیں۔ الحمدللہ ''چہارسُو'' اس بدعت سے کوسوں دُور ہے اس عمل سے یقیناً ان رسائل کے معیار پر اُنگلیاں اُٹھتی ہیں جو واجب بھی ہیں۔

تیسرے لگ بھگ ہر جگہ پر کچھ نام نہاد نوجوان ادیب ایسے بھی ہیں جو اردو رسم الخط سے ناواقف یا کم واقف ہوتے ہوئے بھی اپنے ناپختہ کلام اور نثر کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ وہ نہ تو محنت کرنا چاہتے ہیں نہ کسی سے کوئی مشورہ یا رہنمائی حاصل کرنے کے متمنی ہیں۔ اخبارات میں کلام شائع ہو جانے پر یا ٹی وی چینلوں سے اپنا کلام پیش کر لینے کو وہ سند مان لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بیشتر اوقات وہ کچھ نام نہاد پیشہ ور مشاہیر کو دختر زر پیش کر کے یا کسی مشاعرے میں مدعو کر کے انہیں اچھا خاصہ معاوضہ دلوا کر اُن سے اپنے حق میں قصیدے بھی لکھوا لیتے ہیں۔ ایسے حضرات اردو زبان و ادب کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں اور ایک غلط اور مضر روِش کا چلن ڈال رہے ہیں۔

بایں ہمہ مجھے یقین ہے کہ اس زبان کے سچے عاشق اپنی لگن اور محنتِ شاقہ سے اردو کے گیسوئے ادب کو سنوارنے اور نکھارنے کی سعی کرتے رہیں گے اور انشاء اللہ ہمارے ان شعراء و ادباء کا یہ قافلہ اسی طرح رواں دواں رہے گا اور بلاشبہ اردو زبان کی شیرینی اسی طرح قائم و دائم رہے گی۔

☆

''حیات وموت کا سلسلہ''

(چاند صاحب کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب)

فاری شا (راولپنڈی)

O

کوئی جتن ، کوئی تدبیر کار گر ہی نہیں
مِری وفاؤں میں شاید کوئی اثر ہی نہیں

حواس گم ہیں ، زباں بند، منتشر افکار
کوئی بھی چیز اب اپنے مقام پر ہی نہیں

کرے بھی کوئی تو اب کس کا اعتبار کرے؟
کسی زبان پہ کوئی حرفِ معتبر ہی نہیں!

مُبالغے، یہ ستائش، یہ کھوکھلی تنقید
پرکھنے والی وہ بے لاگ اب نظر ہی نہیں

کھلے ہیں پھول تو آنگن میں ہر برس کی طرح
بھرا پُرا سا جو لگتا تھا اب وہ گھر ہی نہیں

یہ دل گرفتگی ۔ یہ ہولناک تنہائی
بھرے جہاں میں کوئی میرا ہم سفر ہی نہیں

وہ ساحلوں سے ابھی تک پکارتا ہے مجھے
میں کب کا ڈوب چکا ہوں، اُسے خبر ہی نہیں

حیات و موت کا یہ سلسلہ عجب ہے چاؔند!
کبھی جو ختم بھی ہوگا ، یہ وہ سفر ہی نہیں

O

میں نے کب اپنی وفاؤں کا صلہ مانگا تھا؟
اک تبسم ہی ترا، بہرِ خدا مانگا تھا!

کیا خبر تھی، میری نیندیں ہی اُجڑ جائیں گی
میں نے کھوئے ہوئے خوابوں کا پتا مانگا تھا!

دستِ گلچیں نے بھی گلشن سے وہی پھول چُنا
میں نے جس گُل کے لیے دستِ صبا مانگا تھا!

شدّتِ غم میں دُعا کی تھی تجھے بھولنے کی
اب بھرے زخم تو نادِم ہوں، یہ کیا مانگا تھا؟

بس اِسی بات پہ برہم ہے زمانہ ہم سے
اپنے بدخواہوں کا بھی ہم نے بھلا مانگا تھا

کوئی بھی عرض نہ ہو پائی قبول اُس کے حضور
غالبًا میں نے ہی کچھ حد سے سِوا مانگا تھا!

چُوڑیاں ٹُوٹیں تو زخموں سے لہو رنگ ہوئی
جس ہتھیلی کے لیے رنگِ حنا مانگا تھا

تو نے ہر غم سے نوازا ہے ۔ تیرا خاص کرم
مجھ کو تو یہ بھی نہیں یاد کہ کیا مانگا تھا

ذہن پر چاؔند! پھر اک برق سی لہرانے لگی
میں نے ماضی کے نہاں خانوں سے کیا مانگا تھا؟

○

اک ایک پل ہے میری جان کے لیے آزار
تمہارے ساتھ ہی رخصت ہوئے سکون وقرار

میرے دھڑکتے ہوئے دل کی خیر ہو یارب!
بُلا رہی ہے مجھے پھر وہ نرگسِ بیمار

ترس گئے ترے قدموں کی نرم آہٹ کو
اُداس اُداس ہیں اس گھر کے اب در و دیوار

مہک رہے ہیں جو یہ زخم آرزوؤں کے
انہیں کے دم سے سلامت ہے عاشقی کا وقار

محبتوں سے نوازے گا کوئی کیا مجھ کو؟
کہ میرا سایہ بھی اب مجھ سے ہو چکا بیزار!

وہی جس کو اپنی کہانی سُنا رہا ہوں میں
وہی ہے میری کہانی کا مرکزی کردار!

مِری انا کی عنایت ہے چاند! کتنی گراں!
بھرے جہاں میں کوئی بھی نہیں مِرا غم خوار!

☆

○

کس موڑ پر یہ لائی ہے مجھ کو میری حیات؟
تڑپا رہے ہیں جی کو بکھرتے تعلقات

ہر دل اُداس اُداس ہے - ہر آنکھ اشکبار
کس درجہ سوگوار ہے کُل بزمِ کائنات

لاتی ہے کیا پیام نیا، دیکھئے سَحر!
وحشت سی دل پہ چھائی رہی ہے تمام رات

گو میری دسترس سے نہ تھا دُور وہ گلاب
چھو لینے کو ترستے رہے پھر بھی میرے ہات

کیونکر گلہ کروں تری بیگانگی کا میں؟
مجھ میں ہی اب رہی نہ کوئی دل کشی کی بات!

ہر گام پر ہیں خون کے چھینٹے بچھے ہوئے
اب اور کیا ہے دیکھنے کو؟ اے رہِ حیات!

مایوس نہ ہو زیست کی محرومیوں سے چاند!
حاصل ہوا ہے دہر میں کس چیز کو ثبات؟

☆

○

جذبۂ شوق کو اس طور اُبھارا جائے
ہم جدھر جائیں اُدھر ان کا نظارا جائے

آپسی رشتوں کی خوشبو کو کوئی نام نہ دو
اس تقدّس کو نہ کاغذ پہ اُتارا جائے

سینکڑوں نام ترے اور ہیں بے نام بھی تُو
کون سے نام سے اب تجھ کو پکارا جائے؟

رقص کرتی ہے، لہکتی ہے عجب مستی میں
کشتیٔ دل کو بھنور میں جو اُتارا جائے

میری غیرت کو کسی طور گوارا ہی نہیں
تنگ دستی میں بھی ہاتھ اپنا پسارا جائے

دل کے سوئے ہوئے ارمانوں نے انگڑائی لی
زندگی! آ تجھے شیشے میں اتارا جائے

صبحِ روشن کو تو آنا ہے، وہ آئے گی ضرور
اس بھروسے پہ شبِ غم کو گزارا جائے

آئینہ دیکھ کے ناحق یہ بگڑنا کیسا؟
گرد آئینے پہ ہے۔ اِس کو اُتارا جائے

اپنے پُرکھوں کی عنایات کی تعظیم کرو
یہ ہے وہ قرض جو صدیوں نہ اُتارا جائے

آج کے دور میں واجب ہے یہی چاندؔ! کہ ہم
ساتھ دیں اِس کا، جدِھر وقت کا دھارا جائے

☆

○

مجبوری، لاچاری لِکھ
ہاں، رُوداد ہماری لِکھ

غیروں کو الزام نہ دے
اپنوں کی عیّاری لِکھ

سوچ جو ہلکی ہے تو کیا
غزلیں بھاری بھاری لِکھ

عیب نہ گنوا اوروں کے
اپنی کارگزاری لِکھ

پہلے جھوٹے وعدے کر
پھر اپنی لاچاری لِکھ

چاہے حقیقت کچھ بھی ہو
اپنا پلڑا بھاری لِکھ

مَے خانہ کر اپنے نام
میرے نام خماری لِکھ

اُجڑے گھر کے آنگن میں
ہری بھری پھلواری لِکھ

ہر منصب ہر عہدے پر
اپنے دعوے داری لِکھ

مات پتا کو دے بن واس
خود کو آ گیا کاری لِکھ

چاندؔ کی خصلت میں یارب!
کچھ تو دنیا داری لِکھ

☆

○

(نذرِ داغ)

جہاں کے سامنے اونچا مرا وقار کیا
جو اپنے بندوں میں تُو نے مجھے شمار کِیا

لگا رہا ہوں سر آنکھوں سے اس دیار کی خاک
شعارِ عشق یہیں میں نے اختیار کیا

جھکایا سر نہ کبھی مصلحت کے زیرِ اثر
نہ میں نے دامنِ غیرت کو داغدار کیا

ہر ایک شخص کو ہے دوسروں کے حق کی طلب
چلن یہ کیسا ہے دُنیا نے اختیار کیا؟

تھی پُر فریب بہت آرزوئے نام و نمود
اِسی ہوس نے سبھی کو ذلیل و خوار کیا

ہر اک رنج اُٹھایا رہِ محبت میں
کہ ہم نے آگ کا دریا بھی ہنس کے پار کیا

بُرا ہو وقت تو سایہ بھی دور رہتا ہے
ترے سلوک نے ہم پر یہ آشکار کیا

ہزار بار کیے تُو نے جھوٹے قول و قرار
ہزار بار مگر ، ہم نے اعتبار کیا!

گلہ کِیا تھا تغافل کا چاند! کیوں اس سے؟
اُسی کے اشکوں نے اب تجھ کو شرمسار کیا

☆

○

یہ کیا کہ تُو نے ستم سے بھی ہاتھ کھینچ لیا!
یہی تو ربط تھا ہم میں، سو یہ بھی ختم ہُوا

رفیقِ زندگی اس کا بچھڑ گیا ہوگا!
اُداس بیٹھا ہے پنچھی جو شاخ پر تنہا!

ہر ایک بات میں کچھ مصلحت بھی ہوتی ہے
غلط بھی کیا ہے جو اَب تم نے ساتھ چھوڑ دیا

وہ بُوڑھا پیڑ تھا پُرکھوں کی شفقتوں کا امیں
اُسی کو بیٹوں نے جڑ سے اُکھاڑ پھینک دیا!

پرائی ہو گئیں اب اُس دیار کی گلیاں
گزرتے لمحوں کی آہٹ نے یہ پیام دیا

ترس رہا ہوں میں پھر سے تری توجّہ کو
بہت عزیز ہے مجھ کو یہ خواہشِ بے جا

رہی نہ رشتوں میں پھر وہ خلوص کی گرمی
جو ایک بار کسی پَر سے اعتبار اُٹھا

چٹک رہی ہے سر اپنا پھر ایک ننھّی کلی
چُرا کے لے گیا خوشبو جو من چلا بھنورا

وہ رُوبرُو تھا مرے، یُوں تو چاند! تا بہ سَحر
تمام رات مگر اُس کا انتظار رہا!

☆

○

ہمارے شہرِ ادب میں چلی ہوا کیا ہے
یہ کیسا دَور ہے یارب! ہمیں ہُوا کیا ہے؟

اُسی نے آگ لگائی ہے ساری بستی میں
وہی یہ پوچھ رہا ہے کہ ماجرا کیا ہے؟

یہ تیرا ظرف کہ تُو پھر بھی بدگماں نہ ہوا
سوائے درد کے میں نے تجھے دیا کیا ہے؟

لپک کے چھین لے حق اپنا کم سوادوں سے
بڑھا کے ہاتھ اُٹھا جام۔ دیکھتا کیا ہے؟

بُھلا دیا ہے جو تم نے تو کوئی بات نہیں
مگر مَیں جانتا! آخر مِری خطا کیا ہے؟

عجیب شخص ہے، کردار مانگتا ہے مِرا
سوائے اِس کے مِرے پاس اب بچا کیا ہے؟

کُرید کر میرے زخموں کو، یوں سوال نہ کر
تجھے خبر ہے تو پھر مجھ سے پوچھتا کیا ہے؟

متاعِ غم کو بچا رکھ، چھپا کے سینے میں
تو اِس خزانے کو اوروں میں بانٹتا کیا ہے!

ہزار نعمتیں اُس نے تجھے عطا کی ہیں
اب اور چاندؔ! تو اُس در سے مانگتا کیا ہے؟

☆

○

طریقِ عشق میں برباد ہونا پڑتا ہے
گُلوں کی چاہ میں کانٹوں پہ سونا پڑتا ہے

بس ایک لمحۂ راز و نیاز کی خاطر
بشر کو مدتوں چھُپ چھُپ کے رونا پڑتا ہے

ضمیر بیچ کے منصب تو مل ہی جائے گا
وقار پہلے مگر اِس میں کھونا پڑتا ہے

ہے بدلحاظ یہ دُنیا۔ کوئی کہاں جائے؟
قدم قدم پہ یہاں خوار ہونا پڑتا ہے

یہ فاقہ کش کہ جنہیں حیف! خودفریبی میں
شکم کی سیری کو پانی بلونا پڑتا ہے

معاشرے کا ہو ناسُور یا بدن کا گھاؤ ہو
علاج کے لیے نشتر چبھونا پڑتا ہے

پسارے ہاتھ تو پھرتے ہو مال و زر کے لیے
بالآخر اِن سے مگر ہاتھ دھونا پڑتا ہے

پرائے درد میں ہوتا نہیں شریک کوئی
غموں کے بوجھ کو خود آپ ڈھونا پڑتا ہے

یہ سچ ہے چاندؔ! شگفتہ غزل جو کہنی ہو
قلم کو خونِ جگر میں ڈبونا پڑتا ہے

☆

''عشق کی تقدیر''

ڈاکٹر شباب للت
(شملہ، بھارت)

متبسم لب، گھنے کالے بال، بڑی بڑی نکتہ رس آنکھیں، گول مٹول چہرے پر لمبوتری اونچی ناک، پنجابی نین نقش، صبیح رخسار ایسے کہ دیکھ کر کشمیری سیبوں کی یاد آئے۔کلین شیو، وجیہہ چہرے اور قابلِ رشک صحت والے مہندر پرتاپ چاند کورو کھشیتر یونیورسٹی لائبریری میں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں۔ عام زندگی میں وہ ایک نہایت شریف النفس، پرخلوص اور ملنسار انسان ہیں۔ جسمانی خوبصورتی اور جامہ زیبی کے باعث بھی،لیکن زیادہ اپنے باطنی کھرے پن، خلوص، رکھ رکھاؤ مروّت اور مشرقی سلیقہ مندی کے باعث وہ بیگانوں کو بھی اپنا بنا لیتے ہیں۔اور سُرعت کے ساتھ دوستی کے رشتے استوار کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ یہی خلوص، نفاست، سلیقہ وضعداری اور طرحداری ان کے کلام کی رگوں میں موجزن ہیں۔ یہی کارن ہے کہ ان کے یہاں نہ تو روایت سے بغاوت ہے اور نہ جدیدیت کی طلسمی بھول بھلیاں، نہ ترقی پسندوں کی سی گھن گرج اور نہ بعض جدیدیت پسندوں کے سے ابہامی اور خوابناک تجربے۔ نہ کوئی سیاسی، ادبی یا نظریاتی نعرے بازی، نہ الفاظ کی لچھے بازی، نہ کسی طرح کی جھلاہٹ اور جارحیت۔ ان کی شاعری عام فہم جذبات و احساسات کی عکاسی ہے۔شعور کی پختگی، اسلوب کی دل آویزی، لہجے کی متانت اور ٹھہراؤ کی بدولت چاند کی فکر ایک ایسے شانت دریا کا روپ دھارن کئے ہوئے ہے جس کے پرشور دھارے اپنی رفتار اور روانی میں دونوں طرف کے کناروں کو منہدم کرتے ہوئے نہیں گزرتے بلکہ جو بڑی گمبھیرتا اور یکسانیت کے ساتھ بہہ رہا ہے۔

چاند کا انداز بیان منجھا ہوا ہے اور لہجہ تربیت یافتہ۔ ان کی خوش فکری اور خوش نظری کو فنی پختگی نے شرابِ دوآتشہ بنا دیا ہے طبعی اور فکری جدت پسندی کے باوجود فن کی صالح روایات کا اثر ان پر بہت گہرا ہے۔ برسوں تک علامہ قیس جالندھری کے دامانِ تلمذ سے وابستہ رہنے کے باعث وہ شاعری میں جوش سکول کے رنگ سہی، لیکن اُن کی ملنسار شخصیت اور ہمہ آمیز سو بھاؤ نے انہیں کسی خاص نظریۂ فکر کسی خاص ادبی تحریک یا گروپ کا پابستۂ زنجیر نہیں بننے دیا۔ وہ اپنی فطری ذہانت اور علمی استعداد کے بل بوتے پر آگے بڑھے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کا بات کہنے کا اپنا ڈھنگ اور اپنی زبان ہے۔ اُن کی شاعری میں گہرا تفکر اور فلسفہ بھلے ہی نہ ہو لیکن فکر وفن کی پختگی، جذبے اور احساس کی وارفتگی اور الفاظ کی سحر کاری نمایاں ہے جو رنگینی اور برنائی اُن کے مزاج کا خاصہ ہے وہی ان کے کلام میں پر تو فگن ہے لیکن ایک گونہ پختگی کے ساتھ ان کا انداز ایک فطری شاعر کا سا ہے اور تجربات سیدھے سادہ اور غیر پیچیدہ۔ تحت الشعور سے اُبھرنے والی چلستیانی کیفیتیں اور ابہامی نازک خیالیاں ان کے ہاں کہیں دکھائی نہیں دیتیں اور ان کے محسوسات کو سمجھنے کے لیے قاری کو ذہنی ورزش کے کرب کا ہدف نہیں بننا پڑتا۔

''حرف راز'' مہندر پرتاپ چاند کا اولین شعری مجموعہ ہے یوں وہ تقریباً بیس برسوں سے مشق سخن کر رہے ہیں یہاں مجھے اپنا ایک پرانا شعر بے اختیار یاد آ گیا ہے:

ملتا ہے مدتوں کے عمل سے کوئی مقام — لعل و گہر ازل سے تو لعل و گہر نہ تھے

گزشتہ بیس برسوں میں چاند نے خوب محنت کی ہے۔ادب میں تمام لوگ ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔ نہ صرف ایک دوسرے کے تجربات اور اسلوبِ بیان سے بلکہ بزرگوں اور سینئر ہم عصروں کی صحبت کا بھی ہر شاعر کی ذہنی نشو ونما پر خاصا اثر پڑتا ہے۔ شاعر نہ صرف اپنے پیش رووں سے اثر قبول کرتا ہے بلکہ اپنے ہم عصروں اور پیچھے آنے والے خوش فکر اہلِ قلم سے بھی۔ ذہنی تربیت ایک دوطرفہ عمل ہے جانے انجانے ہم کچھ سیکھتے ہیں کچھ سکھاتے ہیں۔ چاند کے طبّاع ذہن نے بھی متقدمین سے کافی اثر قبول کیا ہے اور اپنی ملنساری اور دوست نوازی کی بدولت بزرگوں اور ہم عصروں کی برکت مآب اور رنگین صحبتیں بھی انہیں اکثر میسر آئی ہیں۔ باہر سے قبول کئے ہوئے اثرات کے باوصف شاعر کا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہی ہے جو اس کی تخلیقی قوتوں کو جلا بخشتا اور اُس کی فنی صلاحیتوں کو آگے بڑھاتا ہے کیونکہ زندگی متلوّن مزاج ہے اور شاعر کی تخلیقات بھی ایک مسلسل تغیر کی نشان دہی کرتی ہیں۔ عہد بہ عہد، لحہ بہ لحہ، انسانی تہذیب کے بدلنے والے پیکر، انسان کے ذریعہ جھیلی اور بھوگی جانے والی تکالیف اور مسّرتیں، آرزوئیں اور اُمنگیں شاعر سے متقاضی ہوتی ہیں کہ وہ اُن کی طرف خود سے دیکھے، ان پر فکر کرے اور انہیں سمجھے، ان جذبات واحساسات کا آبشار رواں دواں ہے ایک مرکز پر ٹھہرتا نہیں۔ ان مناظر اور نازک احساسات کا مشاہدہ اور ترجمانی ہر فنکار اپنے تجربے اور فطری ذہانت کے مطابق کرتا ہے۔ چاند کی شاعری بھی روایات سے اثر پذیر ہونے کے باوصف اُس کے ذاتی تجربات اور زخموں کی دین ہے لیکن اپنے باطنی تاثر کے ساتھ خارجی محاسن سے بھی مالا مال ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا ہے۔ غزل ایک بڑی سخت جاں صنف ہے اور اس کا دامن بہت وسیع ہے۔ اس نے ہمیشہ وقت اور زمانے کا ساتھ دیا ہے۔ اس میں لہجے کا تنوع عام ہے۔ ہر طرح کے جذبات وخیالات کی عکاسی کے لیے صنف غزل بہترین ذریعہ اظہار ثابت ہوئی ہے۔ غزل ایک ایسی سیال شے ہے جسے ہر ذہنی سانچے کے مطابق نئی اور منفرد شکل میں ڈھلنا آتا ہے اور یہ ہر لہجے کے مخصوص پیکر میں خود کو ظاہر کرتی ہے۔ چاند کی غزلوں میں بھی موضوعات کی گونا گونی غمِ ذات اور غمِ کائنات کا

کرب، انسانی زندگی کی معصوم خوشیوں اور کلفتوں کی لذت و اذیت کا بلا کم وکاست بیان اور حالاتِ حاضرہ پرلطیف چوٹیں زبان وبیان کی تمام تر رنگینی اور پختگی کے ساتھ موجود ہیں۔ تجرباتِ ذات کی کسک، حالات گردوپیش کا بھرپور مشاہدہ اور عشق ومحبت کے پاکیزہ جذبات وکیفیات کا اظہار وبیان اس فنکارانہ چابکدستی سے کیا گیا ہے کہ شعر کا رشتہ دل سے برابر قائم رہا ہے، دماغ سے نہیں اور تلخ سے تلخ حقائق کے بیان میں بھی شعریت وغنائیت اور بیان کی رنگینی وشیرینی کہیں مجروح ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ چاند کی کچھ غزلیات کے مطالعے اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں۔ کیا سادگی اور پُرکاری ہے ان میں:

رنج وغم سے جو ہمکنار ہوئی زندگی اور پُر وقار ہوئی
جس پہ تیرا کرم نہیں ہوتا وہ بشر محترم نہیں ہوتا
کوئی اُمید تھی نہ کوئی یاس تم جو آئے تو جاگ اٹھا احساس

دیکھنے میں تو یہ مطالعے بڑے ہلکے پھلکے سلیس اور سادہ معلوم ہوتے ہیں لیکن معنوی اعتبار سے کس قدر بلند اور پاکیزہ ہیں اور روانی، بے ساختگی اور موضوع کے سادہ وعام فہم ٹریٹمنٹ کے باعث یہ قاری کے دل کو چھو لیتے ہیں۔

پیار ایک عالمگیر جذبہ ہے۔ اور کم وبیش ہر شاعر نے اپنے اپنے ڈھنگ سے عشق ومحبت کے جذبات پر قلم اٹھایا ہے۔ چاند نے اپنی پاکیزہ بیانی سے اس جذبے کو ایک تقدیس اور طہارت بخش دی ہے، مثلاً اُن کے یہ اشعار:

تُو نے روپ اپنا بھی دیکھا کبھی آئینے میں؟ عشق بدنام تو ہر جرم کا حامل ہی سہی

بس اُس نگاہ ناز کے اُٹھنے کی دیر تھی ہر سمت ایک نور بکھرتا چلا گیا
غم کی لطیف آنچ جو بڑھتی چلی گئی حُسنِ شعور اور نکھرتا چلا گیا
اے جستجوئے حُسنِ ازل تیری آڑ میں اپنی تلاش آپ میں کرتا چلا گیا

یاد آتی ہے جب وہ پہلی نظر بے پئے ہی سرور آتا ہے

روٹھی ہوئی ہیں جب سے وہ میگسار آنکھیں بے کیف ہو گیا ہے میخانہ زندگی کا

جس کو تیری نظر نے چوم لیا وہ کلی حاصلِ بہار ہوئی

حُسن وعشق کی نفسیات پر کیا طنز کیا ہے۔ بالخصوص آج کل کے مادہ پرست زمانے کی محبت پر جو باتوں باتوں میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی ہے۔ لیکن وفا، ایثار اور خلوص جس سے غائب ہے:

کس کی شکایت؟ کس سے کیجیے؟ حُسن بھی جھُوٹا، عشق بھی جھوٹا

اپنی جانِ تماں سے اگر کہیں بھُولے سے کوئی شکوہ بھی کیا ہے تو وہ بھی اس سرسری انداز اور شانِ بے نیازی سے کہ عشق کی عالی ظرفی اور استغنا پر حرف نہ آئے۔ مثلاً یوں کہ:

دل میں اب کچھ بھی نہیں داغ تمنا کے سوا
اپنی قسمت میں یہ اُجڑی ہوئی محفل ہی سہی

مٹنے کی نہیں حسن ومحبت کی یہ رسمیں
پابند جفا آپ ہیں پابند وفا ہم

ترا خیال غم مستقل سہی لیکن
ترے خیال سے غافل رہا نہیں جاتا

زندگی کے چہرے پر غم کی جو سیاہی ہے
کتنے مہرباں ہو تم اس کی یہ گواہی ہے

یہ بھی کیا کم ہے جو ہم تیری تمنا میں ہیں گم
لطفِ منزل نہ سہی، حسرت منزل ہی سہی

دربارِ حسن میں شکوہ کرتے ہوئے بھی حسن کی عظمت وطہارت پر ذرا بھی آنچ نہیں آنے دی بلکہ اپنی محرومی وناکامی کے الزام سے حسن کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے کیا جواز پیش کیا ہے۔

ازل سے عشق کی تقدیر میں ہے محرومی وہ میرے سامنے آئے جو کامیاب ہوا

کہا جاتا ہے کہ دنیا کا پہلا شاعر اُس وقت پیدا ہوا جب انسان کے اندر پہلی مرتبہ انسان کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ نازک الفاظ اور پُرتاثیر استعاروں کا استعمال، قافیہ پیمائی، لے اور آہنگ، شعر میں وزن اور بحر کی موزونیت، غرضیکہ تمام شعری لوازمات ہمدردی کے اعلیٰ انسانی جذبے ہی کو تحریک دینے اور خوراک مہیا کرنے کے لیے وجود میں لائے گئے۔ چاند نے بھی غزل کے اشعار میں انسانی ہمدردی، خدمت، وفا اور ایثار کے راگ الاپے ہیں۔ اور اس جذبے کو آسمانی بلندیاں عطا کی ہیں: ذیل میں کچھ اشعار دیکھئے:

جس نے اپنے دامن میں بھر لیا غم انساں منزلِ محبت کا وہ عظیم راہی ہے
قابل پرستش ہیں وہ عظیم لوگ اے چاند جو پرائے غم کو بھی اپنا غم سمجھتے ہیں
ہندو نظر آیا نہ مسلماں نظر آیا ہر مرد وفا خُو مجھے انساں نظر آیا
دین کے پردے میں کیا کیا نہ قیامت ٹوٹی کُفر ابھی باقی ہے الحاد ابھی باقی ہے

انسانوں کو کردار وعمل کی اعلیٰ اقدار اور ہمت کا درس دینے میں چاند پیچھے نہیں رہے۔ ان کا عقیدہ ہے:

ساحل کی تمنا کوئی ساحل تو نہیں ہے بے جہد کی تقدیر میں منزل تو نہیں ہے
میدانِ عمل ہے یہ سن اے کاہل وکم کوش دنیا طرب وعیش کی محفل تو نہیں ہے
نکتہ چیں تو ہزار ملتے ہیں کاش! مل جائے کوئی نکتہ شناس

شاعر سماج کے ایک ذمہ دار کارکن کی حیثیت سے حالاتِ حاضرہ

سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا حساس دل اپنے گردوپیش میں ہونے والی زیادتیوں، بے انصافیوں اور چیرہ دستیوں کو دیکھ سُن کر چیخ اٹھتا ہے۔ ادب کا کام دراصل صرف زندگی کی عکاسی کرنا ہی نہیں بلکہ اس میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا بھی ہے۔ عصری زندگی کا تجزیہ اور اس کے منفی و مثبت عناصر کی نشان دہی کر کے، مجموعی نتائج اخذ کرنا اور اگر ضرورت پڑے تو کوئی پیغام یا لائحہ عمل پیش کرنا بھی شاعر کی ذمہ داری ہے یہ فنکار کی ذاتی صلاحیتوں پر منحصر ہے کہ وہ حالات کا کس طرح جائزہ لیتا ہے اور اس سے کیا نتائج اخذ کرتا ہے۔ چاندؔ نے اپنی غزلوں میں گردوپیش کے حالات پر کس انداز سے تبصرہ کیا ہے کچھ ان اشعار میں دیکھئے:

اُس چشمِ مَے فروش کی دریا دلی نہ پوچھ — اک بوند بھی شراب ہمارے لیے نہیں
سُرخی بہار میں یہ ہمارے لہُو سے ہے — لیکن کوئی گلاب ہمارے لیے نہیں

آج کا دور خودغرض منافع خوروں کی جانب سے عوام کے بیدردانہ استحصال کا دور ہے۔ اور ہر شخص یہاں ایک خاموش تماشائی نظر آتا ہے۔ عوام نے بے شمار مصائب جھیل کر اور قربانیاں دے کر آزادی حاصل کی لیکن اب قلت، گرانی، بیکاری اور فاقہ مستی کے مہیب سائے عوام کا مقدر بن کر رہ گئے ہیں۔ اس مفہوم کو استعاروں کی نازک زبان میں چاندؔ نے کس خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا ہے:

ہم سے زرداروں نے گِن گِن کے لیے ہیں بدلے
اور کچھ حسرتِ بیداد ابھی باقی ہے؟

چھڑکتا ہے نمک وہ جان ہم جس پر چھڑکتے ہیں
ہمارے زخم ہائے دل کا درماں یوں بھی ہوتا ہے

اور پھر اس دورِ بے یقینی میں جب ہر فرد کی وفاداری اور دیانت داری مشکوک ہے اور شاعر کو بھی اس افراتفری اور نفسانفسی کی دھند میں کچھ سجھائی نہیں دیتا تو یہ کہنا پڑتا ہے:

کیا ٹھانی ہے رہبر نے یہ کیا جانیے اے چاندؔ
ہر گام پہ ڈرتا ہوں یہ قاتل تو نہیں ہے

انسانی زندگی کے غم و خوشی اور انسانی نفسیات کے تجزیے میں بھی شاعر کا اپنا ہی زاویہ نگاہ ہوتا ہے۔ چاندؔ نے انسانی نفسیات کے مشاہدے سے کیا کیا طرفہ نتائج اخذ کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں

سنتے تھے ہر کوئی ہے بے زار زندگی سے
دیکھا تو ہر کوئی ہے دیوانہ زندگی کا

فانی زندگی سے جینے والوں کا پیار ایک ناقابلِ تردید سچائی ہے۔
کچھ اور اشعار دیکھئے:

بھیگی نہیں پلکیں بھی کبھی شدتِ غم سے
بے وجہ کبھی آنکھ سے برسات ہوئی ہے

پھولوں کی نزاکت بھی گراں گزری ہے سو بار
کانٹوں میں بھی اکثر بسر اوقات ہوئی ہے

اُس نظر کو بھی کچھ قرار نہیں — گاہ شعلہ ہے گاہ شبنم ہے
زیست سے جب ہوگئے بیزار ہم — موت بھی کچھ بے مروّت ہوگئی

چاندؔ کی غزلیات میں صرف سنجیدہ حقائق کی دھوپ ہی نہیں بلکہ رندی و مستی اور طنز و شوخی کے فرحت بخش سائے بھی جا بجا ملتے ہیں۔ کہیں کہیں تو انہوں نے اس بے ساختگی سے لطیف چوٹیں کی ہیں کہ ان کی ستم ظریفی پر کھل کر ایک آدھ قہقہہ لگانے کو جی کرتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

اگر زندگی بھر نہ پی شیخ نے — تو پھر کون سادہ خدا ہو گیا؟

مریضِ غم نے جب مایوس ہو کر جان ہی دے دی
وہ فرمانے لگے کچھ ہو کے حیراں "یوں بھی ہوتا ہے"؟

کیوں پشیماں سے ہو جفاؤں پر؟ — اس تکلّف کی کیا ضرورت ہے؟
جنابِ شیخ دریا نوش نکلے — انہیں سمجھے تھے اب تک پارسا ہم

یہ تو تھی چاندؔ کی غزل کی سادگی و پُرکاری لیکن اردو شاعری صرف غزل ہی تک محدود نہیں رہی۔ چاند کے زیرِ نظر مجموعہ "حرفِ راز" میں کچھ اچھی نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ نظمیں اگرچہ زیادہ تر موضوعاتی نظمیں ہیں اور بیشتر نظموں میں موضوع و مواد کے اعتبار سے وطن دوستی کا جذبہ ساری و طاری نظر آتا ہے۔ لیکن یہ جذبہ دراصل تمام بنی نوع انسان کا مشترک ورثہ ہے۔ شاعرانہ خلوص اور دیانت داری اور شعری افادیت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ملکی تعمیر و ترقی، قومی فلاح اور انسانی تہذیب کے ارتقاء کے لیے شاعر کسی حد تک اپنا ذہنی اور قلبی سرمایہ وقف کرے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی شاعری خلوص اور دیانت داری پر مبنی شاعری ہے۔ بشرطیکہ اُس میں جارحیت کی جھلک نہ ہو۔ جارحانہ حب الوطنی اکثر کسی دوسرے ملک سے نفرت اور تعصب پر اساس پذیر ہوتی ہے اور کسی بھی حالت میں یہ جائز اور قابلِ تحسین نہیں گردانی جا سکتی۔

چاندؔ اگرچہ اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو تقسیمِ وطن سے پہلے ہوش سنبھال چکی تھی اور جس نے تقسیمِ وطن کے خون خرابے کو عینی شاہد کی حیثیت سے دیکھا ہے لیکن ان تلخیوں کو فراموش اور نظرانداز کر کے چاندؔ نے آزادی کی فضا کا بے تعصبی سے مشاہدہ کیا ہے۔ اُسے اپنے وطن کی رنگا رنگ تہذیب اور ثقافتی سرمائے پر ناز ہے۔ یہاں کی بوقلموں رنگینیوں کا حسین مناظر، یہاں کے موسم آب و ہوا، کوہساروں، سیرگاہوں، بنوں جنگلوں، ندیوں اور تاریخی و تہذیبی مراکز سے اُسے والہانہ محبت ہے۔ کبھی کشمیر کی چاندنی اور برفانی مناظر کی فرحت اُسے تحریکِ نغمہ دیتی ہے اور کبھی ہریانہ کے بن اُپون، تیرتھ استھان اور تاریخی

قصبے اُسے اس درجہ لبھاتے ہیں کہ وہ اُن کی رنگینی اور عظمت کے ترانے گانے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔

وطن کی محبت اور تعمیر و فلاح کے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہوئے چاند نے حالی اور آزاد کی نیچرل شاعری کی روایات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور اقبال، چکبست، درگا سہائے سرور، تلوک چند محروم، علامہ کیفی، جوش ملیح آبادی، نظر سوہانوی، مولانا حسرت موہانی اور نازش پرتاپ گڑھی کے فکری رویے کی تقلید کی ہے۔ مثلاً ان کی نظم "مرا محبوب ہریانہ" کے یہ بند ملاحظہ ہوں:

ممکن نہیں ہریانہ کی عظمت کا جواب　　حکمت کا صداقت کا شرافت کا جواب
ممتاز ہیں فوجوں میں یہاں کے یودھا　　ممکن ہی نہیں اس کی شجاعت کا جواب

ہریانہ کو ہم اور سنواریں گے ابھی　　رُوپ اور بھی کچھ اس کا نکھاریں گے ابھی
اس دھرتی سے کرتے تھے حسد جو اے چاند　　وہ لوگ اسے سجدے گذاریں گے ابھی

ہندوستانی سپاہی کے اعلیٰ کردار اور آدرش کے متعلق ان کی ایک نظم "معیار" کا آخری بند دیکھئے

جو ہے باطل شکن، حق آشنا ہے　　قیامِ امن جس کا مدّعا ہے
جسے پاسِ روایات وفا ہے　　وہی اعلیٰ سپاہی ہند کا ہے
وہی ہے ہند کا اعلیٰ سپاہی

تعمیر و ترقی سے متعلق اُن کی دوسری کئی نظموں مثلاً "ساتھی ہاتھ بڑھانا" اے مرے وطن وغیرہ میں وطنِ عزیز کی جدوجہد ترقی میں شاعر پوری سرگرمی سے خود شریک نظر آتا ہے۔ وہ خود کو اس دیس کی عوامی زندگی کے دھارے اور سماجی و اقتصادی انقلاب کی عظیم جدوجہد سے الگ تھلگ نہیں سمجھتا۔

چاند کی رومانی نظموں میں ان کا سانیٹ "یادِ ماضی" قاری کو متاثر کرتا ہے، آخری اشعار دیکھئے:

خدایا جب مجھے آخر یونہی برباد کرنا تھا
تو بہتر تھا مرے احساس پر بجلی گرا دیتا
مجھے بے آرزو، بے مدّعا، بے حس بنا دیتا
کرم کے بعد اگر ایسا ستم ایجاد کرنا تھا
تڑپتی ہیں شکستہ آرزوئیں مدفن دل میں
سُلگتی ہیں دبی چنگاریاں ویران محفل میں

حصہ نظم کی ورق گردانی کرتے ہوئے چاند کی ایک طویل رومانی نظم "تجدید وفا" قاری کا دامنِ دل تھام لیتی ہے۔ اس میں جذبے اور احساس کی وارفتگی بھی ہے اور اُن نازک حسّی تجربات اور لمحاتی کیفیات کا فنکارانہ اور پُر اثر بیان بھی جسے اُن کی ذات نے خود بھوگا ہے۔ بند ملاحظہ ہو۔

حاصلِ راہِ طلب ذلّت و رسوائی ہے
پیار اک خواب پریشاں کے سوا کچھ بھی نہیں
تیری نظروں نے جہاں پھول بچھائے تھے کبھی
اب وہاں خار مغیلاں کے سوا کچھ بھی نہیں

میں یہی سوچ کے اس رہ سے پلٹ آیا ہوں
پھر وہی میں ہوں، وہی غم، وہی تنہائی ہے

☆

- بقیہ -

"رحمت کا دروازہ"

مسلک افکار کا پس منظر بھی واضح کر سکتے ہیں، کرتے ہیں۔ مثلاً "چاند صاحب صدق وصفا پر جان چھڑکتے ہیں، اُنہیں دعا پر بھروسہ ہے، وہ اپنی خانہ ویرانی کا ماتم کر چکے، وہ مولا کی رضا پر راضی ہیں، وہ تخیّلات کے پنچھی اڑاتے ہیں، وہ حُملوں کے شہ ٹھکراتے ہیں تو انہیں ویرانے یاد آنے کا احتمال ہوتا ہے، وہ جانتے ہیں کہ حُسن کی آنکھ اشک بار ہونے پر عشق کی روح بے قرار ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک رہینِ وفا ہونا وجہ فخر ہے، انہیں معلوم ہے کہ دل کی سلامتی سے صنم خانے سلامت ہیں، وہ بتوں کے قدموں میں سَر نہیں جھکاتے کہ ان کا سر بُت کدوں کا کلس ہے"۔۔ وغیرہ وغیرہ

بہ الفاظ دیگر چاند صاحب کا اسلوب تجزیہ نگاری کا ایک جاذب نظر مظہر ہے جس کے نقوش سماج کی دگرگوں حالت کی وجوہ اور محرکات گناتے ہیں۔ ان پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور اپنی بساط، بضاعت اور استطاعت بروئے کار لاتے ہوئے، تمنّاؤں اور دعاؤں کے ساتھ صلاح و فلاح کا پیام دیتے ہیں۔

چاند صاحب کے لیے ناچیز کی یہ رباعی حاضر ہے

احساس کی تصویر سجا رکھّی ہے
جذبات کی تقدیر بنا رکھّی ہے
کیا بات ہے، اے چاند! کہ ہندی ہو کر
اردو سی زباں دِل سے لگا رکھّی ہے

○

''دامن مرے خیال کا''

سید حسن عباس گوپال پوری

(بہار، بھارت)

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اردو شاعری فارسی کے مقلّد ہے خاص کر اردو غزل کا سلسلہ نسب فارسی سے ہوتا ہوا عربی تک جا پہنچتا ہے۔حافظ شمس السدین احمد منیری نے بڑی خوبصورتی سے اسکی وضاحت اس طرح کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اس کی (اردو شاعری) زمین صحرائے عرب اور وادئ نجد ہے، اس کے پہاڑ کوہِ بے ستون اور کوہ قاف ہیں، اس کے دریا جیحون وفرات ہیں، اس کے آسمان پر ایرانی ابر بہار کا قبضہ ہے، اس کے مکانات طاق کسریٰ اور قصر شیریں ہیں، اس کے عشّاق قیس وفرہاد ہیں، اس کے معشوق لیلیٰ وشیریں ہیں، اس کے جنگجو رستم و اسفندیار ہیں''۔

ایسا لگتا ہے کہ اُردو شاعری کا اپنا کچھ بھی نہیں، سب پر فارسیت کا قبضہ ہے۔شاعری ہمارے ادب کا ایک امتیازی سرمایہ ہے اور ہماری شاعری کا بنیادی اور اساسی سرمایہ غزل ہے اس طرح غزل کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے غزل کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد ہی اردو کا شاعر پہلی بار قصرِ شاعری میں داخل ہوتا ہے گویا غزل فصیلِ شاعری بھی ہے اور بابِ شاعری بھی۔غزل ہی وہ روایت ہے جس کے بل پر کسی بھی قسم کی شاعری کی جا سکتی ہے غزل میں ہمہ گیری اور جذباتی اثرات موجزن رہتے ہیں جس کی وجہ سے ہر شخص اس کا شیدائی وفدائی ہوجاتا ہے۔بقول شخصے:

''اس سے محفلوں میں گرمی، زندگی میں سوز وساز، دلوں میں ولولے اور اُمنگیں، زندگی برتنے کا طریقہ، محفل کا درس، مجلس کی زندگی کا انداز معلوم ہوجاتا ہے اس لیے یہ رِندوں سے لے کر صوفیوں تک، مردوں سے لے کر عورتوں تک، لڑکوں سے لے کر بوُڑھوں تک، بلاقید مذہب وملّت ہندوستان کے طول وعرض میں مقبول ہوگئی ہے''

ایجاز واختصار کے ساتھ رمزیت وایمائیت اس کا طرۂ امتیاز ہے غزل کی مقبولیت کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی جدید غزل میں یوُں رقمطراز ہیں:

''غزل کے مقبول ہونے کے بہت سے اسباب ہیں ایک تو یہی کہ غزل آسانی سے کہہ لی جاتی ہے اور اسی آسانی سے اس کے کہنے اور اس پر سر دُھننے والے ہر جگہ مل جاتے ہیں جو ذرا بھی موزوں طبع ہو غزل کہہ لے گا۔حسن ومحبت کی باتوں اور گھاتوں سے سبھی آشنا ہوتے ہیں خواتین اور خدا جہاں ہوں گے اور کہاں نہیں ہیں، وہاں غزل خواں بھی موجود ہوگا''

''دوسرا سبب اس کی مقبولیت کا یہ ہے کہ غزل کے پیانے میں جو صہبا ہوتی ہے وہ درآتشہ سہہ آتشہ ہوتی ہے جہاں آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلنے لگتا ہے''۔

''تیسری بات غزل کی وہی آرائش خم کاکل اور ہمارے آپ کے اندیشہ ہائے دُور دراز کا قصہ۔۔۔''

''چوتھی بات غزل کا انداز ہے جو دل ہی میں نہیں اُتر جاتا بلکہ حافظہ پر بھی نقش ہوجاتا ہے، بہترین شعر ایک طور پر وہ ہے جو ضرب المثل بن جائے سہل ممتنع بھی اسی کا ایک پہلو ہے کسی شاعر کے مقبول ہونے کی ایک کسوٹی یہ بھی ہے کہ اس کے کتنے اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں مسلمہ تجربات اور مسلمہ حقائق کو ایک یا دو مصرعوں میں اس طرح سمو دینا کہ زبان، ذوق وذہن قریب قریب سبھی کی سیرابی ہوجائے، معمولی کام نہیں''

مذکورہ بالا اقتباس میں غزل کی خوبی اور خوبصورتی کے علاوہ ان تمام جزئیات کا احاطہ بھی کر لیا گیا ہے جن کا تعلق غزل گوئی سے ہوتا ہے پھر بھی اس کے مقبولیت کے اسباب جن میں زبان وبیان، اسلوب ولوا، فصاحت وبلاغت، برجستگی وبے ساختگی، شعور کی اُپج، جذبے کی شدت اور خلوص، احساس کی جدّت، سوز وگداز اور بازاری تذکروں سے احتراز کے ساتھ سوقیت ورکاکت سے احتیاط وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مہندر پرتاپ چاند نے کلاسیکی سرمایۂ شاعری سے استفادہ کرتے ہوئے حال واستقبال کے تقاضوں کے پیش نظر اپنی شاعری کو جدید رنگ وآہنگ سے ہمکنار کیا ہے۔اب ایسے شعراء کا کال سا ہے جو قدیم شعری روایات اور صالح اقدار حیات کو توسیع وتبلیغ، مقصد شاعری سمجھتے ہیں اس لحاظ سے چاند کی شاعری قابلِ قدر اور لائق مطالعہ ہے۔

مہندر پرتاپ چاند کا وطن مالوف قصبہ کروڑلعل عیسن ضلع مظفرگڑھ (حال پاکستان) ہے لیکن اب انہوں نے ہندوستان کو اپنا ملک اور وطن بنالیا ہے اور مستقل طور پر پنجاب میں مقیم ہوگئے ہیں۔بچپن ہی سے شعر وشاعری کا شوق رہا اس شوق نے انہیں بہت جلد اساتذہ کے کلام کے علاوہ ہم عصر قدآور شعراء سے تعلقات استوار کرادیا اور وہ بہت جلد شعری رعایتوں کو سمجھنے کے قابل ہوگئے لیکن ان کی شاعری کو سنوارنے اور نکھارنے میں سب سے بڑا ہاتھ امر چند قیس جالندھری کا ہے۔قیس صاحب اُردو کے ان شعرا میں صفِ اول میں شمار کیے جاتے ہیں جنہوں نے تقریباً تمام اصناف میں نئے تجربے اور مشاہدے کو سمونے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ چاند کی شاعری میں ان کے استاد قیس جالندھری کی سی پُر گوئی اور خوب گوئی کی اچھی مثالیں مل جاتی ہیں۔آیئے! چاند کے پہلے مجموعہ کلام ''حرفِ راز'' کی روشنی میں ان کی شاعرانہ قدوقامت کو

دیکھا جائے۔اس مجموعہ کی پہلی غزل سے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

زندہ رہی اسی سے محبت کی آبرو
دم عظمتِ وفا کا جو بھرتا چلا گیا
بس اس نگاہِ ناز کے اُٹھنے کی دیر تھی
ہر سمت ایک نُور بکھرتا چلا گیا
جتنا وہ میرے دل میں اُترتے چلے گئے
اُتنا میں ان کے دل سے اُترتا چلا گیا
غم کی لطیف آنچ جو بڑھتی چلی گئی
حسنِ شعور اور نکھرتا چلا گیا
اے چاند! ان کی یاد جو آتی چلی گئی
دامن مرے خیال کا بھرتا چلا گیا

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں چاند نے روایتی شاعری سے ان نمونوں کو اخذ کیا ہے جن کی اہمیت ہر دور میں تقریباً یکساں دیکھنے میں آتی ہے۔حسن وعشق کے جذبات جو پہلے تھے وہ آج بھی ہیں۔ ہاں! اس جذبے کے اظہار میں یقیناً کچھ تنوع پیدا ہو گیا ہے۔مذکورہ غزل میں چاند نے دلی جذبات واحساسات کو جس سلیس اور سادہ وشگفتہ پیرایۂ بیان دیا ہے وہ ان کی شاعرانہ صلاحیت کا غماز ہے۔

حسن وعشق ایک عام گیر جذبہ ہے جسے ہر چھوٹے بڑے شاعر نے اپنی وسعتِ فکر ونظر کے مطابق شاعرانہ لب ولہجہ عطا کیا ہے جس میں تخیل کی رنگ آمیزی اوّلیت رکھتی ہے۔بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں:

''حُسن وعشق غزل میں زندگی کی تمثیل بن جاتے ہیں اور شاعر ان کے ذریعہ رموزِ حیات کو بے نقاب کرتا ہے حُسن سے بڑھ کر تخیل کو چھیڑنے اور اکسانے والی کوئی دوسری چیز نہیں''۔

چاند کے نزدیک حُسن وعشق کے جذبات بے حد اہمیت رکھتے ہیں:

زندگی عشق سے عبارت ہے
زندگی عشق کی امانت ہے
لطف بھی، قہر بھی، تغافل بھی
تیرا ہر ناز خوبصورت ہے

نہ پوچھ جوشِ تجلی کا عالم اے ہمدم!
کسے تھا ہوش جو وہ حسن بے نقاب ہوا

خیر مانا تجھ کو میرے عشق نے رسوا کیا
کون پُوچھے تجھ سے تیرے حُسن نے کیا کیا کیا

حُسن وعشق کے یہ جذبات جب شدّت اختیار کر لیتے ہیں اور محبت کے جذبے سے سرشار دل معشوق کی بے وفائیوں سے ٹوٹ جاتا ہے تو بے اختیار کہہ اُٹھتے ہیں:

کس کی شکایت کس سے کیجیے
حُسن بھی جُھوٹا عشق بھی جھوٹا

لب ولہجے کی مایوسی ''ٹوٹے ہوئے دل کی آواز'' بن جاتی ہے۔ اور جب اس آواز کی بازگشت دیر تک اُنہیں مضمحل کرنے میں کامیاب ہونے لگتی ہے تو اچانک چاند سنبھل جاتے ہیں۔ایسے عالم میں کوئی بھی شخص یا تو بے حد قنوطی ہو جایا کرتا ہے یا رجائیت کا لباس پہن لیتا ہے۔اور یہی کچھ چاند نے بھی محسوس کیا:

رنج وغم سے جو ہمکنار ہوئی
زندگی اور پُر وقار ہوئی

تجربے اور فکر کے ساتھ اسلوب ادا کی سادگی قابل غور ہے۔اسی فکری صلابت نے اُنہیں صحیح راستے کی نشاندہی بھی کی جس پر اُنہیں فخر ہے اور یہ جذبہ قابلِ قدر بھی ہے:

ہم سے زندہ ہیں زمانے میں وفا کی رسمیں
یہ حقیقت بھی جو باطل ہے تو باطل ہی سہی

یہ بھی کیا کم ہے جو ہم تیری تمنا میں ہیں گُم
لطفِ منزل نہ سہی حسرتِ منزل ہی سہی

ہم ہیں پابندِ وفا شکوہ جفا کا کیسا
فطرتاً تو ستم وجور پہ مائل ہی سہی

چاند نے جس تجربے کو شعری جامہ عطا کیا ہے اسمیں بڑی سچائی معنویت اور ہمہ گیری ہے ساتھ ہی ایک خاص قسم کی اثر انگیزی بھی۔محبوب کا تصورِ حسن جس کے لیے روایتی طرز اپنایا گیا ہے مگر لہجے کی شائستگی اور متانت کا خاص خیال بھی رکھا ہے۔

رُخِ جمیل سے اُن کے نقاب اُٹھتے ہی
زمیں پہ ایک نئے چاند کا ظہور ہُوا

اکثر معشوق کو۔۔۔بے وفا، سخت دل، سنگدل، ستمگر اور اس سے ملتے جلتے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے مگر چاند نے کچھ اور ہی رخ اپنایا ہے ان کے خیال میں یہ ضروری ہے کہ محبوب کی کج ادائیاں جان لیوا ہوتی ہیں مگر اسے عاشق کی جان زار کا افسوس بھی کچھ کم نہیں ہوتا:

وہ جان لے کے ٹلا یہ بجا سہی لیکن
ملال اس کو مری موت کا ضرور ہوا

محبوب کو ساتویں آسمان پر پہنچانے والے شعراء اور ماہتاب و آفتاب کو خیرہ کرنے والے اس کے حُسن کی تعریف بے جا نے اسے ''مغرور'' بنا

دیا ہے اس میں قصور کس کا ہے؟ اس جانب چاندؔ نے اس طرح اشارہ کیا ہے:

ہم اس کے ناز اُٹھاتے گئے جو ہنس ہنس کر
اسے کچھ اور بھی کچھ اور بھی غرور ہوا

لفظ ''ہم'' کا استعمال انہوں نے ''شاعر برادری'' کی لاج رکھنے کے لیے ہی کیا ہے اور سب کو اس ''فردِ جرم'' میں شامل بھی کر لیا ہے۔ طنز کا لطیف احساس بھی ان کی غزلوں میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

زندگی کے چہرے پر غم کی جو سیاہی ہے
کتنے مہرباں ہو تم اس کی یہ گواہی ہے
دولتِ محبت تھی تم پہ جو لُٹا بیٹھے
اب تو ہم فقیروں کے پاس بس دُعا ہی ہے

آئینہ اہلِ معائب کو دکھانے والو!
اس میں تصویر تمہاری بھی نظر آتی ہے

غزل کی جملہ صفات میں اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے اشعار میں خودی انانیت کے اظہار کے ساتھ شاعر کی انفرادیت برقرار رہے۔ ورنہ انفرادیت گم ہو جانے کا خدشہ ہر وقت بنا رہتا ہے۔ ایسے شعراء کی شناخت ایک مشکل امر بن جاتی ہے۔ چاندؔ نے اپنی تمام شاعری میں اس خیال کو اوّلیت دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مختلف النوع مکتبہ فکر سے خیالات و موضوعات کی خوشہ چینی کے باوجود ان کی شاعرانہ انفرادیت گم نہیں ہو سکی ہے۔ یہاں شباب للتؔ کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں جو چاندؔ کی انفرادیت کی شناخت میں معاون ہیں:

''ان کے (چاندؔ) یہاں نہ تو روایت سے بغاوت ہے نہ ہی جدیدیت کی طلسمی بھُول بھلیاں، نہ ترقی پسندوں کی سی بے جا گھن گرج اور نہ بعض جدیدیت پسندوں کے سے ابہامی اور خوابناک تجربے۔۔۔ نہ کوئی سیاسی، ادبی یا نظریاتی نعرے بازی، نہ الفاظ کی لچھے بازی، نہ کسی طرح کی جھلاّہٹ اور جارحیت''

چاندؔ کے یہاں روایتی شاعری کے بہترین نمونے موجود ہیں جس میں سیدھے سادے خیال، مؤثر جذبات اور عام فہم الفاظ کے ساتھ سہل تراکیب کا استعمال ہے اشعار کی خارجی اور ظاہری خوبیاں بھی کبھی کبھی باطنی اور داخلی خوبیوں سے زیادہ ہماری توجہ اپنی جانب منعطف کر لیتی ہیں جن میں محاروں کا استعمال رعایت لفظی، سنگلاخ زمینوں سے احتراز، الفاظ کی تراش خراش اور ان کا استعمال وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ ساری چیزیں چاندؔ کی شاعری میں بھی اسی طرح دیکھنے میں آتی ہیں جیسی کہ امر چند قیسؔ جالندھری کی شاعری میں۔ ان سب سے ہٹ کر سادگی، نرمی، برجستگی، اور نرم و گرم اور رسیلے الفاظ کا استعمال خوب ہے غزلوں میں مرکزی خیال وہی محبوب یا معشوق سے لگاوٹ ہے جو اساتذہ کو بھی بے چین کیے رہتا تھا چاندؔ بھی اس لگاوٹ پر ریجھے ہوئے نظر آتے ہیں مگر ان کی نوعیت کچھ بدلی ہوئی سی ہے ان کا یہ انداز ایک انوکھے انداز تفکر کے امکانات کا پتہ دیتا ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

ناشاد سہی پھر بھی ہیں راضی بہ رضا ہم
ڈھونڈھیں گے نہ آزارِ محبت کی دوا ہم
مٹنے کی نہیں حسن و محبت کی یہ رسمیں
پابندِ جفا آپ ہیں پابندِ وفا ہم
یہ حُسن طلب شانِ کرم کے نہیں شایاں
چاہیں گے نہ ایثارِ محبت کا صلا ہم

لیکن چاندؔ کی شاعری صرف حسن و عشق، گل و بلبل اور شاد و ناشاد کی شاعری نہیں بلکہ ان کے یہاں دعوتِ فکر اور درسِ عمل کے بہترین نمونے بھی ملتے ہیں انہوں نے اپنی شاعری سے جہاں پژمردہ دلوں میں رنگینی اور جلوہ آرائی پیدا کی ہے وہیں مفلوج ذہنوں اور مجروح دلوں کو درسِ عمل کی تلقین بھی کی ہے۔ یہ اثر ان کو علامہ اقبال اور مولانا حالیؔ سے قریب کرتا ہے مگر اسے پختگی عطا کرنے میں بھی ان کے استاد حضرت قیسؔ جالندھری کا ہاتھ ہے:

میدانِ عمل ہے یہ سُن اے کاہل و کم ہوش
دنیا طرب و عیش کی محفل تو نہیں ہے

ہم سے زرداروں نے گن گن کے لیے ہیں بدلے
اور کچھ حسرتِ بیدار ابھی باقی ہے

دین کے پردے میں کیا کیا نہ قیامت ٹوٹی
کُفر ابھی باقی ہے، الحاد ابھی باقی ہے

انسان دوستی، شرافت نفسی، فقیر منشی کے جذبات سے سرشار چاندؔ تعصب اور تنگ نظری سے دُور، انسانیت کی تبلیغ اور حقانیت کی علمبرداری کرتے نظر آتے ہیں:

ہندو نظر آیا نہ مسلماں نظر آیا
ہر مرد و فاخو، مجھے انساں نظر آیا

دُکھ سے اوروں کے جو پگھلتا نہیں
دل وہ پتھر سے کم نہیں ہوتا

چاندؔ کی بعض غزلوں میں گرمیِ حسن و عشق کا والہانہ انداز اور شوخ و شنگ لہجے میں مستی و رندی بھی بے پناہ ملتی ہے۔ سرور و مستی میں طنز کی آمیزش نے کچھ اور رنگ تیز کر دیا ہے:

اگر زندگی بھر نہ پی شیخ نے
تو پھر کون سا وہ خُدا ہو گیا

شوخی میں خلوص دل ملاحظہ ہو:

رشکِ حق پرستی ہے اپنی مے پرستی بھی
نقشِ پائے ساقی کو ہم حرم سمجھتے ہیں
شغلِ میکشی میں ہو کیوں تکلف بے جا
اپنی اوک ہی کو ہم ، جامِ جم سمجھتے ہیں

اساتذہ کا کلام اکثر و بیشتر نئے شعراء کے لیے مشعل راہ کا کام دیتا ہے یہ اس کے مطالعے سے اپنے انداز و تفکر میں جلا پیدا کرتے ہیں اور نئی راہیں نکالنے کی کاوش بھی کرتے ہیں۔ اکثر شعراء اساتذہ کے کلام سے استفادہ کرتے ہیں انہی خیال اور موضوع کو اپنے لب و لہجہ میں اس طرح ادا کرتے ہیں کہ قدامت و جدّت کے حسین امتزاج سے ایک نیا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثلاً چاؔند نے غالبؔ کے اس شعر

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

سے اس طرح استفادہ کیا ہے:

یہ ہماری بھول تھی اس شوخ سے
ہم جو اُمیدِ وفا کرتے ہیں

یا غالبؔ ہی کے اس شعر سے کہ

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

چاؔند کی کوشش دیکھئے:

عشق پر کوئی بس نہیں چلتا
دل جب آتا ہے آ ہی جاتا ہے

حفیظ جالندھری کا شعر ہے

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لئے ہوئے دامِ وفا کو میں

چاؔند نے کہا ہے:

دشمنِ دل و جاں ہیں دوستوں کی سب گھاتیں
دوست پروری کا ہم سب بھرم سمجھتے ہیں

چاؔند نے اپنی شاعری میں روزمرہ اور ضرب الامثال کا استعمال بھی بخوبی کیا ہے جس سے ان کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ درج ذیل غزل میں سادگی و سلاست کے ساتھ شگفتگی و شادابی کے دوش بدوش ایسے مصرع بھی مل جاتے ہیں جو زبان زدِ خاص و عام بن گئے ہیں۔

یُوں دل کو تیرے ہجر میں بہلا رہا ہوں میں
غم کھا رہا ہوں اشک پئے جا رہا ہوں میں
سینے میں درد، دل میں خلش، آنکھ میں سرشک
یارب یہ کس خطا کی سزا پا رہا ہوں میں

کوئی تو ہے گناہ جو مجھ سے خفا ہیں وہ
کچھ تو خطا ہوئی ہے جو پچھتا رہا ہوں میں

اور یہ شعر

کیوں پشیماں سے ہو جفاؤں پر
''اس تکلف کی کیا ضرورت ہے''

مکالمے کا انداز بھی چاؔند کی غزلوں کی ایک اہم خوبی ہے۔ یہ انداز میرؔ پرستی اور غالبؔ نوازی کے علاوہ استاد قیسؔ جالندھری کی صحبت کا واضح اثر ہے اس مجموعہ میں ایک پوری غزل مکالماتی انداز کی بھی شامل ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

ستم یہ کیا دل محزوں پہ ڈھار ہے ہو تم
کہ بار بار جو اَب یاد آرہے ہو تم
طریقِ عشق ہے پہلے ہی کون سا ہموار؟
قدم قدم پہ جو کانٹے بچھا رہے ہو تم
خیال و خواب و نظر میں سما رہے ہو تم
مری حیات کی وسعت پہ چھا رہے ہو تم

بہ حیثیت غزل گو مہندر پرتاپ چاند دورِ جدید میں پرانی اقدار حیات کے علمبردار ہیں ان کے یہاں میرؔ کا سا سوز و گداز، غالبؔ کی سی فکر، اقبالؔ کا سا پیغام، آزادؔ اور حالؔی کی سی حقیقت نگاری، اکبرؔ کی سی شوخی اور تہداری کے ساتھ قیسؔ جالندھری کی سی بے باکی نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قدر خوبیوں کا حامل اس دور میں کوئی کم ہی ہوگا۔

غزل کے ساتھ ساتھ چاؔند نے نظم نگاری کی طرف بھی توجہ کی ہے جن پر چند ماسبق شعرائے اردو کے طرزِ فکر کی چھاپ نمایاں ہے۔ شباب للت کے لفظوں میں:

''چاؔند نے حالؔی اور آزادؔ کی نیچرل شاعری کی روایات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اقبالؔ، چکبستؔ، درگا سہائے سرورؔ، تلوک چند محرومؔ، علامہ کیفیؔ، جوشؔ ملیح آبادی، نظرؔ سوہانوی، مولانا حسرتؔ موہانی اور نازشؔ پرتاپ گڑھی کے فکری رویے کی تقلید کی ہے''

چاؔند کی نظموں میں ''میرا محبوب ہریانہ''، ''ساتھی ہاتھ بڑھانا''، ''اے میرے وطن''، ''تجدیدِ وفا''، ''ہمارے عزائم''، ''مال اور معیار'' عمدہ اور لائق مطالعہ نظمیں ہیں۔ ان میں اکثر وطنی شاعری کی توسیع کی اچھی مثالیں ہیں۔ قومی یک جہتی اور انسان دوستی کے جذبے سے سرشار شاعر نے نئے نئے عزائم سے تعمیرِ وطن کے جو خواب دیکھے ہیں ان کی تعبیریں اکثر نظموں میں مل جاتی ہیں۔ نظم ''ساتھی ہاتھ بڑھانا'' امداد باہمی کی اہمیت اور اشتراک کی قوت کی وضاحت کرتی ہے حالانکہ اگر اس کا عنوان ''امدادِ باہمی'' ہی ہوتا تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔

نظم ''اے میرے وطن'' کے تحت شاعر نے پوری سرگرمی کے ساتھ

ملک کی فلاح و بہبود کے منصوبے پیش کیے ہیں ۔ وطنیت کا یہ جذبہ اقبآل اور چکبست وسرور کی نظموں کی یادتازہ کردیتا ہے۔

نظم ''مال'' فانی دنیا پرایک جامع تبصرہ ہے۔نظم ''تجدیدوفا'' چاند کی ایک رومانی نظم ہے جو ایک خط کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں جذبۂ احساس کا حسین بہاؤنظم کومؤثر اوردل کش بنادیتا ہے۔اس نظم کا اسلوب فیض کی نظموں کو یاد کرادیتا ہے رومانی نظم ہونے کے باوجود ضبط وتوازن کی کوشش بھی لائقِ ستائش ہے اعتدال سے گزرنا چاند نے سیکھا ہی نہیں۔نموعناً کچھ بند ملاحظہ فرمائیں:

اب وہ دن رات کہاں جب ترے عارض کی جھلک
میرے خوابوں میں کئی رنگ بھرا کرتی تھی
تیرے انفاس کی خوشبو تری زلفوں کی مہک
میری سانسوں کے لیے وقف رہا کرتی تھی

رقص فرماتی تھیں گلشن میں بہاریں ہر دم
آرزوؤں کے کنول کھِل کے نہ مرجھاتے تھے
کتنے پُرکیف تھے لمحے وہ ملاقاتوں کے
جن میں ہم پیار کی سوگند کو دہراتے تھے

ہاں مگر منزلِ الفت میں جو اک موڑ آیا
راستے اپنی محبت کے جدا ہوتے رہے
غیرت عشق کا سودا مجھے منظور نہ تھا
سیم و زرقاتل تقدیس وفا ہو کے رہے

تجھ کو تو لاگیا دولت کی ترازو میں اُدھر
کشتیِ زیست کا رُخ میں نے ادھر موڑ لیا
عالم یاس میں پھر ڈوب گئی میری حیات
دل کی خوں گشتہ تمناؤں نے دم توڑ دیا

حاصل راہ طلب ذلت و رسوائی ہے
پیار اک خواب پریشاں کے سوا کچھ بھی نہیں
تیری نظروں نے جہاں پھُول بچھائے تھے کبھی
آج ان راہوں میں کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں

میں یہی سوچ کے اس رَہ سے پلٹ آیا ہوں
پھر وہی میں ہوں وہی غم، وہی تنہائی ہے
اور یہ دل میں جو کچھ زخم ہیں پھر تازہ سے
میں نے کچھ تازہ خطاؤں کی سزا پائی ہے

پوری نظم یاس وحرماں نصیبی کی فضا آفرینی میں ڈوبی ہوئی ایک محزوں ومجروح دل کی فریاد بن گئی ہے۔

اس مجموعے میں نظموں کے شانہ بشانہ ایک سانیٹ بھی ملتا ہے یہ صنف بھی دیگر اصناف کی طرح مغرب سے مستعار لی گئی ہے۔ یہ اگر چہ اطالوی صنف ہے مگر انگریزی میں پہلے پہل WYATT نے اسے پیش کیا اردو میں اس پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جس کی یہ مستحق تھی۔ چند گنے چنے شعراء نے کبھی باضابطہ اور کبھی بے ضابطہ طور پر کچھ سانیٹ لکھے ہیں۔ اس کی بھی اپنی کچھ شرائط ہیں، اوزان وبحور کا التزام بھی رکھا جاتا ہے انگریزی میں شیکسپیئر اور ملٹن کے سانیٹ مقبول عام اور شہرت دوام رکھتے ہیں۔شیکسپیئر نے اس میں مناسب تراش خراش بھی کی اور اسے عام فہم بنانے کی کوشش بھی۔ جس کی بدولت دوسرے شعراء بہت جلد اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اردو میں اختر شیرانی، م۔ن۔ راشد، احمد ندیم قاسمی، عزیز تمنائی، اختر ہوشیار پوری، طفیل ہوشیار پوری، تابش صدیقی، شائق وراثی، غفور انیس اور امر چند قیس جالندھری نے باضابطہ طور پر سانیٹ لکھے ہیں اکثر کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اردو نثر میں ڈاکٹر حنیف کیفی نے اس پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔چاند کا سانیٹ ''یادِ ماضی'' ملاحظہ فرمائیں۔

مجھے پھر آج وہ گزرے زمانے یاد آتے ہیں
مرے دل میں خلوصِ عشق کی جب شمع جلتی تھی
نشاط وکیف کے سانچے میں جب ہر سانس ڈھلتی تھی
مسرت کے وہی رنگیں فسانے یاد آتے ہیں
اچانک پھر ہوا بے رُخ ہوئی دورِ خزاں آیا
بہاریں لُٹ گئیں دل کی کلی مرجھا گئی یک سر
تمناؤں کی دنیا پر اداسی چھا گئی یک سر
کچھ ایسا قہر لے کر انقلاب آسماں آیا
خدایا جب مجھے آخر یوں ہی برباد کرنا تھا
تو بہتر تھا مرے احساس پر بجلی گرا دیتا
مجھے بے آرزو، بے مدعا، بے حِس بنا دیتا
کرم کے بعد اگر ایسا ستم ایجاد کرنا تھا
تڑپتی ہیں شکستہ آرزوئیں مدفن دِل میں
سلگتی ہیں دبی چنگاریاں ویران محفل میں

اس طرح بہ حیثیت مجموعی مہندر پرتاپ چاند کی شاعری میں قدامت وجدت کے حسین امتزاج کے ساتھ نئے تجربات اور امکانات کا عکس بالکل واضح ہے۔ وارداتِ قلبی کی ترجمانی کے ساتھ حالات حاضرہ پر ان کے تبصرے بڑے معنی خیز اور دلچسپ ہیں۔عصری حسیّت کی دھنک پُورے اُفق شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔ اس سے ان کے مطالعات ومشاہدات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے مختلف موضوعات کے شاعرانہ اظہار پر اُنہیں مکمل قدرت حاصل ہے الفاظ وتراکیب کا برمحل استعمال، روزمرہ وضرب المثل اور تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی بخوبی کیا ہے حسن وعشق کے بیان میں گداختگی، شگفتگی اور خلوص سے کام لیا ہے۔

''اشکوں کا قہقہہ''

مترنکودری
(نکودر، بھارت)

جناب مہندر پرتاپ چاندؔ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ سرزمین ہریانہ کے ایک ذہین اور ممتاز شاعر ہیں جو کم وبیش نصف صدی سے اردو میں شعر کہہ رہے ہیں اب تک ان کے چار شعری مجموعے ''اجڑے راز،۱۹۷۴ء''، ''زخم آرزوؤں کے (دیونا گری رسم الخط میں) ۱۹۸۲ء''، ''حرفِ آشنا،۱۹۹۰ء'' اور ''آزارِ غمِ عشق،۲۰۰۱ء'' میں شائع ہوکر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی اردو کی نصابی کتاب صوبۂ ہریانہ کے اسکولوں کی ساتویں جماعت کے نصاب میں ۱۹۸۶ء سے رائج ہے۔ پھر انہوں نے ہریانہ اردو اکادمی کے ایما پر حالی پانی پتی کی غزلوں کا انتخاب کیا ہے جسے ان کے تحریر کردہ تعارف کے ساتھ اکادمی نے ۱۹۸۹ء میں دیونا گری رسم الخط میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے استاد محترم کی وفات کے بعد ان کی ایک نہایت قابل قدر مثنوی ''لاوہ'' کو مرتب کر کے ۱۹۹۸ء میں شائع کروایا۔ اس معرکہ خیز مثنوی میں علامہ قیس جالندھری (مرحوم) نے ست گورو شمیشجی کے اعلیٰ کردار اوران کے چند نمایاں کارناموں کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

چاند صاحب کا تازہ شعری مجموعہ ''آزارِ غمِ عشق'' اس وقت میرے پیشِ نظر ہے۔ کتاب کے شروع میں چند مقتدر اہلِ قلم حضرات نے چاند صاحب کی شاعری کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ اس مجموعہ کو انہوں نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے تین حصوں میں ان کے پہلے تینوں شعری مجموعوں میں سے انتخاب شامل ہے۔ چوتھے باب میں ان کا تازہ کلام ہے اور پانچویں اور آخری باب میں ان کے جواں سال بیٹے 'وویک'' کی مرگِ ناگہاں کے بعد کا کلام ہے جسے انہوں نے گوشہ وویک کا نام دیا ہے۔ اردو شاعری میں چاند صاحب کی ایک منفرد حیثیت ہے۔ آج وہ اردو کے صفحہ اول کے شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ انہیں نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں جذباتی اور رومانی تصور کے ساتھ ساتھ سماجی اور عمرانی شعور بھی ملتا ہے۔ زبان وبیان پر بھر پور قدرت اور پھر ان کا سلیقے سے استعمال اپنے ہم عصروں سے ممتاز بناتا ہے۔

ان کی بیشتر نظموں اور غزلوں میں غور وفکر کی ایک لہر رواں دواں نظر آتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی انسانی زاویہ نظر سے کی ہے۔ چاند کے احساس کی شدت اور جذبہ کے خلوص نے ان کی شاعری کو بلندی بخش دی ہے۔ زندگی کے بنیادی مسائل کی ترجمانی کا احساس اور رجحان بھی ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔

چاندؔ کی غزل پر روایت کے اثرات ضرور ہیں لیکن انہوں نے روایتی انداز میں غزلیں نہیں کہی ہیں یا یوں کہیے کہ اردو غزل کی روایت میں ان کی آواز کافی حد تک نئی اور اچھوتی ہے۔ ان کے یہاں نئے حالات اور نئے حقائق کا شعور ہے اور اس صورت حال نے ان کی غزل کو ایک نئی لے سے آشنا کیا ہے۔ چاندؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کے جذباتی اور ذہنی تجربات اسی صنف غزل کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔

رنج وغم سے جو ہم کنار ہوئی
زندگی اور باوقار ہوئی
جس کو تیری نظر نے چوم لیا
وہ کلی حاصل بہار ہوئی
چاندؔ ہر جرم آرزو کے بعد
روح احساس سوگوار ہوئی

ان اشعار میں موضوع اور فن دونوں اعتبار سے ایک جدت نظر آتی ہے اور اس تصویر کشی میں محسوساتی اور حسیاتی رنگ بہت گہرا ہے۔ ان کی غزلوں میں چاندؔ کی اپنی شخصیت پوری طرح بے نقاب ہے۔ ان کے مختلف اشعار چاند کے مشاہدات وتجربات، ان کی ذہنی واردات اور جذباتی کیفیت کی تصویریں ہیں اور یہ تصویریں انسانوں کے دکھ سکھ، اس کی مسرتوں اور محرومیوں کو اجاگر کرتی ہیں اور انسانی زندگی کی ایک بامعنی تفسیر پیش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف احساس اور جذبہ ہی ان سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ تخیل میں بھی تحریک پیدا ہوتی ہے اور شعور بھی حرکت میں آتا ہے۔ ان کی غزلوں میں تنوع اور رنگا رنگی، وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ غرض چاندؔ کی غزلیں خاصی پہلودار ہیں۔

ہم سے زندہ ہیں زمانے میں وفا کی رسمیں
یہ حقیقت بھی جو باطل ہے تو باطل ہی سہی

سکون نواز تھا کتنا غمِ محبت بھی
کہ ڈھونڈتی ہے جسے آج ہر خوشی میری

چاند کی اس ہمہ گیر اور پہلو دار شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ ان کا اظہار اور ابلاغ ہے۔ وہ محسوسات کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر بڑی چابکدستی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا موضوع اور مواد صورت اور ہیت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

اردو شاعری کے تاریخی دور کا مطالعہ کر جایئے تو یہ بات صاف

ظاہر ہو جائے گی کہ ہر شاعر منفرد ہوتا ہے۔ قدرت کی ودیعت اس میں چند ایک حقیقتیں رکھ دیتی ہے اور وہی نالہ موزوں یا نغمہ جوش انگیز کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ چاندؔ بھی شاعر ہیں اور محض شاعر۔ ان کے کلام میں پیغام کی تلاش فضول ہے۔ وہ نہ پیمبر ہیں نہ واعظ نہ خطیب اور نہ ہی انہیں اس بات کا دعویٰ ہے۔ وہ شعر کہتے ہیں اپنے لئے، اوروں کے لیے اور بس۔ عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی ان میں موجود ہے۔ ان کے یہاں مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ ان میں تجربے کا خلوص اور مشاہدے کی صداقت ہے۔

کس کی شکایت کس سے کیجیے؟؟
حسن بھی جھوٹا عشق بھی جھوٹا!!

خامشی ہی نے کہہ دیا ہے سب کچھ
اوڑھ کر دل کی دھڑکن کا لباس

نا اہلیت اپنی کہ جو رسوائے جہاں تھی
حیرت ہے وہی آج کا سب سے بڑا فن ہے!

پتھر کے سوا چاندؔ یہاں کچھ نہ ملے گا
بیٹھا ہے سجائے ہوئے شیشوں کا تو گھر
کیوں؟

بیتی رُت کب لوٹ کے آئی کب آشا کے پھول کھلے؟؟
چاندؔ ہمیں معلوم ہے پھر بھی آس لگائے بیٹھے ہیں

رچ گیا اے چاند! خوشبوؤں میں جب اس کا وجود
میرے آنگن میں معطر چاندنی آنے لگی

چاندؔ کی غزل میں یہ حصے فطری اعتبار سے کتنے خیال انگیز اور جمالیاتی لحاظ سے کس درجہ دل آویز ہیں۔ انہوں نے زندگی کی بعض بنیادی حقیقتوں کو پیش کیا ہے لیکن ان میں جو نغمگی اور غنائی کیفیت ہے اس نے جمالیاتی اظہار کو بھی چار چاند لگا دئے ہیں۔

طویل فنی ریاضت نے ان کے فن کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں بات کہنے کے سلیقے کے ساتھ ساتھ بات کی پرکھ کا گر بھی آتا ہے یہی وجہ ہے کہ نسبتاً کم کہنے کے باوجود وہ اپنے بیشتر معاصرین کے مقابلے میں زیادہ بہتر شعر کہہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند کے فن میں اتنی پختگی، ان کے لہجے میں اتنی مٹھاس اور لذت اور ان کے اسلوب میں اتنی تازگی ہے کہ ان کی شاعری اپنے اظہار کی داخلی توانائی کے بل پر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔

چھن گئی جب زندگی سے درد کی میراث بھی
چاندؔ! مجھ کو اپنی محرومی کا اندازہ ہوا

لبوں پہ حرفِ وفا ہے دلوں میں بیر مگر
کہوں میں کیا اسے یاروں کی اِک ادا کے سوا؟
ستم تو یہ ہے کہ تو بھی مجھے سمجھ نہ سکا
تمام عمر تیرا نفس رہا ہوں میں!

ان اشعار میں ہلکی کاٹ اور نرم لب ولہجہ چاند کی شخصیت کا ایک حصہ ہے۔ میں چاند کو ان شاعروں میں شمار کرتا ہوں جو گزشتہ چالیس برس میں شعرا کی بیکراں بھیڑ کے باوجود اپنے لہجے کی شناخت بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ چاند اگرچہ سیدھی سادی اور سامنے کی باتیں کرتے ہیں لیکن احساس کی شدت اور ان کی ذہنی اور قلبی واردات ہونے کے باعث ان کی شاعری دوسروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جذبات نگاری اس میں ضرور ہے لیکن اس کا جذباتیت کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں۔ اسی لئے اس میں متوازن انداز کا احساس ملتا ہے اور ایک بڑی ہی سنبھلی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے۔

الفاظ پر چاند بڑی قدرت رکھتے ہیں اور ان کے استعمال میں انہوں نے بڑی فنی سلیقہ شعاری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ اشعار دیکھئے۔

ہر گام پہ ہے طوفانِ بلا صحرائے محبت میں برپا
پاتے ہیں مرادیں دل کی مگر جو خاک یہاں کی چھانتے ہیں

تم کیا جانو؟ کیوں جیون سے ہم اکتائے بیٹھے ہیں؟
کومل من کو اک کومل سا روگ لگائے بیٹھے ہیں

آزارِ غمِ عشق بڑی چیز ہے یارو!
کم ظرف ہو جو اس کی دوا ڈھونڈ رہے ہو

کس کو راس آئی دیارِ حسن کی آب وہوا؟
اس نگر سے کب کوئی سر کو بچا کر لے گیا؟

تری نظر کے اجالوں کی جستجو ہے مجھے
جنم جنم سے اندھیروں میں بس رہا ہوں میں

یہ شرط محبت میں اوّل بھی ہے آخر بھی
تسلیم کی خو رکھنا ...... پابند وفا ہونا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ چاند کے نزدیک محبت کے جذبے

کی کتنی وقعت ہے۔

اردو غزل کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے جس کی تعمیر و تشکیل میں ان روایات کا بڑا حصہ ایسا ہے جس پر ہماری شاعری کی بنیادیں کھڑی ہیں۔ ان روایات میں عظمت ہے۔ انسان کی طبیعت کو ان سے ایک جذباتی مناسبت ہے۔ روایت کا صحیح احساس ہی تو جدت کے لیے راستے پیدا کرتا ہے۔ چاند روایت کا کامل شعور رکھتے ہیں لیکن انہوں نے روایت کو جذب کر کے اپنا ایک نیا آہنگ اور نیا لب و لہجہ پیدا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک رچا ہوا نیا انداز نظر آتا ہے۔ زبان و بیان کے استعمال میں بھی ایک رچا ہوا انداز روایت کے صحیح احساس ہی کے سہارے پیدا ہوتا ہے۔

دوستو! شاید ہمیں آداب سے واقف نہیں
آپ کے آداب سے ہم کو یہ اندازہ ہوا

ہم تو اپنی خانہ ویرانی کا ماتم کر چکے
دیکھ جا کر اب تو کوئی اور دوازہ ہوا!!

اشعار کی تخلیق میں جلتا ہے جگر کیوں؟
یارب! مجھے بخشا ہے یہ جاں سوز ہنر کیوں؟

ان اشعار میں شعریت کا کیسا رچا ہوا انداز ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں رنگینی پیدا کرنے کے لیے تشبیہوں اور استعاروں سے کام نہیں لیا ان کے ہاں شعریت مختلف عناصر سے تشکیل پاتی ہے۔ اظہار کے لیے زبان کے جادو کا انہیں احساس ہے۔ وہ اندازِ بیان کے تاثر سے بھی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان سب سے کام لیتے ہیں اور ان سب سے مل کر ان کی غزلوں کا شاعرانہ انداز وجود میں آتا ہے۔ اور وہ شعریت پیدا ہوتی ہے جو ان کی غزلوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس شعریت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ موضوع سے مناسبت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ چاند کی شخصیت کا عکس اس میں صاف نظر آتا ہے۔

صنفِ غزل پر عموماً ریزہ خیالی کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن یہ الزام صحیح نہیں۔ دراصل ریزہ خیالی ہی میں اس صنف کا حسن ہے اور اسی میں معنی کی ایک دنیا آباد ہے۔ شاعر کی ذات کو مقید اور محصور نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ وہ ہر مظہر سے وابستہ بھی ہو جاتی ہے اور اس سے اپنے آپ کو الگ بھی کر لیتی ہے اور اس طرح ایک جلوۂ صد رنگ کی حامل بن جاتی ہے۔ شاعر اپنی ذات یا خودی کا مالک بھی ہوتا ہے اور اس سے بے نیاز اور بے پرواہ بھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نفس یا نکتہ نظر جامد اور سکونی نہیں ہوتا بلکہ اپنے اندر انتہائی لچک، سبک روی اور اثر و نفوذ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ ہر نقشِ حیات پر نظر ڈالتا ہے اور گذر جاتا ہے۔ وہ مظاہرِ کائنات اور انسانی علائق کی کائنات سے اس حد تک وابستہ نہیں ہوتا کہ ہمہ تن اس کا اسیر ہو جائے۔

غزل کی طرح چاند کی نظمیں بھی بے حد جان دار ہیں۔ وہ زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں کو خانوں میں نہیں بانٹتے بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کو ایک رشتے میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ ''آزارِ غمِ عشق'' کی نظموں میں یہ نقطہ نظر اور نظریۂ حیات بہت نمایاں ہے۔ تجدیدِ وفا، مذہب انسانیت، سرحد کے محافظوں کے نام، نذرِ حسین، اجنبی ہوائیں وغیرہ سبھی اعلیٰ درجہ کی نظمیں ہیں۔ ان میں ایک ہموار شان اور ہمدردی کی لہر رواں دواں ہے۔ ایک دھیمی دھیمی آنچ اور ابدی سوز ہے جس سے ان کے فن میں وزن اور وقار جیسی خوبیاں در آتی ہیں۔ کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے:

تم محافظ سرحدوں کے
تم نگہباں پربتوں کے
تم امیں ان کیف پرور وادیوں کے
سو جنم لے کر بھی گر چاہیں کہ ہم
تم شیرِ دل بیٹوں کے
موجودہ جنم کا قرض اتاریں
تو بھی یہ ممکن نہ گا
یہ کبھی ممکن نہ گا

(سرحدوں کے محافظوں کے نام)

گھر جلا جس کا وہ اپنا ہی تو ہمسایہ ہے
مال غیروں کا نہیں قوم کا سرمایہ ہے
آؤ سوچیں ذرا اس بات کا احساس کریں
آؤ سب مل کے چلیں

(وقت کی آواز)

سوچتا ہوں یہ میرا شوق، یہ بے تابیٔ دل
پیش خیمہ ہو نہ ایک تازہ تباہی کے لیے
میری فطرت کو کسی طور یہ منظور نہیں
حسن بدنام ہو ناکردہ گناہی کے لیے

(تجدید وفا)

اس نفس کے پس منظر میں چاند نے جس عاشق کا کردار پیش کیا ہے وہ بلاشبہ لائق ستائش ہے اور بالیقیں چاند کی شخصیت کا پرتو بھی۔ مغربی ممالک کے لوگوں کی کھوکھلی اور پر تصنع زندگی پر اپنے تاثرات کا اظہار وہ اس طرح کرتے ہیں

بجا یہ ان کا سلیقہ۔ بجا یہ ان کا اشعار
مگر دلوں میں کہیں بھی یہاں وہ بات نہیں
نہ وہ خلوص، نہ وہ دوستی، نہ اپنا پن
یہ دن وہ دن نہیں

یہ رات بھی وہ رات نہیں
مرے وطن کی طرح کی یہ کائنات نہیں
(اجنبی ہوائیں)

چاند صاحب کا وہ کلام جو ان کے جواں سال بیٹے کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد کا ہے۔اس میں چاند کے دل کی دھڑکن واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔اس کلام میں بہت شدید احساس ہے اور خونِ جگر کی گرمی بھی شامل ہے۔چانداس غمِ حیات کی ترجمانی اور عکاسی میں جذباتی نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جو تاثر اور ہم آہنگی ان اشعار میں ملتی ہے۔اس سے اس کا تاثر بڑھتا ہے اور یہی تاثر اس کلام کی سب سے اہم خصوصیت ہے:

اگرچہ موت کے ہاتھوں نے اس کو چھین لیا
ہمارا بیٹا ہمارے دلوں میں زندہ ہے

اِک نہ اِک دن تو پلٹ کر آئے گی صبح سکوں
میں اسی امید پر بارِ الم ڈھوتا رہا

اس کرب کے لفظوں میں کس طور بیاں کیجیے؟
اِک طرفہ قیامت ہے، اپنوں کا جدا ہونا

روح پہ چھالے ذہن تپیدہ جسم پہ زخموں کی
پوشاک
تم کیا جانو، آگ کا دریا، ہم نے کیسے پار کیا!

چاند کی شخصیت اور شاعری کا ایک نمایاں پہلو غم کا عرفان ہے۔غم زندگی کی ایک بڑی اٹل حقیقت ہے۔حزنیہ جذبات واحساسات کوفن کے آئینے میں نکھارنے سے ان کی کثافت دور ہو جاتی ہے۔غم اور فن کا تعلق یہ ثابت کرتا ہے کہ شاعری تطہیر اور واگزاشت کا موثر ذریعہ ہے۔غم ایک محیط اور عالم گیر حقیقت ہے۔غم نہ صرف زندگی کی حقیقتوں کو ہم پر منکشف کرتا ہے بلکہ اس کی بدولت شاعری کا تخلیقی عمل بھی وجود میں آتا ہے۔غم یا تو تمناؤں اور آرزؤں کے شہید ہونے سے پیدا ہوتا ہے یا ان تک رسائی نہ ہونے سے دنیا میں زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یعنی یا تو اپنے نفس کو اشیاء اور حوادث کے سامنے سرنگوں کر دیا جائے یا ان پر قابو پا کر زیر کیا جائے یا شاید اس طرح بھی کہ اسے اس مالکِ کل کی رضا سمجھ لیا جائے۔یہ استغنا کی ایک وہبی کیفیت ہے۔

بیٹے کی وفات کے بعد چاند نے اپنے احساس کے پیکروں کو جو زباں عطا کی ہے اس میں جذباتی اور عقلی عناصر ایک وحدت میں تبدیل ہوتے نظر آرہے ہیں۔جسے ہم ایک طرح کی دروں بینی کہہ سکتے ہیں جو خرد کے تفاعل کے بغیر ممکن نہیں۔غم زندگی کی ایک اٹل سچائی تو ہے ہی لیکن شاعر کا اثباتی رنگ بھی غم کے ارتفاع ہی سے پیدا ہوتا ہے۔اس بات کی وضاحت کے لیے چاند کے اپنے ذاتی احساسات وتاثرات ملاحظہ فرمائیں۔جنھیں انہوں نے اسی حادثۂ جانکاہ سے متعلق ایک مضمون کی شکل میں قلم بند کیا ہے:

''درحقیقت ایمانداری کے ساتھ سوچا جائے تو خوشی کی طرح غم بھی زندگی کا ایک اہم ترین حصہ ہے:

نشاط وعیش بھی لازم ہیں آدمی کے لیے
بغیر الم کے مگر زندگی ادھوری ہے
غموں کا بوجھ اُٹھانا کٹھن سہی لیکن
غموں کا بوجھ اٹھانا بہت ضروری ہے

کہتے ہیں وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔بیٹے کی وفات سے فوراً بعد مجھے یہ کہاوت محض ایک طفل تسلی کی طرح لگتی تھی لیکن آج چار سال کے بعد اپنے اندر دیکھتا ہوں تو خود حیران ہوتا ہوں کہ جذبات نے اس دوران میں کس طرح اور کہاں سے کہاں تک سفر طے کیا ہے۔بیٹے کی مرگِ ناگہاں کے فوراً بعد میں نے جو کچھ لکھا تھا اس میں کچھ اس طرح کے احساسات تھے۔

کن خطاؤں کی سزا تھی یہ وہی جانے مگر
میں سکونِ دل کی خاطر عمر بھر روتا رہا
دے گیا وہ زندگی بھر کی جدائی کا جو داغ
چاند میں اشکوں کی شبنم سے اسے دھوتا رہا

پل پل رویا، قطرہ قطرہ تنہائی کا زہر پیا
آگ کے دریا سے گزرا ہوں تجھ سے بچھڑ جانے کے بعد

آزار یہ تنہا راتوں کا کیا شے ہے؟ یہ تم کیا جانو
اس کرب کو ہم نے جھیلا ہے اس درد کو ہم ہی جانتے ہیں

روح پہ چھالے ذہن تپیدہ جسم پہ زخموں کی پوشاک
تم کیا جانو، آگ کا دریا ہم نے کیسے پار کیا

بعدازاں جب عقل جذبات پر قدرے حاوی ہونے لگی تو خود بخود یہ احساس ہونے لگا کہ انسانی زندگی کو متوازن رکھنے کے لیے خوشی کے ساتھ غم و آلام کا ہونا بھی ضروری ہے۔ہم لگ اپنے غموں کا رونا تو عمر بھر روتے رہتے ہیں اور یہ قدرتی بات بھی ہے لیکن اس خدا کی دی ہوئی ہزار ہا نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔ابھی حال ہی میں ایک تازہ غزل ہوئی اور لاشعوری طور پر اس میں یہ شعر آ گیا تو مجھے خود ایک خوش گوار حیرت ہوئی کہ گویا مجھے اس المیے کو ہمت اور استقلال نیز ایک مثبت نظریے کے ساتھ جھیلنے کا شعور آ گیا ہے۔

جو چھین لیا تو نے گلہ اس کا ہو کیوں کر؟

بخشا ہے جو تو نے وہ کہیں اس سے سوا ہے''

یہی عرفانِ غم دراصل زندگی میں بصیرت حاصل کرنے کا وسیلہ بنتا ہے۔ اور یہ بلوغت احساس زندگی کو خزاں کو بہار کے وجد آفریں پیکر میں ڈھال دیتا ہے۔ غم کو لذت بنا کر جینے کا ہنر کسی کسی کو آتا ہے۔ اس کرب ناک سانحہ کے بعد چاند کے کلام میں کرب، تڑپ، کسک، سوز و گداز اور غم کی سلگتی ہوئی جو آنچ ہے اس میں ذہنی ترفع کا احساس نمایاں ہے۔

چاند کا تازہ کلام صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے زیادہ اہم ہے۔ کیوں کہ اس سے ان کی شاعری کے ایک نئے موڑ اور فکر کی ایک نئی منزل کا پتا چلتا ہے۔ اس میں ایک نیا انداز ہے، ایک نیا آہنگ ہے۔ اس کے موضوعات کچھ ایسے نئے بھی نہیں ہیں لیکن حقیقت پسندانہ زاویہ نظر اور عملی نقطۂ خیال نے ان میں ایک نئی جولانی پیدا کر دی ہے۔ ایک نیا جذبہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے ہر چیز ہر بات اور ہر خیال کو اپنے بنیادی موضوع کے ساتھ اس طرح آہنگ کیا ہے کہ وہ اس سے الگ معلوم نہیں ہوتے۔

چاند کی غزلوں اور نظموں میں خود ضبطی اور توازن سے تجربے کی سالمیت برقرار ہے۔ ان تجربوں میں تنوع، عمق اور وسعت جیسی نادر خوبیاں ہیں۔ انہوں نے شخصی درد اور سوز کے ساتھ اپنے موضوعات کو برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں دردمندی کی آنچ قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی یہ تاثر انگیزی اپنے ہم عصروں سے ممتاز بناتی ہے۔ چاند کی شاعری میں ان کا کرب، چیخ یا شور بن کر نہیں ابھرتا۔ یہ ان کے شخصی خواص یعنی نرمی، لطافت، خوش طبعی اور جمالیاتی احساس کی بدولت داخلی نغمگی میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ نغمگی رسیلی بھی ہے، لطیف بھی ہے اور سادہ بھی جو مترنم لے میں ڈھل جاتی ہے۔

آرہے ہیں یاد پھر بچھڑے ہوئے کچھ ہم سفر
ڈس رہے ہیں آج پھر مجھ کو یہ تنہا راستے

خود شناسی کو جو حسرت تھی وہ حسرت ہی رہی
مجھ کو اے زیست! کبھی مجھ سے ملایا ہوتا

گئی تھی کھو جنے صبر و قرار میری حیات
متاعِ درد کی سوغات لے کے گھر آئی!

اے غیرتِ ناہید ترا طرزِ تکلم
سنگیت کے لے ہے کہ یہ سورج کی کرن!

مہکی ہوئی سانسوں میں بسی ہے کوئی مورت
خوش بو ہے بدن کی کہ یہ خوشبو کا بدن ہے!

وہی ہے میری کہانی کا مرکزی کردار
اسی کو اپنی کہانی سنا رہا ہوں میں!
سجا رہا ہوں سر آنکھوں پہ خاکِ پاک اس کی
اسی دیار میں دلِ غم سے روشناس ہوا
سمجھ سکا نہ کوئی اس کے دردِ پنہاں کو
وہ قہقہہ میرے اشکوں کا جو لباس ہوا

ابھر چلے تھے زخم جو پھر سے لگے منہ کھولنے
کچھ پرانے درد لے کر آئی ہے تازہ ہوا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ چاند کی محبت ایک جذباتی ہیجان نہیں ہے اور محبت کا جذبہ چاند کے یہاں کوئی معمولی جذبہ نہیں ہے۔ اس میں ایک رفعت اور ترفع کا احساس ہوتا ہے۔ اور چاند نے یہاں ان جذبات و احساسات کو پیش کر کے محبت کے اسی مہذب جذبے کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

غزل اور نظم کے علاوہ چاند نے اور بھی کئی اصنافِ سخن کو اپنے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے جیسے سانیٹ، رباعی، قطعہ، گیت اور سلام وغیرہ۔ یہاں نمونے کے طور پر ان کی صرف ایک رباعی اور ایک قطعہ درج کیے جا رہے ہیں تا کہ قارئین اندازہ لگالیں کہ غزل اور نظم کی طرح چاند دیگر اصنافِ سخن پر بھی اتنی ہی قدرت رکھتے ہیں:

(رباعی)

شنوائی فریاد کی امید نہ رکھ
حق بات پہ بھی صاد کی امید نہ رکھ
جینا ہے جو زندوں کی طرح دنیا میں
اپنوں سے بھی امداد کی امید نہ رکھ

(قطعہ)

مزہ جب ہے کہ سیرت بھی حسیں ہو
کہ شکل مومناں کافی نہیں ہے
کھرا نیت کا ہونا بھی ہے لازم
فقط میٹھی زباں کافی نہیں ہے

غرضیکہ اس زمانے کی جذباتی و ذہنی عملی وفکری زندگی کے کم وبیش تمام پہلوؤں کی ترجمانی چاند کی تخلیقات میں ملتی ہے اسی لیے اس میں جدت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں احساس کی شدت ہے، جذبے کا خلوص ہے، شعور کی بلندی ہے اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز بناتی ہیں۔

☆

چاند کے آفاقِ نقد

ڈاکٹر خلیق انجم (دہلی، بھارت)

مہندر پرتاپ چاند کی شخصیت دنیائے شعر وادب میں محتاجِ تعارف نہیں۔ ایک معروف شاعر ہونے کے علاوہ وہ ذہین اور بالغ نظر نقاد بھی ہیں۔ ان کے ادبی اور تنقیدی مضامین کا زیرِ نظر مجموعہ ''اجالوں کے سفیر'' ان کی تنقیدی بصیرت اور معیارِ نقد کا آئینہ ہے جس میں انہوں نے کچھ ہم عصر فنکاروں کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کی نقاب کشائی کے ساتھ اردو کے ذخیرۂ ادب کو ان کی قابلِ قدر دین کی تفہیم وتصریح کے کچھ دلچسپ گوشے بھی وا کیے ہیں۔ نیز غالبؔ، حالیؔ اور داغؔ جیسے نابغۂ روزگار متقدمین کے تخلیقی سرمایہ کو کھنگال کر ان عناصر کی نشاندہی کی مستحسن سعی کی ہے جن سے ہمارا ادب، سماج، معاشرہ اور زندگی کے گوناگوں دوسرے پہلو کسی حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ یہ عمل چاندؔ صاحب کے وسیع مطالعہ، تبحرِ علمی، ذوقِ تحقیق اور ناقدانہ عرق ریزی کا مظہر ہے۔ ان کا شگفتہ اسلوبِ رقم، استدلال، منطقی استخراجِ نتائج، غیر جانبداری اور متانت ان کے سنجیدہ غور وفکر پر دال ہیں۔ چاند نے کج بحثیوں اور غیر افادی مباحث میں الجھنے کے بجائے اعتدال وتوازن سے کام لیا ہے، پھر بھی کچھ قد آور اور مستحسن ادبی شخصیتوں کے تئیں ان کے نقد ونظر پہ کہیں کہیں ذاتی عقیدت اور نجی احترام کی گنجائش اور جواز سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

فن بذاتِ خود زندگی کی تنقید ہے اور چاند نے زیرِ تنقید فنکاروں کی فن زندگی سے براہِ راست انسلاک ڈھونڈنے کی کاوش کی ہے اور ان ادیبوں اور شاعروں کے عہدِ حیات کے سماجی، سیاسی اور فکری، معاشی اور تہذیبی عوامل و مسائل کے حوالے سے ان کے فن کے بطون تک رسائی کی ہے۔ ہر فنکار ایک محشرِ خیال ہے اور تنقید جہاں اس کے فن کے کچھ منفرد پہلوؤں کی نشاندہی کا عمل ہے وہاں تخلیقِ ادب میں افراط تفریط کی اصلاح نیز صالح ادب کی ترویج وترقی کو مہمیز کرنے کا وسیلہ بھی۔

زیرِ نظر کتاب میں غالبؔ کے غیر مسلم مداحین اور ماہرین غالبیات کے عنوان سے ایک مقالہ شامل ہے۔ مقالے کی ابتداء میں چاند صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے۔

''حالاں کہ غالبؔ کو اپنی فارسی شاعری پر بے حد ناز تھا اور اپنے اردو کلام کو انہوں نے بے رنگ کہا ہے، لیکن انہیں بے پناہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی وہ ان کے مختصر اردو دیوان کی وجہ سے ہے۔ نزاکتِ خیال، فکر کی نیرنگی، معنی آفرینی، نادرِ تشبیہات، محاورہ بندی مرزا کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ سے غالبؔ کو آج کا بہترین اردو شاعر مانا جاتا ہے''

یہ مقالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے نہ صرف بہت اہم ہے بلکہ بصیرت افروز بھی ہے۔ اس میں غالبؔ کے بارے میں ان تخلیقی وتنقیدی تحریروں کا انتہائی منصفانہ جائزہ لیا گیا ہے، جن کے مصنف غیر مسلم تھے۔ ان میں پہلا مصنف استاد فن جوشؔ ملسیانی ہے۔ جوشؔ مرحوم نے غالبؔ کے فن پر تحقیقی و تنقیدی تحریریں تو نہیں لکھی تھیں، لیکن غالبؔ کے کلام کی ایسی شرح لکھی ہے جو غالبیات میں اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ پچھلے تقریباً 150 سال میں غالب کے اردو اشعار کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں لیکن مرحوم جوشؔ ملسیانی نے جس انداز میں غالبؔ کے اشعار کی شرح پیش کی ہے وہ خود اپنی جگہ بہت اہم ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ جوشؔ مرحوم نے غالبؔ کے کلام کو بخوبی سمجھا ہے۔

اس کتاب کا ایک اور اہم مضمون حالیؔ کی سیرت کے کچھ امتیازی پہلو ہیں۔ سرزمین ہریانہ پر جو ممتاز اور عہد ساز نقاد، ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں ان میں مولانا حالیؔ کا نام ممتاز ترین ہے۔ چاند صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ ''حالیؔ پہلے باضابطہ سوانح نگار، پہلے مستند نقاد ہیں۔ انہیں جدید تنقید، جدید شاعری اور جدید نظم کا باوا آدم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خاکساری اور انکسار ہے۔''

انہوں نے کبھی اپنے اس مرتبے پر فخر کرنا تو کجا اس کا ذکر کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ چاند صاحب نے اس موضوع پر حالیؔ کے دو شعر پیش کیے ہیں:

معنی کا تم نے حالیؔ دریا اگر بہایا
یہ تو بتاؤ حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا
جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالیؔ
کچھ کر کے بھی دکھائے زورِ قلم تمہارا

چاند صاحب نے حالیؔ کی شاعری اور شخصیت کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حالی ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ بقول چاند صاحب، حالیؔ نہایت خلیق، خوش اخلاق، خوش اطوار اور پاک سیرت انسان تھے۔ خلوص، شرافت، مروت، نیک نفسی، بے تعصبی، قناعت پسندی، حب الوطنی، دردمندی، سچائی اور ہمدردی کے خصائل ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا کہ اتنی خوبیوں والا انسان انسانیت کا ایک عظیم پیکر ہوگا۔ چاند صاحب نے حالیؔ کے سوانح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حالیؔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی ۹ سال کی عمر ہی تھی کہ والد داغِ مفارقت دے گئے۔ بڑے بھائی امداد حسین نے ان کی پرورش وتربیت کی۔ ۱۷ ہی سال کے تھے کہ ان کی شادی کر دی گئی۔ اگرچہ یہ شادی ان کی مرضی کے خلاف تھی لیکن حالیؔ بزرگوں کے احترام میں کچھ نہ بولے۔ انہیں علم حاصل کرنے کی لگن تھی اور شادی کے بعد یہ ممکن نہیں تھا اس لیے حالیؔ ایک دم چپکے سے گھر چھوڑ کر دہلی چلے گئے۔ جیب میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے پانی پت سے دہلی کا سفر پیدل طے کیا۔ یہ

ان کی خوش نصیبی تھی کہ دہلی میں اس وقت غالبؔ، مومنؔ اور شیفتہؔ جیسے با کمال لوگ موجود تھے، جن کی صحبت انہیں نصیب ہوئی۔ دہلی کے قیام کے ابتدائی دنوں میں مالی اعتبار سے وہ بہت پریشان رہے لیکن جیسے تیسے قناعت کا سہارا لے کر انہوں نے زندگی گزاری۔ ابھی ان کو دہلی آئے ہوئے ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا کہ گھر والوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ دہلی میں ہیں۔ بڑے بھائی امداد حسین انہیں لینے آئے۔ حالیؔ کی شرافت، سعادت مندی، بزرگوں کا احترام، مروت نیک نفسی آڑے آئی، اس لیے وہ انکار نہیں کر سکے اور بھائی کے ساتھ پانی پت چلے گئے۔ کچھ دن بعد حصار کے ضلع ناظم کے دفتر میں معمولی تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ چاند صاحب نے حالیؔ کی شخصیت اور سیرت کے اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ بچوں اور عورتوں کے لیے ان کے درد آشنا دل میں ایک خاص جگہ تھی۔ بچے چاہے دوستوں کے ہوں، پڑوسیوں کے یا نوکروں کے، سب کے ساتھ حالیؔ کا برتاؤ مشفقانہ ہوتا تھا۔

چاند صاحب نے اس سلسلے میں کئی واقعات لکھے ہیں۔ حالیؔ کی ایک بیٹی بیوہ ہو گئی تھی اور مزید بدنصیبی یہ تھی کہ اس بیٹی کا اکلوتا بیٹا مرگی کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ حالیؔ نے اس بچے کی غیر معمولی خدمت کی۔ انہیں اس لڑکے سے اتنی محبت تھی کہ ایک بار اس لڑکے نے مولانا کو ایسا دھکا دیا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔ حالیؔ کے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین پاس ہی کھڑے تھے، انہیں اتنا ناگوار گزرا کہ انہوں نے لڑکے کو تھپڑ رسید کر دیا۔ حالیؔ سجاد حسین کی اس حرکت سے بہت ناراض ہوئے اور اپنے بیٹے کو اس وقت تک معاف نہیں کیا جب تک انہوں نے اپنے بیمار بھانجے سے معافی نہیں مانگ لی۔ چاند کا یہ مقالہ مختصر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ حالیؔ کی شخصیت کے تمام انسانی اور ادبی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔

چاند صاحب ایک اعلیٰ درجے کے محقق اور ممتاز نقاد ہیں۔ اگر انہوں نے غالبؔ اور حالیؔ جیسی عظیم شخصیتوں پر بصیرت افروز مقالے لکھے ہیں تو جوش ملیح آبادی اور علی سردار جعفری کے فن پر بھی عالمانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ ''جوش ملیح آبادی اور ان کا نظریہ عشق'' کے عنوان سے انہوں نے جوشؔ کی خودنوشت سوانح عمری ''یادوں کی برات'' کے آئینے میں جوش کے عشق کا تجزیہ کیا ہے۔ ہمارے عہد کے نقادوں کے لیے جوشؔ کی خودنوشت ''یادوں کی برات'' کا تجزیہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اکثر نقادوں نے اس میدان میں توازن کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے یا تو جوشؔ کے نظریہ عشق کی زبردست مداحی کی ہے یا جوشؔ کے کردار کے بارے میں بہت سی نازیبا باتیں کہی ہیں۔ مندر پرتاپ چاند صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ان کا تنقیدی رویہ بہت ہی متوازن ہے۔ انہوں نے جوشؔ کو ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کے انسان کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ ان کی خوبیوں کی تعریف کی ہے اور ان کے کردار منفی پہلوؤں کا ذکر بھی بڑی ایمانداری سے کیا ہے۔ جوشؔ نے اپنی زندگی کے بارے میں منفی اور مثبت باتیں ایمانداری سے کہی ہیں، چاند صاحب نے اس کی تعریف کی ہے اور ان کے اس طرح کے بیانات کو ان کی انسانی عظمت کا ثبوت قرار دیا ہے۔ جوشؔ پر چاند صاحب نے اس مضمون کے آخری پیراگراف میں لکھا ہے کہ ''یقیناً جوشؔ کی اس بہادرانہ روش میں ان کی حسن پرستی اور معاملاتِ عشق کی عطا کردہ بے پناہ قوت اور خود اعتمادی ہر قدم پر ان کے ساتھ رہی ہو گی۔ حالاں کہ حسن و عاشقی کے ان فخریہ بیانات نے ان کی مجموعی شخصیت کو قدرے داغدار بھی کیا ہے تاہم جوشؔ صاحب اپنی شاعرانہ عظمت، اپنی انا و خودداری، انسان دوستی اور حب الوطنی کے لیے بھی ہمیشہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔''

مہندر پرتاپ چاند صاحب نے ایک بہت دلچسپ عنوان کے تحت کشمیری لال ذاکر صاحب پر ایک مقالہ لکھا ہے جو ذاکر صاحب کے تازہ مجموعہ قطعات ''عکسِ رُخِ گلبدن'' کے حوالے سے ہے۔ عنوان ہے ''فخر علم و ادب 90 سالہ نوجوان کشمیری لال ذاکر''۔ جن لوگوں نے کشمیری لال ذاکر کو قریب سے دیکھا ہے اور وہ ان کے غیر معمولی انتظامی اور ادبی کارناموں سے واقف ہیں، وہی اس عنوان کی اہمیت سے واقف ہوں گے۔ کشمیری لال ذاکر صاحب ہمارے زمانے کی ایک غیر معمولی اور مثالی شخصیت ہیں۔ 100 سے زیادہ کتابوں کے خالق، ہریانہ اردو اکیڈمی کے نہایت فعال سیکرٹری، مرکزی حکومت سے خطاب پانے والے پدم شری کشمیری لال ذاکر صاحب کا شمار ہندو پاک کے صف اول کے شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ مہندر پرتاپ چاند صاحب نے کشمیری لال ذاکر صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسے یہاں دہرانا بے سود ہے، کیونکہ چاند صاحب کا پورا مضمون پڑھے بغیر کشمیری لال ذاکر صاحب کی شخصیت سے ہم پوری طرح واقف نہیں ہو سکتے۔

جن مضامین کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے علاوہ چاند صاحب کا ایک اہم مضمون علی سردار جعفری پر بھی ہے۔ جس کا عنوان ہے ''آزادیٔ جمہور کا نقیب علی سردار جعفری'' مقالہ شروع کرتے ہوئے چاند صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ:
''سردار جعفری برصغیر کی ایک معتبر آواز اور ایک عہد ساز ادبی شخصیت تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے محض ایک اہم رکن ہی نہیں بلکہ اس کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ انسانی عظمت کے قائل تھے اور مساوات پر اساس پذیر ایک خوشحال زندگی کے گیت گاتے رہے''

مہندر پرتاپ چاند صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے نقاد ہیں۔ کلاسیکی ادب کے شاعروں کے فن پر بڑی متوازن تنقید کرتے ہیں۔ علی سردار جعفری کی شاعری کے بارے میں انہوں نے بغیر کسی تعصب کے ایمانداری سے ان کے فن کی تعریف کی ہے۔ چاند صاحب نے اپنے سینئر معاصرین مثلاً قیس جالندھری، ڈاکٹر زار علامی، صابر ابوہری، بال کرشن مضطرؔ، پروفیسر شیدا انبالوی اور اپنے عہد کے دو معتبر شاعروں شباب للتؔ اور سلطان انجمؔ پر بھی قابل قدر مقالے لکھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ چاند صاحب کے ان مقالہ جات کی خاطر خواہ پذیرائی ہو گی۔

''رحمت کا دروازہ''

مامون ایمن

(نیویارک)

مہندر پرتاپ چاؔند کا شعری مجموعہ ''حرفِ آشنا'' میرے لیے ذاتی طور پر قابل قدر ہے۔ اس قدر کے جواز میں پیش کیے جانے والے مختلف النوع ثبوت ایک جانب، اس میں دو نابغہِ ہائے روزگار کی آراء بھی شامل ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی ہیں حضرت امرچند قیسؔ جالندھری اور پنڈت رتن پنڈوری۔ یہ دونوں حضرات زبان، بیان اور فن پر استادانہ مہارت کے حامل تھے۔ یہ اساتذہ دیگر شعری اصناف کے ساتھ ساتھ رباعی گوئی کی صنف میں بھی یکتا تھے۔ یہ ناچیز مضمون نگار بھی رباعی گوئی کا خاص شغف رکھتا ہے اور اضافت، عطف، جزوی قوافی اور تقابلِ ردیفین کے بغیر اب تک ایک ہزار رباعیاں کہہ چکا ہے۔ پنجابی زبان بولنے والا، گزشتہ چار دہائیوں سے زیادہ نیویارک شہر میں رہنے والا، انگریزی زبان پڑھا کر رزقِ حلال فراہم کرنے والا یہ ہیچ مدان، ان اساتذہ کے فنِ شعر گوئی کا معترف بھی ہے اور مدّاح بھی۔ نیز یہ مضمون نگار رتن جی کی فنِّ عروض پر مقتدر کتاب ''سرمایۂ بلاغت'' کو جان سے عزیز رکھتا ہے اور مستقل طور پر اس سے استفادہ کرتا ہے۔ لہٰذا اس کے نزدیک انِ دونوں اساتذہ کی آراء ''حرفِ آشنا'' کو باوقار بناتی ہیں۔ دوسری جانب ''ساحؔر ہوشیار پوری صاحب اور کشمیری لعل ذاکؔر صاحب کی مختصر تقریظات سے اس مجموعہِ کلام نے اعتبار کا درجہ پایا ہے۔ ساحؔر صاحب کی شعر گوئی اردو ادب کا سرمایہ ہے۔ ذاکؔر صاحب کی زبان دانی اور ژرف نگاہی نے اردو ادب کو چار چاند لگائے ہیں۔ ان تمام اہلِ فن کی آراء میں چاند کے لیے شفقت اور قرب کے جذبات جھلکتے ہیں۔ چاؔند صاحب اس التفات کے پوری طرح حق دار بھی ہیں کہ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں اور ایک اچھے انسان بھی۔ (ہم پنجاب والے ''انسان'' کو ''بندہ'' کہہ کر زیادہ خوش ہوتے ہیں) اس موقع پر میں اس حقیقت کو دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ تنقیدی مضامین میں ذاتی باتیں نہ کرنا چاہیے، لیکن اس مضمون میں قیس صاحب اور رتن جی ایسی شخصیتوں کا برملا احترام میرے کردار کا ایک حصہ ہے۔ چاؔند صاحب سے ہزاروں میلوں کی دُوری کے باوجود میں اپنی دھڑکنوں میں ان کے لیے قرب کی صدائیں محسوس کرتا ہوں (یاد رہے کہ احساس کا درجہ، سماعت کے درجہ سے زیادہ تہہ دار ہے)۔

اب آیئے ذرا ''حرفِ آشنا'' کے فنّی حصہ کی جانب۔ ماضی کو تج بغیر چاؔند صاحب مستقبل کی بات کرتے ہیں۔ تاریخی طور پر ماضی کی ہر بات ''جانی'' ہوتی ہے اور مستقبل کی ہر بات ''ان جانی''۔ انتخاب بروئے کار لاتے ہوئے چاند صاحب ماضی کی اچھائیاں تلاش کرتے ہیں، انہیں دہراتے ہیں اور آنے والے شب و روز میں انہیں پرونا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایسا گجرا گوندھنا چاہتے ہیں جس کی کلیوں اور پھولوں میں گزرتے لمحات اور بدلتے موسموں کی آزمائشوں اور اثرات کے باوجود مُرجھانے کا عمل ناپید ہو۔ یہ ایک انوکھا خواب ہے جو حقیقت کی تعبیر سے بہت دُور ہے کہ امتدادِ زمانہ کی موجودگی میں تبدّل ناگزیر ہے۔ یہ تبدل وقت کی فطرت میں داخل ہے۔ اس فطرت میں ارتقاء کے ساتھ گاہے ابتذال بھی در آتا ہے۔ مجوزہ ابتذال کبھی واضح ہوتا ہے اور کبھی غیر واضح۔۔۔ کبھی وہ تیز رو ہوتا ہے اور کبھی سست رو۔ عام آنکھ بے حس ہونے کے باعث اس ابتذال کی آمد اور کارفرمائی سے بے خبر رہتی ہے لیکن حسّاس آنکھ وہ خبر اپنے احاطۂ قدرت میں رکھتی ہے، بیشتر اوقات اس کا اعلان بھی کرتی ہے اور مختلف صورتوں سے اس کی وجوہات اور نتائج کا تجزیہ بھی کرتی ہے۔ وہ تجزیہ صلاح و فلاح کا پیامی بھی ہوتا ہے اور داعی و محرک بھی۔ چاؔند صاحب کی غزلوں کا اسلوب اسی تجزیہ کا ایک پرتو ہے۔ اس اسلوب کے انسلاکی الفاظ ہیں۔ ''خامشی، خوش بُو، خوشی'' یہ الفاظ ''شوخی، الم، گمان، خودشناسی، حق، مراد، خاک، صدا'' سے مربوط ہیں۔ یہ ربط ایک شیرازہ ہے جو درِ رحمت ہونے پر بکھر جاتا ہے۔

بند کیا مجھ پر ترِی رحمت کا درازہ ہُوا
پارہ پارہ سب مِری ہستی کا شیرازہ ہُوا

حفظِ مراتب کا اصول پیشِ نظر رکھتے ہوئے چاؔند صاحب نے پہلے مصرع میں لفظ ''ترِی'' اور دوسرے مصرع میں لفظ ''مرِی'' باندھا ہے۔ ''تری'' کا واسطہ ''رحمت'' سے ہے اور ''مری'' کا واسطہ ''ہستی'' سے ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ''ہستی'' ایک دین ہے۔ ''رحمت'' کی دین۔ رحمت کے بغیر ہستی کا تصور بھی ناممکن ہے۔ اس شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ ''شیرازہ'' استعمال ہوا ہے۔ یہ شیرازہ کوئی آئینہ نہیں جو ٹوٹ کر کرچیوں کی شکل اختیار کرلے اور ہر کرچی اپنے وجود کا اعلان کرے۔ چاؔند کے نزدیک یہ شیرازہ بکھر کر پاروں کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس شعر کے متن میں لفظ ''پارہ'' کو ''ٹکڑا'' نہ کہیے تو بیان کی تہہ داری میں اضافہ ہوگا۔ اس پارہ کو ''سیماب'' جانیے اور مانیے کہ سیماب کے مقدر میں قرار نہیں۔ سیماب کا مقدر ازل سے بے قرار ہے۔ حیاتِ انساں ازل سے بے قرار ہے۔ خالق و مخلوق کے درمیان پایا جانے والا فراق انسان کو ہر سانس پر بے قرار کرتا ہے، بے قرار رکھتا ہے، سانسوں کا تسلسل، متعلقہ فراق کو وصل میں بدلنے کے لیے متمنی اور دعا گو بنائے رکھتا ہے۔ ''اے خالق! تو مجھ پر اپنی رحمت کا دروازہ وا رکھ تا کہ میں بکھرنے سے محفوظ رہوں اور ایک دِن تیرے قرب، تیری دید سے خود کو سُرخ رو کروں، فرحاں و نازاں بناؤں۔ فلک سے ناکامی کے باوجود، چاؔند اپنی دعا میں تاثیر کا جو ہر دیکھتا ہے اور اپنے خالق کی رضا پر بھروسہ رکھتا

ہے۔

سو بارِ پلٹ آئی یہ ناکام فلک سے
اے چاند! بھروسہ ہے تجھے اپنی دعا پر؟

اس شعر کے پہلے مصرع میں ناکامیِ دعا کا اعتراف ہے۔دوسرے شعر میں ایک سوال ہے جو تشکیک سے دوچار ہے۔یہ باطن تشکیک سے دوچار یہ سوال چاند صاحب کی روشِ اعتبار مزید استوار کرتا ہے،مزید چمکا تا ہے۔وہ اس سوال سے اپنی آئندہ تمناؤں کو نئی دعاؤں کا مرہونِ بناتے ہیں۔

وہی ہے میری کہانی کا مرکزی کردار
اُسی کو اپنی کہانی سُنا رہا ہوں میں

چاند کی کہانی میں ماضی بھی ہے،حال بھی ہے اور مستقبل کے خوش گوار تصوّرات اور خواہشات بھی

جمودِ ذہن کا اب تو قفس یہ ٹوٹے گا
خیال و فکر کا طائر جو پھڑ پھڑایا ہے

پچھلے وقتوں کی اب وہ شرم کہاں
اب تو آنکھوں میں مَر گیا پانی

ہر دل اداس اداس ہے، ہر آنکھ اشک
بار
محرومیوں کے داغ لیے کون مَر گیا

تیسرے شعر کا پہلا مصرع ''اجتماعیت'' سے معمور ہے اور دوسرا مصرع ''انفرادیت'' کی ایک صورت ہے۔اجتماعیت اور انفرادیت کے اختلاط سے اُبھرنے والا سوال اس شعر کے مجوزہ متن کو گیرائی عطا کرتا ہے۔

موجودہ پاکستان کے وسط میں مفروضہ کے طور پر بنائی جانے والی مستطیل اس ملک کے چاروں صوبوں سرحد، پنجاب، بلوچستان اور سندھ کا احاطہ کرتی ہے۔اس مستطیل میں شامل جغرافیائی علاقہ سرائیکی زبان کا گھر ہے۔چاند صاحب کی مادری زبان سرائیکی ہے۔اپنے ابتدائی بچپن ہی میں سرائیکی زبان کی سرزمین سے ہجرت کرنے والے چاند صاحب سرائیکی کو آج تک اپنے دل سے لگائے ہوئے ہیں (وہ سرائیکی میں بھی ٹھیک ٹھاک غزل کہتے ہیں)

سرائیکی زبان پر فارسی اور ہندی کے اثرات نمایاں ہیں۔مٹھاس کے باعث اس زبان کو متحدہ ہندوستان کی فارسی کہا جاتا ہے۔یہ زبان پنجابی کی بہن ہے۔لفظ ''پنجابی'' مرکب ہے ''پنج'' اور ''آبی'' کا۔پنج اور آب فارسی الفاظ ہیں۔ہندی کو ''قدیم ہندی ایرانی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا ہے۔اس تمہید کا ایک مقصد ہے ہندوستان میں رہ کر چاند صاحب نے ہندی پر دسترس حاصل کی اور فارسی وعربی الفاظ اپنائے۔ان کے درست معانی ومفاہیم کے ساتھ۔

اب ہم چاند صاحب کی غزلوں میں شامل چُنیدہ لفظیات کی جانب آتے ہیں۔ پہلے یہ ہندی شبد ملاحظہ کیجیے۔ ''گھروندہ، چبھن، چلن، چلچلاتی،گھٹن،سنگیت،مٹھاس،چھن،جھولا،پُرانے'' اور اب یہ فارسی الفاظ بھی دیکھیے۔ ''زیست، آمیز، غازہ، خشک، خواب، گماں، زخم، ناگہاں، موج ، شیریں''۔

اضافتی تراکیب کے ضمن میں چاند صاحب نے روایت سے فائدہ اٹھایا ہے۔مثلاً ''غیرتِ ناہید، سازِ الم، حسنِ عُریاں، سرِ راہ، ہنگام سحر، نقشِ پا، زیرِ نگیں، جمودِ ذہن'' روایت کی راہ میں ان دولفظی تراکیب کا سلسلہ کہیں کہیں زرازرانیا بھی نظر آتا ہے،مثلاً ''وجہِ فخر، ناکامیِ تقدیر، حسرتِ منزل، شہرہِ آفاق، مائل تباہی، دامنِ دل، دیدۂ باطن، تہمتِ حق، وحشتِ پیہم، حرفِ تحسیں''۔۔۔ ''دامِ بے دام'' کے ترکیب تضادِ سلبی کی ایک مثال ہے۔چاند صاحب کی غزلوں میں دوالفاظ ہم سَر بھی نظر آتے ہیں،مثلاً ''ضوفشاں، جاں سوز، سراپا درد، سیاہ خانہ، وفاکیش، حق شناس''۔

''حرفِ آشنا'' کی غزلوں میں عربی الفاظ بھی ہیں، مثلاً ''حذر، نظر، تعلق، حق، شرط، مطلب، تاثیر، عالم، اضطراب، منتہا'' اب یہ عطفی تراکیب بھی ملاحظہ کیجیے۔ ''صدق وصفا، رقص و لے، مہر و جفا، کلیسا و حرم، شب و روز، رنج و یاس'' ایک ترکیب میں اضافت اور عطف ساتھ ساتھ ہیں۔ ''ہم رہِ خس و خاشاک''۔

چاند صاحب خوش نصیب ہیں کہ انہیں قیس جالندھری ایسا ماہرِ زبان و بیاں استاد ملا۔قیس صاحب کی عروضی مہارت بھی مسلم تھی۔استاد کی رہنمائی نے چاند صاحب کو بحروں کے مزاج سے متعارف کرایا تو انھوں نے بیان پختہ بھی کیا اور موثر بھی بنایا۔اس ضمن میں چند مثالیں حاضر ہیں۔ ''خامشی ہی نے کہہ دیا سب کچھ'' (فاعلاتن، مفاعلن ، فعلن/بحرِ خفیف مسدس مخبون مشعث محذوف)۔۔۔ ''محبت کی غزل سازِ الم پر'' (مفاعیلن، مفاعیلن ، فعولن/بحرِ ہزج مسدّس سالم محذوف)۔۔۔ ''کچھ اب کے برس اور ہواؤں کا چلن ہے'' (مفعول، مفاعیل، مفاعیل، فعولن/ بحرِ ہزج مثمّن مکفوف محذوف)۔۔۔ ''تُو نے اِک بار اگر دِل سے بلایا ہوتا'' (فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن/ بحرِ رمل مثمّن سالم مخبون محذوف مسکّن)۔۔۔ ''حالِ دل آخر نگاہوں سے عیاں ہونے لگا'' (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن/بحرِ رمل مثمّن سالم محذوف)۔۔۔ ''سیاہ خانۂ دل میں یہ کون آیا ہے'' (مفاعلن ، فعلاتن، مفاعلن ،فعلن/بحرِ مجتث مثمّن مجنون محذوف)۔۔۔ ''بے اختیار ہم جو محبت میں رو دیئے'' (مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلن/ بحرِ مضارع مثمّن مکفوف محذوف)

یہ ایک عام سی بات ہے کہ شاعر اپنے اسلوب سے مناظر کی پردہ کشائی کرتا ہے۔یہاں یہ بھی یاد رہے کہ مجوزہ مناظر شاعر کی ذات اور اس سے

باقی صفحہ ۲۹ پر ملاحظہ کیجیے

''دیدکوترسی ہوئی آنکھیں''

آزادسونی پتی
(سونی پت، بھارت)

اردو کے ان قلمکاروں میں جن کی شہرت کی خوشبو نے اردو دنیا کو معطر کر رکھا ہے ایک نام مہندر پرتاپ چاند کا ہے ۔ اردو داں طبقہ میں ان کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موصوف نہ صرف اپنے صوبہ میں بحیثیت غزل گومقبول خاص وعام ہیں بلکہ ممالکِ غیر میں بھی خاصے مقبول ہیں۔

آپ یکم اگست ۱۹۳۵ء کروڑلعل عیسن (ضلع مظفرگڑھ حال ضلع لیّہ پاکستان) میں سوبھراج نارنگ کے گھر تولد ہوئے۔ شعروادب کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔کلواکوٹ ضلع میانوالی (پاکستان) میں جب وہ پرائمری سکول کے طالب علم تھے وہاں ان کے استاد بشر افغانی کلاس میں بیت بازی کرایا کرتے تھے۔ بیت بازی کا رواج ان دنوں عام تھا۔ بشر خود بھی اچھے شاعر تھے اور جوش ملسیانی کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے چاند کو بیت بازی میں حصہ لینے کی ترغیب دی جواُن کی شاعری کی بنیاد بنی۔

تقسیم وطن کے بعد جب ان کا خاندان زیرہ، پنجاب میں آیا تو اس وقت ان کی عمر تقریباً ۱۲ سال کی تھی۔ انہیں دنوں ان کے ایک عزیز دوست کے والد کا تبادلہ زیرہ سے کہیں باہر ہوگیا اور اس دوست سے بچھڑنے کا ان پر کافی اثر پڑا۔ وہ اپنے آپ کو تنہا اور اکیلا محسوس کرنے لگے۔ ان دنوں پہلی مرتبہ ان سے یہ قطعہ ہوا:

چھوڑ کر مجھ کو اکیلا جابسا ہے تو کہاں؟
کس نگر کی اب فضائیں راس تجھ کو آ گئیں؟
فاصلوں نے مجھ سے کتنا دور تجھ کو کر دیا
دیدکوترسی ہوئی آنکھیں بھی اب پتھرا گئیں

اس قطعہ کو ہند سماچار، جالندھر کے اس وقت کے مدیر نوہریا رام درد نکودری (مرحوم) نے نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد موصوف نے ڈی۔اے۔وی۔ کالج جالندھر میں داخلہ لیا۔ جالندھر اس وقت علم وادب کا گہوارہ تھا۔ کئی اخبار وہاں سے شائع ہوتے تھے۔ پنجاب، جس میں ہریانہ بھی شامل تھا، میں جالندھر ہی صرف ایسا ایک شہر تھا جہاں ریڈیو اسٹیشن تھا۔ یہاں سے اکثر و بیشتر مشاعرے نشر ہوا کرتے تھے۔ یہیں کے کسی ایک مشاعرے میں موصوف کی ملاقات علامہ قیس جالندھری سے ہوئی۔ علامہ قیس نے انہیں ازراہِ کرم اپنے شاگردوں میں شامل کرلیا۔ شاید ان کی تیز نظر نے چاند میں چھپے فنکار کو پہچان لیا تھا۔ یہ رشتہ ان کی وفات تک قائم رہا۔

وہ بنیادی طور پر فنکار ہیں اور ایک دیانتدار اور وفادار قلمکار کا حق ادا کرتے رہتے ہیں۔ ان کی زندگی میں عام آدمی کی طرح کڑوے کسیلے تجربات پیش آئے۔ وقت نے اپنے تیور دکھائے ۔محرومیاں اور کامیابیاں نصیب ہوئیں۔ زندگی کی اس دھوپ چھاؤں کے کھیل میں موصوف کو جوان لڑکے کی بے وقت موت کا المیہ بھی پیش آیا۔ کسی باپ کے لیے اپنے ہونہار جوان بیٹے کی موت سے بڑھ کر کوئی سانحہ کیا ہوگا۔ اسے انہوں نے اپنی نظم ونثر میں اجاگر بھی کیا ہے۔ ان کی سوچ ہمیشہ متوازن رہی اور زندگی کے تئیں ان کا نظریہ ہمیشہ مثبت رہا ہے۔ موصوف زندگی میں توازن رکھنے کے لیے غم اور خوشی دونوں کو لازم گردانتے ہیں رشتوں کی اہمیت پر گہرا یقین رکھتے ہیں۔ ان کا مزاج صوفیانہ ہے۔ وہ جس سے ملتے ہیں، دل سے ملتے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا محسوس کیا، اسے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا۔ وہ ایک خوش فکر اور قابلِ ذکر شاعر ہیں۔ غزل میں کلاسیکل مزاج اور جدید آہنگ کے امتزاج کو پیش کیا۔ غزل ایک سنجیدہ اور پراثر صنفِ سخن ہے۔ غزل کی یہی صورت ذہنی اعتدال کی عکاسی کرتی ہے کیونکہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ ان کی شاعری میں سماجی انتشار کے خلاف احتجاج اور اخلاقی روایات کی پاسداری ہے، الفاظ اور تراکیب کی جدت طرازی ہے، اظہارِ بیان میں شدت ہے ،لفظوں کو برتنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ ان کے مناسب استعمال سے مفہوم کا دائرہ وسیع کر دیتے ہیں۔ وہ الفاظ کو خوش اسلوبی سے استعمال کرنا جانتے ہیں۔ اس سے جذبات اور احساسات کو بہت ہی موثر بنا دیتے ہیں۔ جس سے ان کی غزل لطافت اور دل کشی کی تصویر بن جاتی ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ حالات اور مزاج پرکھنا انہیں آتا ہے۔ عشقِ مجازی کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کا نغمہ بھی انہوں نے گایا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی ہو، تصوف ہو، سیاسی وسماجی، اقتصادی، معاشی یا معاشرتی وغیرہ موضوعات غزل کے پیرایہ میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ بہت غوروخوض کے بعد شعر کہتے ہیں۔ مستقل مزاجی اور سنجیدگی سے فکر اور فن کی گہرائی میں ڈوب کر کہتے ہیں۔ وہ حقیقت پسند شاعر ہیں۔ ان کے اشعار بصیرت اور آگہی کا دَروا کرتے ہیں۔ انہیں حد بندی پسند نہیں۔ گروپ بندی کے سخت مخالف ہیں۔ وہ کسی تحریک سے وابستہ نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں کسی نظریہ سے وابستگی کے اثرات نہیں ملتے۔ شاید اسی لئے انہیں دنیائے ادب میں وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جس کے وہ مستحق ہیں۔ ان کا کلام عام آدمی کا احساس نامہ ہے۔ ان کے ہاں ذہنی مسائل زندگی کی دھوپ چھاؤں، خوشی، غم ، مسکراہٹ، آنسو غزل کے تمام موضوعات ہیں۔ سماج اور قوم کے دکھ درد ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔ اس میں فن کے ساتھ ساتھ ان کی ریاضت، محنت، وفاداری بھی شامل ہے۔ غزل میں ذاتی تجربات اور مشاہدات کے علاوہ قرب و جوار بلکہ دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کے احساسات کو بھی غزل کا جامعہ عطا کرتے ہیں۔ وہ موجودہ دور کی اچھائیوں اور برائیوں یعنی سچّائیوں کو واضح کرتے ہیں۔ ان کی ذات کی طرح ان

کی غزل بھی سیدھی سچی، کھری اور سلجھی ہوتی ہے۔غزل کو اس طرح سہل کرنا سہل نہیں ہے۔اس میں سخت ریاضت، ایمانداری، خلوص اور وفاداری کی ضرورت ہوتی ہے۔صابرؔ گوالیاری کا ایک مقطع ہے۔

مجھے اس امر کا دعویٰ نہیں مگر صابرؔ
جو دل کو چھو کے نہ گزرے وہ شاعری تو نہیں

ان کے کلام میں مبالغہ آرائی، طرفداری نام کو نہیں۔اس میں سوچ ہے، فکر ہے، تخیل ہے، خلوص ہے، عشق ہے، انسان دوستی ہے، حق پرستی ہے۔ قوافی کو وہ تجربہ کی بنا پر خیال کے مطابق، ضرورت کے پیش نظر استعمال کرتے ہیں جو ایک فنکار ہی کر سکتا ہے۔نظم کے ساتھ ساتھ ان کا قلم نثر بھی لکھتا ہے۔وہ سرائیکی (ملتانی) میں بھی کہتے ہیں اور بہت خوب کہتے ہیں۔

موصوف کا کلام موقر اور معیاری رسائل میں اکثر و بیشتر شائع ہوتا رہتا ہے۔دانشورانِ ادب ان کے کلام کو نہایت مستحسن نظروں سے دیکھتے ہیں۔ علمی اور ادبی خدمات میں ان کا ایک حصہ ہے ابھی تک ان کی ۱۶ کتابیں، ۳۰ مضامین اور ۱۵ کے قریب تبصرے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اردو شعر و ادب میں جناب چاندؔ، چاند بن کر چمک رہے ہیں۔موصوف کو کئی انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔نمونہ کلام:

رباعی

شنوائیِ فریاد کی اُمید نہ رکھ
حق بات پہ بھی صاد کی اُمید نہ رکھ
جینا ہے جو زندوں کی طرح دنیا میں
اپنوں سے بھی امداد کی اُمید نہ رکھ

قطعہ

نشاط و عیش بھی لازم ہیں آدمی کے لیے
بغیر اَلم کے مگر زندگی ادھوری ہے
غموں کا بوجھ اُٹھانا کٹھن سہی لیکن
غموں کا بوجھ اُٹھانا بہت ضروری ہے

متفرق اشعار

اک ذرا سی بات پر کیونکر تعلق توڑ دوں
وہ پرانا یار بھی ہے، میرا ہم سایہ بھی ہے

تعلقات کی ڈوری ہی کٹ نہ جائے کہیں
اسی غرض سے اُسے میں نے پھر منایا ہے

بس اسی بات پہ بَرہم ہے زمانہ ہم سے
اپنے بدخواہوں کا بھی ہم نے بھلا مانگا تھا

رنج و غم سے جو ہمکنار ہوئی
زندگی اور باوقار ہوئی

بیتی رت کب لوٹ کے آئی؟ کب آشا کے پھول کھلے؟
چاندؔ ہمیں معلوم ہے پھر بھی آس لگائے بیٹھے ہیں

دوستو شاید ہمیں آداب سے واقف نہیں
آپ کے آداب سے ہم کو یہ اندازہ ہوا

ان کی شاعری میں کہیں ریزہ خیالی نہیں ہے جس کا الزام اکثر شاعروں پر لگایا جاتا ہے۔ان کی نظمیں بھی بے حد جاندار ہیں۔''آزارِ غمِ عشق'' میں ''بہ نقطۂ نظر'' کے علاوہ ''مذہبِ انسانیت''، ''نذرِ حسین''، ''اجنبی ہوائیں''، ''سونامی لہریں اور خدائی قہر'' وغیرہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔چند نمونے:

ہزاروں بچے جو اس قہر میں یتیم ہوئے
گناہ و جرم سے بیچارے آشنا کب تھے
ہزاروں عورتیں وہ جن کے لٹ گئے ہیں سہاگ
ہزاروں کنبے جنہیں ڈس گیا سمندری ناگ
شکستہ حال تھے یکسر غموں سے چور تھے وہ
یہی قصور تھا ان کا کہ بے قصور تھے وہ
پھر اپنی شانِ کریمی دکھا دے یا اللہ
پھر ان کے اجڑے ہوئے گھر بسا دے یا اللہ

(سونامی لہریں اور خدائی قہر)

گھر جلا جس کا وہ اپنا ہی تو ہمسایہ ہے
مال غیروں کا نہیں قوم کا سرمایہ ہے
آؤ سوچیں ذرا اس بات کا احساس کریں
آؤ سب مل کے چلیں

(وقت کی آواز)

ہم ہر المیہ پر خدا کو کوستے ہیں اور کئی سوالات بھی کرتے ہیں مگر آخر کار سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔اس میں کتنا سچ ہے:

کیجیے کتنی بھی خواہ چیخ و پکار
لیکن اے چاندؔ ہم کو آخر کار
پھر اسی در پہ آنا پڑتا ہے
پھر وہیں سر جھکانا پڑتا ہے
غم بھی دیتا ہے وہ، خوشی بھی وہی
کم نگاہی بھی، آگہی بھی وہی

☆

''روشنی کا سمندر''

چاند صاحب کے نظمیہ کلام سے مختصر انتخاب

اجنبی ہوائیں

(امریکا میں قیام کے دوران کہی گئی)

دیارِ غیر ہے اور اجنبی ہوائیں ہیں
فضا میں گہراُداسی کا دل گداز دھواں
یہ کس مقام پہ لائی میری حیات مجھے
جہاں ہیں یوں تو ہزاروں نشاط کے ساماں
بپا ہیں پھر بھی مِرے دل میں کرب کے طوفاں

یہ روشنی کا سمندر، یہ ریل پیل، یہ شعور
بہت ہی تیز ہے رفتار ہر بشر کی یہاں
رواں دواں ہیں یہاں لوگ جو ادھر سے اُدھر
خبر نہیں یہ ہیں کس کی تلاش میں گرداں!
خدا ہی جانتا ہے اِن کی منزلیں ہیں کہاں!

یہاں کے لوگ یقیناً بہت موڈّب ہیں
اک ایک شخص یہاں ہے بہت سلیقہ شعار
بہت ہی خوب ہے ان کی ادائے عجز و نیاز
بہت ہی نیک ہیں ہر شخص کے یہاں اطوار
بہت کمال یہاں ہر بشر کی ہے گفتار!

بجا یہ ان کا سلیقہ، بجا یہ ان کا شعار
مگر دلوں میں کہیں بھی یہاں وہ بات نہیں
نہ وہ خلوص، نہ وہ دوستی، نہ اپنا پن
یہ دن وہ دن نہیں۔ یہ رات بھی وہ رات نہیں
میرے وطن کی طرح کی یہ کائنات نہیں

پرائے دیس کی اِن اجنبی ہواؤں میں
عجب طرح کی مجھے ہو رہی ہے آج گھٹن
دیارِ غیر میں اے چاؔند! جی نہیں لگتا
کوئی بھی رنگ ہو اپنا وطن ہے اپنا وطن
کوئی بھی ڈھنگ ہو، اپنا وطن ہے اپنا وطن

روپا صباؔ (چنڈی گڑھ، بھارت)

نذرِ کروڑ

مِرے کروڑ کی پاکیزہ سرزمیں! تجھ کو
ترے دیار کا شاعر سلام کرتا ہے
جھکا کے اپنی جبینِ نیاز ترے حضور
زبانِ شعر میں تجھ سے کلام کرتا ہے

تری زمیں پہ ولادت کا ہے شرف مجھ کو
تری فضاؤں سے رشتہ ہے میرے بچپن کا
ابھی تو بارہ بہاریں ہی میں نے دیکھی تھیں
کہ تجھ سے دُور مشیت نے مجھ کو پھینک دیا

خدائی قہر تھا یا کھیل تھا سیاست کا
یہ میری کم سنی اُس وقت کچھ سمجھ نہ سکی
بڑا ہوا تو نیا وقت تھا نئے حالات
مری نگاہ تری دید کو ترستی رہی

نئے دیار میں جب جب ترا خیال آیا
تو ایک برق سی قلبِ حزیں پہ لہرائی
میں تجھ سے پوچھتا ہوں اے مرے عزیز وطن!
تجھے بھی کیا کبھی بچھڑے ہوؤں کی یاد آئی؟

نہیں، نہیں، نہیں، تو بھی ملول ہے اب تک
ہے تیرے دل میں بھی قائم ابھی مری تصویر
یہ تیری دید کی حسرت جو آج تک ہے جواں
تری فضاؤں کی جذب و کشش کی ہے تاثیر

وہ گھر وہ کُوچے، وہ گلیاں، وہ رہ گذار ترے
ہیں دل پہ نقش، انہیں کس طرح بھلاؤں میں؟
نصیب ہو ترا دیدار، بس دعا ہے یہی
جبیں پہ خاکِ مقدس تری سجاؤں میں

کیفِ اِنتظار

سیاہ رات کی پھیلی ہوئی یہ خاموشی
فضا میں چاروں طرف یاسیت کا سکّہ رواں
تمہاری راہ میں حائل ہیں سخت دیواریں
مری نگاہ کو پھر بھی ہے دید کا ارماں

خیالِ دید میں کب سے ہیں فرشِ رہ آنکھیں
نہ جانے کتنا ابھی انتظار کرنا ہے!
ابھی تو کتنی ہی راتوں کو جاگنا ہے مجھے!
ابھی تو کتنے ہی ادوار سے گزرنا ہے!

تمہارا حُسنِ تصوّر ہے مرکزِ تخیل
تمہاری یاد کی خوشبو ہے ہر نفس میں رواں
اگرچہ دردِ جدائی ہے دل پہ بار، مگر
مِری نگاہ میں ہے خوابِ دید بھی رقصاں

شبِ فراق کی آخر سحر بھی آئے گی!
کبھی تو وصل کی صورت نکل ہی آئے گی!

○

رفیقۂ حیات کی مرگِ ناگہاں پر

(۱۲؍نومبر ۲۰۰۹ء)

پلک جھپکتے ہی تو نے جو مُوند لیں آنکھیں
کسے خبر تھی کبھی اب یہ کھُل نہ پائیں گی!
مری صدائیں، مِری آہیں، میری فریادیں
فلک کو چھو کے بھی ناکام لوٹ آئیں گی!

جوان بیٹے کی بے وقت موت نے تجھ کو
دئے وہ زخم کہ جو تاحیات بھر نہ سکے
میں جانتا ہوں یہی جاں گداز گھاؤ تجھے
مآلِ کار بہت دُور لے گئے مجھ سے

وہ ہم نوائی ۔ وہ راز کی باتیں
بھلی سی لگتی تھیں فہمائشیں بھی مجھ کو تری
ہر ایک بات تری تھی قبول تر مجھ کو
ہزار حیف! وہ سب چھن گئی متاع مری

ہماری زندگی تھی یوں تو خوش گوار مگر
ضرور میں نے تجھے رنج بھی دئے ہوں گے
ترستی رہ گئی ہوں گی کئی تمنائیں
بہت سے ولولے پامال بھی ہوئے ہوں گے

یہ سُونا سُونا سا گھر، رات کا یہ سنّاٹا
تجھی کو ڈھونڈتی ہے بار بار میری نظر
رہِ حیات کا ہارا ہوا مسافر ہوں
ترے بغیر ہر اک راہ بند ہے مجھ پر

مگر یقین ہے مجھے، تجھ کو جب بھی پاؤں گا
خطائیں جو بھی ہوئیں مجھ سے ۔ بخشوا لوں گا

تم اور تمہارا چہرہ

تمہارا چہرہ ہے جیسے کہ ایک ماہِ تمام
لکھے ہیں اس پہ ہزاروں محبتوں کے پیام

نقوش اس کے سبھی ہر گھڑی نکھرتے رہیں
ہمیشہ اس پہ رہے مُسکراہٹوں کا قیام

سمیٹ لوں میں تمہاری اُداسیاں ساری
سبھی مسرتیں اپنی کرُوں تمہارے نام

تمہاری سوچ کی پرواز پر میں نازاں ہوں
تمہاری فکر، تمہاری صلاحیت کو سلام

خدا قبول کرے میری اس تمنا کو!
اُبھر رہی ہے جو دل میں یہ خواہشِ بے نام

بکھرنے پائے نہ خوشبو کبھی یہ رشتوں کی
مہک تمہاری وفا کی نہ ہو کبھی بدنام

یہ آرزو ہے رہے رُوبرُو ہمیشہ مرے
تمہارے چہرے کو پڑھتے ہوئے ہو عمر تمام!

O

بیت چلی ہے ساون رُت بھی۔۔۔

(برہا گیت)

بیت چلی ہے ساون رُت بھی
آس نہیں اُس کے آنے کی
دھیرج میرا ٹوٹ رہا ہے
من میں اک طوفان مچا ہے
ہچکی پر ، ہچکی پر ، ہچکی
بیت چلی ہے ساون رُت بھی
آس نہیں اُس کے آنے کی

راہ میں نین بچھے رہتے ہیں
پلکوں میں آنسو بہتے ہیں
جان مرے ادھروں پر آئی
بیت چلی ہے ساون رُت بھی
آس نہیں اُس کے آنے کی

موہ لیا اُس کا من کس نے؟
میری سُدھ بسرائی جس نے
کون ہے جگ میں مجھ پاپن سی؟
بیت چلی ہے ساون رُت بھی
آس نہیں اُس کے آنے کی

O

تمہاری ایک ہم شکل کو مائل بہ کرم دیکھ کر۔۔۔

کون پھر آیا ہے چپکے سے مرے خوابوں میں؟
ہاں وہی خواب کہ جن کی کوئی تعبیر نہیں
کس نے ہمدرد نگاہوں سے یہ دیکھا مجھ کو؟
میں تو سمجھا تھا مری اب کوئی توقیر نہیں!

وہی انداز، وہی حُسن، وہی طرزِ ادا
وہی معصوم تبسم، وہی سادہ لباس
وہی بہتے ہوئے جھرنوں کی سی پُر کیف آواز
وہی اندازِ تکلّم، وہی لہجے کی مٹھاس

شعر وفن سے بھی محبت ہے اُسے تیری طرح
ساز و نغمہ سے بھی آراستہ ہے اُس کا شعور
اُس کی ہر بات پہ کچھ ایسا گماں ہوتا ہے
جس طرح اُس کو تعلق ہے کوئی تجھ سے ضرور

کس قدر تجھ سے مشابہ ہیں نگاہیں اُس کی
تیرتی رہتی ہے جن میں وہی پاکیزہ حیا
اور اُن جھیل سے آنکھوں میں جھلک اٹھتے ہیں
وہی پیغامِ محبت، وہی پیمانِ وفا

اُس کا مسرور تبسّم بھی ہے کیا سحر طراز
دیکھ کر جس کو مری روح پہ چھاتا ہے فسُوں
دھڑکنیں اور بھی کچھ تیز سی ہو جاتی ہیں
پڑھ کے اُن شوخ نگاہوں کا انوکھا مضموں

سوچتا ہوں کوئی مجھ سے نہ خطا ہو جائے
ٹوٹ جائے نہ کہیں حُسن کا معصوم سا دل
میری تقدیر میں جب غم کے سوا کچھ بھی نہیں
دبی چنگاریاں سلگانے سے پھر کیا حاصل؟

سوچتا ہوں یہ مرا شوق، یہ بیتابئ دل
پیش خیمہ ہو کہ اک تازہ تباہی کے لیے
میری فطرت کو کسی طور یہ منظور نہیں
حُسن بدنام ہو ناکردہ گناہی کے لیے

میں یہی سوچ کے اُس رہ سے پلٹ آیا ہوں
پھر وہی میں ہوں، وہی غم، وہی تنہائی ہے
اور یہ دل میں جو کچھ زخم ہیں پھر تازہ سے
میں نے کچھ تازہ خطاؤں کی سزا پائی ہے

آہ! پھر چھانے لگے یاس و الم کے بادل
کرب و اندوہ سے آنکھیں بھی مری پُرنم ہیں
ہاں، مگر دل کا بہلنا تو کوئی بات نہیں
دل کے بہلانے کو یادیں بھی تری کیا کم ہیں!

○

ننھے فرشتے

(اپنے مرحوم بیٹے پیارے وویک کی یاد میں اُس کے دونوں بچوں عزیزی سدھارتھ (چنٹو) اور عزیزی سواتی (گڑیا) کے نام)

ظلمتِ غم میں نُور بار ہو تم!
میرے بیٹے کی یادگار ہوتم!
وقت نے ہم پہ کیا ستم ڈھایا!
چھن گیا تم سے باپ کا سایا
کس قدر نیک تھا تمہارا باپ!
لاکھ میں ایک تھا تمہارا باپ
صاف دل، صاف گو، حسیں اطوار
خوش اُدا، خوش کلام، خوش گفتار
دیوتا تھا وہ جانِ محبوبی
موت اُس کی ہمیں بھی لے ڈوبی!
ماں تمہاری بھی ہو گئی تنہا!
عمر بھر کا جو ساتھ تھا، نہ رہا!
دادا، دادی اِدھر ہیں غم سے نڈھال
اور اُدھر سوگوار ہے ننھیال
ہم بھی کیا بدنصیب ہیں کہ اُسے
آخری وقت دیکھ بھی نہ سکے!
نہ ہوئی دل کی آرزو پوری!
اب تو جینا ہے ایک مجبوری!
اپنا دامن بھگو نہیں سکتے!
پاس تم ہو تو رو نہیں سکتے!
چھپ کے کرتے بھی ہیں جو آہ وفغاں
اور بڑھتا ہے اس سے سوزِ نہاں

جب سے ''فردوس'' بے چراغ ہوا
سینہ ہم سب کا داغ داغ ہوا
قہر ڈھاتی ہے اب یہ تنہائی
خوں رُلاتی ہے اب یہ تنہائی
خواب میں بھی کبھی نہ سوچا تھا
ہم پہ ایسا بھی وقت آئے گا!
غیر ہو جائیں گے جہاں والے
یوں ستم ڈھائیں گے جہاں والے!
کس قدر فتنہ کار ہے دنیا
اپنے مطلب کی یار ہے دنیا
ایسی دنیا سے تم پرے رہنا
اور نیت کے تم کھرے رہنا
تھام کر رکھنا دامنِ امید
کامیابی کی بس یہی ہے کلید
سر جھکائے ہوئے نہ رہنا کبھی
خود کو بے آسرا نہ کہنا کبھی
اپنے ہی اعتماد پر جینا
پاک رکھنا چلن کا آئینہ
آبرو تم ہو جس گھرانے کی
اُس کا مسلک رہا سدا نیکی
اپنے باطن کو صاف رکھنا تم
ہر بدی کے خلاف رکھنا تم
نہ کبھی دل میں بَیر کو لانا
نہ سمجھنا کسی کو بیگانا
زندگی مشکلوں بھرا ہے سَفر
اس کو طے کرنا ہو کے سینہ سپَر
ہوش اپنے بحال رکھنا تم
اپنی ماں کا خیال رکھنا تم
دل میں لانا کبھی نہ حزن و ملال
تم پہ لازم ہے صبرو استقلال

کتنا ہی کیجیئے یہ چیخ پُکار
لیکن اے چاند! ہم کو آخر کار
پھر اُسی در پہ آنا پڑتا ہے
پھر وہیں سر جھکانا پڑتا ہے
رنج دیتا ہے وہ، خوشی بھی وہی
کم نگاہی بھی، آگہی بھی وہی

اُس خداوند سے یہی ہے دعا!
خضر کی زندگی ہو تم کوعطا!
تم بڑے ہو کے کامیاب بنو!
بے مثال اور لاجواب بنو!
بزمِ عالم میں انتخاب بنو!
اہلِ فن، صاحبِ کتاب بنو!
حُسنِ اخلاق سے جہاں بھر کو
تم ہمیشہ ہی روشنی بخشو!

ہو بھلا تم سے اس زمانے کا!
نام اونچا ہو اس گھرانے کا!
آمین!

''شہرت کے بہانے''

عطیہ سکندر علی
(سکھر)

چاند متحدہ پنجاب کے نوجوان شعراء کے راہنماؤں میں سے ہیں اگر چہ وہ غزل کے شیدا ہیں۔ غزل جو شاعری کی ابتدا ہے اور انتہا بھی۔ لیکن دوسرے اصنافِ سخن پر بھی اُنہیں یکساں عبور حاصل ہے ان کی شاعری فصاحت و بلاغت کی آئینہ دار ہے۔ وہ مضمون کے مطابق منتخب الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ خوبی حسنِ طبع کا ثبوت ہے ان کا اندازِ بیاں شگفتہ ہے۔ زبان شستہ، خیالات کی بلندی، سونے میں خوشبو۔ ان کے اشعار محاسنِ شعری سے مالا مال ہوتے ہیں۔ بغیر یاد کیے یاد ہو جاتے ہیں۔ وہ متروکاتِ سخن، قواعد زباں اور اُصولِ فن کے سختی سے پابند ہیں۔

چاند صاحب کے کلام میں عامیانہ بل کہ عام رنگ نابُود ہے۔ وجہ یہ کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اُن کا مطالعہ وسیع ہے اور گہرا بھی۔ اُن کا کلام تصنّع اور تکلّف سے پاک ہوتا ہے، عام فہم اور خاص پسند۔

چاند میرے ہی عزیز ہیں مجھی سے مشورۂ سخن کرتے آئے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ چاند کا مذاقِ سخن بہت سلجھا ہوا ہے وہ لکیر کے فقیر نہیں جہاں وہ گمراہ ترقی پسندی اور جدت کے قائل نہیں وہاں روایت کی بنیادی خوبیوں کو وہ نظر انداز نہیں کرتے۔۔۔ ان کا ترنم سحر پرور اور دل کش ہے۔ ان کی نظموں، رباعیوں اور قطعوں میں بھی رنگِ تغزل کی جھلک نمایاں ہے۔ ادب کی اُمیدیں اُن سے وابستہ ہیں۔

(علامہ قیس جالندھری)

''خوش فکر و ہونہار شاعر چاند اپنی علمی وفنی برتری کی وجہ سے پنجاب اور ہریانہ کے شعرا کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں اور شاعری کی ہر صنف پر قدرت کے ساتھ انداز بیان میں ندرت کے حامل ہیں''

(سید القلم پدم شری برہم دت قاصر)

آج تک دنیا محض اسی چاند سے روشناس تھی جسے عربی میں نیّر اصغر، فارسی میں ماہ، سنسکرت میں اندو، انگریزی میں مُون اور اردو میں چندرماں کہا جاتا ہے جو بُرج سرطان کا مالک ہو کر ہماری تیرہ و تاریک راتوں کو روشن کرتا، ٹھنڈک پہنچاتا اور فصلوں اور پھلوں میں رس پیدا کرتا ہے لیکن اب ایک چاند کوروکشیتر کے مقدس و منزہ افق سے نمودار ہوا ہے جس نے اپنی برق پاش درخشانیوں اور نور ریز تابانیوں سے دنیائے شعر و ادب کو منور و مسحور کر رکھا ہے اس کے کلام کی سلاست ونفاست، فصاحت و بلاغت، روانی و شیریں بیانی، حلاوت و معجز بیانی، دل کش و دل آویزی، دل پذیری و شکر ریزی سادگی و جوش دشمنِ صبر و ہوش ہے۔ چند چچے تُلے الفاظ میں بہت بڑی، طویل ترین اور پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ کنایہ اور قرینہ ان کا خاص وصف ہے۔

(رتن پنڈوروی)

1989-90 میں ہریانہ اردو اکادمی کی مالی امداد سے جو مسودے شائع ہو رہے ہیں ان میں جناب مہندر پرتاپ چاند کا مسودۂ شاعری ''حرفِ آشنا'' بھی شامل ہے جس میں شاعر نے زندگی کی بے ثباتیوں، سماجی کشمکشوں اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ان کی غزلیں جدید و قدیم کا بہترین امتزاج ہیں جس میں ہندوستان کی گنگا جمنی زبانوں کا عکس واضح طور پر جھلکتا ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مجموعہ ''حرفِ آشنا'' عہدِ حاضر کی ایک اہم ضرورت کو پیش کرتا ہے۔ سادہ و شستہ زبان کا نہایت ہی چابکدستی سے استعمال کیا گیا ہے۔ یقین کامل ہے کہ اکادمی کی مالی امداد سے شائع یہ مسودہ اُردو شعر و ادب میں اہمیت کا حامل ہوگا۔

(کشمیری لال ذاکر)

جب آپ غزل پڑھ رہے تھے تو میں توجہ اور حیرت سے سن رہا تھا۔ حیرت اس بات کی تھی کہ یہ زبان، یہ بندشیں، یہ سادگی و پرکاری، یہ روانی تو سب ہمارے گھر کی چیز ہے۔ جس تک کسی چاند یا سورج کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ پھر اس چاند نے کس طرح چھاپہ مار کر ہمارے مال پر قبضہ کر لیا اور پھر معلوم ہوا کہ آپ برادرم قیس صاحب کے شاگرد ہیں تو تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی۔ خوب محنت کیجیے اور ہمارے خاندان کا نام روشن کیجیے۔

(مولانا ابرا حسنی گنّوری)

خوش خلق و خوش اطوار انسان اور خوش فکر و خوش گفتار شاعر کے امتزاج سے جو پیکر ابھر کر سامنے آتا ہے اس کا نام ہے مہندر پرتاپ چاند۔ ۳۵ برس کی ریاضت اور دبستان داغ کے ممتاز سخن ور جناب امر چند قیس جالندھری سے رشتہ تلمذ نے ان کے فکر و فن کو جلا بخشی ہے۔ یہ جلا لائق رشک بھی ہے اور داد سے مستغنی بھی۔ سادہ زبان اور سلیس طرز بیان میں وہ اپنے رنگین و سنگین تجربات کا اظہار کرنے میں ہر لحاظ سے کامیاب ہیں۔

غزلوں، نظموں اور قطعات پر مشتمل ان کا تیسرا مجموعہ کلام ''حرفِ آشنا'' زیرِ اشاعت ہے۔ موضوعات اور مواد کے اعتبار سے اس مجموعے کے افکار میں انسانی قدروں اور معاشرے کے گہرے شعور کی ترجمانی جھلکتی ہے۔ حسن وعشق کے معاملات ہوں یا سماجی اور معاشرتی حقیقت پسندی کے اثرات، چاند نے ان کو صرف محسوس ہی نہیں کیا بلکہ برتا اور پرکھا بھی ہے۔ ان کی شاعری

کا امتیازی پہلو تہذیبی زندگی کے مسائل کو منصفانہ نظریے سے دیکھنے اور ممکنہ حد تک اُن کا حل تلاش کرنے میں مضمر ہے۔ وہ مبلغ و مصلح بھی نہیں ہیں کہ ان مسائل میں آفاقیت تلاش کی جائے۔ وہ اپنی ذات اور اپنے اردگرد کی جیتی جاگتی زندگی سے وابستہ ماحول کو جس شکل میں دیکھتے ہیں اس کو شعر کے قالب میں ڈھال کر پیش کر دیتے ہیں۔

(ساحر ہوشیار پوری)

مہندر پرتاپ چاند صاحب میرے ہم وطن بھی ہیں اور عزیز دوست بھی۔ پاکستان میں ہمارا تعلق ایک ہی ضلع (مظفر گڑھ) سے تھا۔ یوں تو چاند صاحب سے کئی علمی و ادبی تقاریب میں ملاقات کے مواقع میسّر آتے رہے ہیں لیکن انہیں زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے اُس وقت ملا جب اکتوبر ۲۰۱۰ء میں قریب دو ہفتوں کے لیے ہم ایک ساتھ اپنے وطن کی زیارت کے لیے پاکستان گئے تھے۔ اور اس دوران میں میں نے جانا کہ وہ ایک مقبول و معروف شاعر و ادیب ہی نہیں بلکہ ایک نہایت نیک نفس اور فرشتہ سیرت انسان بھی ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اعلیٰ اخلاق کے مالک بھی۔ اب تک اردو، ہندی و انگریزی میں اُن کی لگ بھگ اٹھارہ کتابیں آچکی ہیں۔ نظم و نثر کے علاوہ وہ تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی تحریر فرماتے ہیں۔ حال ہی میں ان کے نہایت معیاری مضامین کے دو مجموعے شائع ہو کر آئے ہیں جن کی بھرپور پذیرائی کی گئی ہے۔ ہریانہ اردو اکادمی کے لیے انہوں نے جس ضخیم تحقیقی پروجیکٹ کو سرانجام دیا ہے وہ خاص طور پر لائق تحسین و آفرین ہے۔ میں اپنا دُعائیہ قطعہ ان کی نذر کرتا ہوں:

تیری خوشیوں کا پیالہ چھلکتا رہے
زندگی کا چمن بھی مہکتا رہے
چاند سورج ہیں جب تک فلک پر عیاں
تیری قِسمت کا تارا چمکتا رہے

(اودھے بھانو ہنس)

چاند صاحب کے ضخیم مقالے میں شعراء و ادباء کا ذکرِ خیر ہے جن میں سے بیشتر تقسیمِ ملک کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ اس مقالہ اور تلاش و جستجو نے کتاب کی قدر و قیمت میں ایک بیش بہا اضافہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ چاند کے اس جوشِ خدمت اور جذبہ و اشتیاق کی اگر خاطر خواہ داد نہ دی جائے تو یہ ان سے ناانصافی کی دلیل ہوگا۔ یہ مضمون مستقبل میں ان حضرات کے بے حد کام آئے گا جو تاریخ اردو ادب میں دل چسپی رکھتے ہیں اور ثبوت اور اثبات کے حوالوں کو اپنی تحریر کا محرک بنانا چاہتے ہیں۔ یہ مضمون ایک طرح کا ادبی سرمایہ ہے جو تعارفی تحقیق کا حرفِ آخر ہے۔

مہندر پرتاپ چاند کا اشہبِ قلم ان کی محنت اور ہمت کا جیتا جاگتا ثبوت اور ان کی تخلیقات کا حسین انتخاب ایک بے حد جاذب اور منفرد انداز و اسلوب کی مثال ہے۔ خدا سے دُعا ہے کہ وہ ان کی صلاحیتوں کے جوہر کو اور آبدار کرے۔ آمین

(کرشن کمار طور)

جناب مہندر پرتاپ چاند ایک سنجیدہ، سلجھے ہوئے، کہنہ مشق اور جہاں دیدہ شاعر ہیں۔ آپ کے یہاں داخلی اور خارجی دونوں طرح کی کیفیت کا اظہار ہے۔ آپ کے کلام میں اپنے علاقے سے محبت کی واضح جھلک ملتی ہے اور آپ عصری تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ جو بات کہتے ہیں وہ سادہ اور عام فہم ہوتی ہے اور مضمون کو ابہام سے پاک رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہی خصوصیات اُنہیں ریاست کے دوسرے شعراء سے ممیز و ممتاز کرتی ہیں۔

(شمس تبریزی)

جناب مہندر پرتاپ چاند کا اسم گرامی اور قدر آور شخصیت ادبی دنیا میں کسی تعریف کی محتاج نہیں ہے۔ بلکہ تعریف آپ کے قدموں میں شرف حاصل کرنے کو بے تاب رہتی ہے۔ آپ ایک مخلص دوست، دردمند دل رکھنے والے انسان، محبت کے پیکر اور خلوص و وفا کے دیوتا ہیں۔ آپ کا کلام خوبیوں کا ذخیرہ حسن و بلاغت کا نمونہ، پُرکاری کا مجسمہ اور مہکتے ہوئے پھولوں کا سہرا اور اخلاقیات کا مجموعہ ہے۔ آپ جذبات کے پردے میں حقیقت افروز باتیں انتہائی جدّت کے ساتھ اس طرح بکھیر دیتے ہیں جن میں محسوسات کا حسن، جذبات کی رعنائی، خیالات کی جادوگری اور تاثرات کی رنگینی قدم قدم پر دیکھنے کو ملتی ہے۔

(بودھراج ظفر)

اگر چاند صاحب کے کلام کا مطالعہ دھیان سے کیا جائے تو دیکھیں گے کہ چاند "پیمبر" بھی ہیں "واعظ" بھی ہیں اور "خطیب" بھی۔ چاند نے بامقصد شاعری کی ہے۔ میں اپنے نظریہ کی پشتی میں مترنکودری صاحب کے کوٹ کیے ہوئے اشعار سے انصاف کرتا ہوں۔ قارئین خود فیصلہ کریں کہ ان اشعار میں پیغام ہے کہ نہیں:

کس کی شکایت کس سے کیجیے
حُسن بھی جھوٹا عشق بھی جھوٹا
نااہلیت اپنی کہ جو رسوائے جہاں بھی
حیرت ہے وہی آج کا سب سے بڑا فن ہے

(نامی انصاری)

مہندر پرتاپ چاند کے درجنوں ہم عصر روایت پرست شاعر اردو شاعری کے منظرنامہ سے کب کے معدوم ہو چکے ہیں کہ جدیدیت کی لہر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ان کے بس کا روگ نہ تھا جدیدیت کی طبع زاد و تازہ کار تحریک نے اردو شاعری کا تصور ہی بدل ڈالا تھا۔ یہاں جدیدیت سے مراد بلاشبہ بامعنی جدیدیت سے ہے جو گذشتہ چالیس برسوں سے دنیا میں کامیابی سے رائج ہے اور مسلسل ارتقا پذیر ہو کر آج جدید ترین شاعری کہلاتی ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ مہندر پرتاپ چاند نے نہ تو روایتی شاعری ہی کی کورانہ تقلید کی اور نہ ہی بے راہ روجدیدیت کا خود کو مطیع کیا بس ان کے حساس دل نے جو کچھ ان سے لکھوایا انہوں نے وہی کچھ لکھا شاید یہی وجہ ہے کہ مہندر پرتاپ چاند آج بھی ایک سچے شاعر کے طور پر زندہ ہیں اور جانے پہچانے جاتے ہیں۔

(پروین کماراشک)

جناب مہندر پرتاپ چاند کو میں ایک طویل مدت سے جانتا ہوں۔ پچھلے چند سالوں میں ادبی تقاریب اور مشاعروں کے سلسلے میں اُن سے ملاقات کے بیشتر مواقع میسر آئے ہیں۔ آپ نہایت بااخلاق، شریف النفس اور حلیم الطبع انسان ہیں۔ ہر تازہ ملاقات کے بعد میرے دل میں اُن کے لیے محبت اور عزت میں اضافہ ہوا ہے۔

بطور ادیب اور شاعر آپ محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ جس خلوص اور انہماک سے آپ ادبی ریاضت میں مشغول ہیں اُسے دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ بہت جلد آپ دنیائے ادب کے افق پر چاند بن کر جلوہ ریز ہوں گے اور آپ کی نگارشات سے اردو ادب میں قابل قدر اضافے ہوں گے۔

(نوبہارصابر)

چاند کے کلام کو غزلوں تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ہر چند کہ غزل اُن کی محبوب ترین صنفِ سخن ہے لیکن انہوں نے نظمیں بھی اعلیٰ درجے کی کہی ہیں۔ یہاں بھی سادگی و پرکاری کا وہی امتزاج ہے۔ یہاں بھی زبان میں نفاست، لطافت ومعنی آفرینی جیسے اوصاف موجود ہیں اور یہ نظمیں سب کی سب پابند نظمیں ہیں۔

(آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر)

چاند صاحب کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک شاعر کو اس کے ہم عصر شاعروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ انہوں نے شاعری میں محنت نہیں بلکہ ریاضت کی ہے۔ وہ بڑے خلوص اور ایمانداری سے برسوں سے شعروفن کی عبادت میں مصروف ہیں۔ ان کے ہاں آمد ہے آورد نہیں۔ اسی لیے وہ نام نہاد جدیدیت اور بے راہ روی کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ اگر چہ اُن کے کلام میں جدت بھی ہے اور نغمگی بھی۔ وہ اپنے ماحول پر گہری نظر رکھتے ہیں اور گردوپیش رونما ہونے والے واقعات کو شعری پیکر عطا کر کے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ اُن کے کلام میں مضمون آفرینی، شگفتگی اور بادصبا کی سی نرمی ہے۔ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا ہے ان کے کردار اور گفتار میں کوئی تضاد نہیں۔ قارئین کو میرے اس خیال کی تائید کرنا پڑے گی کہ وہ شعر کہتے نہیں بلکہ شعرا پنے آپ کو ان سے کہلواتے ہیں اور یہ سعادت کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔

(عرش صہبائی)

مہندر پرتاپ چاند کا شعری مجموعہ ''حرفِ آشنا'' غزلیات اور منظومات پر مشتمل ہے، جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے جس میں قدیم وجدید کا حسین امتزاج ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا کیف ملتا ہے۔ انھوں نے عام فہم، آسان اور سادہ الفاظ کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔ چاند کبھی کبھی اپنی غزلوں کے توسط سے اشارہ اور کنایہ میں بڑی سے بڑی بات کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

(محمد تقی علی عابدی)

غزلوں کے اشعار تو سادگی، حقیقت اور جوش کے حامل ہیں ہی منظومات میں بھی چاند صاحب نے بہت خوبی کے ساتھ اپنے جذبات کا کامیاب اظہار کیا ہے۔ ''نذرِ جاناں'' ''تمہاری ہم شکل کو مائل بہ کرم دیکھ کر'' ''کیف انتظار'' بہت خوب ہیں۔ ''سب سے بڑا خراجِ عقیدت'' میں انہوں نے بہت سادہ اور عام فہم زبان میں آنجہانی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو بہت موزوں الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ''برہا کے گیت'' میں بہت نفیس اور نازک انداز میں نازک جذبات اور ہجر کی ذہنی خلش کی تڑپ قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ مجموعہ ''حرفِ آشنا'' زندگی کے ہر جذبے کا حامل ہے اور ہر قاری کے لیے ذہنی اور ادبی تسکین کا سرچشمہ ہے۔ ''میری امّی''، ''بچوں کے غم'' کے ذریعہ بچوں کے جذبات کی صحیح عکاسی اور خیالات کی ترجمانی کافی مشکل کام ہے جو انھوں نے بہت سادگی کے ساتھ بچوں کی زبان میں کی ہے اور سیکولرزم کا بروقت سبق پڑھایا ہے۔ چاند آج کے دور میں یعنی اس بے حسی کے دور میں کامیاب حساس شاعر تو ہیں ہی ایک بہت نیک ملنسار خوش گفتار انسان بھی ہیں جو اپنے کلام کے ذریعہ قارئین کو ذہنی خوراک فراہم کر دیتے ہیں۔

(لوک ناتھ سلوچہ)

میں سمجھتی ہوں کہ اردو زبان کے ناز بردار غیر مسلم ادباء اور شعراء کی اگر ایک فہرست مرتب کی جائے تو اس کے لیے کئی ضخیم جلدیں درکار ہوں گی۔ اردو زبان کے فروغ میں جتنا مسلمانوں نے حصہ لیا ہے اس سے کہیں زیادہ حصہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے لے کر اسے سیکولر سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی ہے۔ اردو کے ایسے ہی غیر مسلم عاشقوں کی فہرست میں ایک نام جو گذشتہ نصف صدی سے آسمانِ ادب پر مہر درخشاں کی طرح روشن ہے مہندر پرتاپ چاند کا ہے۔ وہ صاحبِ اسلوب نثر نگار بھی ہیں اور صاحبِ طرز شاعر بھی۔ انہوں نے محقق نقاد کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان بنائی ہے اور فن شاعری میں بھی اپنی صلاحیتوں کے غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں۔ ڈاکٹر رانا گنوری کے لفظوں میں اگر یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ:

شاعر بھی ہے، ادیب بھی، تحقیق کار بھی
میدانِ نظم ونثر کا ہے شہ سوار بھی

(ڈاکٹر درخشاں تاجور)

☆

''درودِ پاک کی برکت''

نعت

ہے برکت سبز گنبد کی، اُسی کی شان وشوکت ہے
یہ دنیا ایک صحرا ہے مدینہ باغِ جنت ہے

نہ جانے کتنے لوگوں نے یہ جنّت جا کے دیکھی ہے
مِرے آقاؐ مرے مالکؐ مدینہ دل کی راحت ہے

صبا کے ہاتھ میں نے التجائیں اس قدر بھیجیں
میں جا کے آپ دیکھوں گا مدینہ میری حسرت ہے

بُلا بھیجا ہے مجھ کو آپؐ نے آقاؐ زہے قسمت
مدینے کی گلی میرے لیے فضیانِ رحمت ہے

نہ جانے کتنے سالوں سے رہا میں منتظِر خواجہؐ
مگر الحمد اللہ آج جاگی میری قسمت ہے

درودِ پاک کی برکت نے مجھ کو اذن بخشا ہے
زہُیر اُٹھو تمہیں طیبہ میں آ جانے کی دعوت ہے

پروفیسر زہیر کنجاہی
(راولپنڈی)

نعت

چلن حیات کے آقا سکھا دئے توؐ نے
جو بے ادب تھے مؤدّب بنا دئے توؐ نے

بشر کو پھر سے کیا آشنائے ربِّ جلیل
حجاب صدیوں کے آ کر اُٹھا دئے توؐ نے

ہر ایک رستہ جدا تھا، ہر ایک سوچ الگ
بکھر چلے تھے قبیلے، ملا دئے توؐ نے

مُہیب شب تھی، دلوں میں بڑا اندھیرا تھا
چراغِ مہر و محبت جلا دئے توؐ نے

جو کم اثاثہ گڈریے تھے دشت وصحرا کے
وہ تاجدارِ زمانہ بنا دئے توؐ نے

حسنؑ حسینؑ فاطمہؑ پہ جاں قربان
زمین پہ عرش کے تارے سجا دئے توؐ نے

بعید کیا ہے جو ذرّے کو توؐ کرے خورشید
جو کچھ نہ تھے وہ بہت کچھ بنا دئے توؐ نے

خورشید انور رضوی
(اسلام آباد)

نعتِ رسولِ مقبول

جہاں فضا کا مُقدّر بنی ہوائے کرم
وہیں سے اوڑھ کے آئی ہوں میں ردائے کرم

وہ جانتے ہیں ہمارا مرض بغیر کہے
وہ سُن رہے ہیں ہر اک درد کو برائے کرم

بھری ہوئی ہیں مرادوں سے جھولیاں اُن کی
مسافرانِ مدینہ ہیں آشنائے کرم!

مرے نصیب کا حصّہ ہے یہ مسرّت بھی
کہ رحمتیں مجھے ڈھونڈیں، مجھے بُلائے کرم

کرم کی آس لئے، دیر سے دُعا میں مگن
ہے انتظار میں گُم ، دیکھئے گدائے کرم

مدینہ آ کے کھُلا ہے کہ رحمتیں کیا ہیں
یہیں پہ آ کے نظر آئی انتہائے کرم

پکارتی ہے مدینے میں شوق کی شدّت
ہمارے پیار کا مرکز، ہماری جائے کرم

نورین طلعت عروبہ
(راولپنڈی)

نعت

چاند آئے نہ کوئی برج و ستارہ آئے
میری آنکھوں میں مدینے کا نظارہ آئے

جس کی آمد پہ کھُلے عرش بریں کے موسم
اس کے دربار میں جانے کا اشارہ آئے

ایسے پیاسے نہ کہیں پیاس بجھاتے دیکھے
ایسے بادل نہ کبھی بن میں دوبارہ آئے

مجھ پہ رہتی ہے سدا شاہِ مدینہ کی نظر
میرے دامن میں بھلا کیسے خسارہ آئے

بحرِ ہستی کے بھنور خود ہی بکھر جاتے ہیں
جب مدد کرنے مدینے سے کنارہ آئے

ہم کسی روز درِ پاک پہ بیٹھے ہوں عدیلؔ
کاش رونا یہ کبھی کام ہمارا آئے

ابراہیم عدیل
(جھنگ)

رنگوں کے پیچھے

رشید امجد

(راولپنڈی)

مخمصہ یہیں سے شروع ہوا تھا کہ ٹیبل کلنڈر کا ورق اُلٹتے ہوئے خیال آیا کہ دن نہیں بدلتا وہ خود بدل رہا ہے۔ٹیبل کلنڈر رکھنے کا چسکا بڑا پرانا تھا۔گھر میں یہ لاؤنج کی کارنس پر تھا اور دفتر میں میز پر۔واش روم سے نکل کر، کپڑے پہن کر ناشتہ کرنے سے پہلے وہ اس کا روق الٹتا، دفتر میں بھی کرسی پر بیٹھتے ہی اس کا پہلا کام ٹیبل کلنڈر کا ورق الٹنا ہوتا۔سال ختم ہونے سے کئی دن پہلے وہ بازار سے کلنڈر لے آتا۔یہ ایسا معمول تھا جس میں کبھی ناغہ نہ پڑتا، ہاں چھٹی والے دن دفتر کے ٹیبل کلنڈر کے صفحات الٹنے میں فرق پڑ جاتا۔

روز یوں ہی ہوتا تھا لیکن اُس روز دفعتہً احساس ہوا کہ وہ صفحہ نہیں الٹ رہا بلکہ اپنے آپ میں کوئی تبدیلی کر رہا ہے۔اب یہ معلوم پیش تھا کہ یہ تبدیلی آگے کی طرف ہے یا پیچھے کی طرف۔

''میں ہر روز ایک قدم آگے رکھ رہا ہوں یا پیچھے ہٹ رہا ہوں'' اپنے آپ سے پوچھا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

بچپن کی یادداشتوں میں ہجرت کا کرب شامل تھا لیکن وہ جس راستے اور جہاں سے آئے تھے وہاں مار دھاڑ اور خون خرابہ نہیں تھا لیکن ایک نہ سمجھنے والی اداسی ضرور تھی، کوئی شے جسے نام نہیں دیا جا سکتا تھا، پیچھے رہ گئی تھی آگے دھندلکا تھا۔

اب یہ سب باتیں اُس خواب کی سی تھیں جس کا کچھ حصہ یاد رہتا ہے اور کچھ بھول جاتا ہے۔یاد والے حصے میں ٹاٹ کے سکول میں داخلہ اور ماسٹر صاحب کا ڈنڈا۔پہاڑے یاد نہ ہونے پر صبح صبح سخت سردی میں ہاتھوں پر ہیئت کے لال نشان اور درد کی اینٹھن۔انگریزی کے پیریڈ میں گرائمر کے صحیح جواب اور استاد کی شاباس، بس یہی کھٹی میٹھی یادیں اب باقی تھیں۔تیزی سے آگے بڑھنے کا سفر، ملازمت، شادی، بچے، گھر، گاڑی ایک کے بعد ایک پڑاؤ سے آگے نکلنے کی تگ و دو اور ایسے ہی روز ٹیبل کلنڈر کا صفحہ بدلنے کا مطلب یہ تھا کہ ایک نیا دن شروع ہو گیا۔لیکن اُس روز احساس ہوا کہ نیا دن شروع نہیں ہوا، ایک اور دن گزر گیا اور اس گزرے دن کے ساتھ اس کے وجود میں بھی ایک تبدیلی آ گئی ہے۔مثبت یا منفی، اس کا اندازہ نہیں تھا۔

کہیں پڑھا تھا کہ ایک لمحے میں کوئی چیز جیسی ہوتی ہے اگلے لمحے میں ویسی نہیں ہوتی، تو ہر لمحے کے ساتھ وجود میں ایک تبدیلی آتی ہے اُس نے سوچا ''ایک لمحہ پہلے میں جیسا تھا، اس وقت وہ نہیں اور اگلے لمحے میں۔۔۔''

''یہ وقت کیا شے ہے؟'' اُس نے مرشد سے پوچھا ''جو لمحہ بہ لمحہ چیزوں کو بدلتا رہتا ہے اور آخر۔۔۔''

مرشد نے جملہ پورا ہونے کا انتظار کیا لیکن جب وہ چپ رہا تو بولا ''وقت ایک کیفیت ہے، وہ حقیقت بھی ہے اور خواب بھی''

''دونوں میں کیا فرق ہے؟''

''محسوس کرنے کا''

''تو میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک دن گزر گیا، یا شاید یہ کہ ایک نیا دن شروع ہو گیا'' وہ بڑبڑایا مرشد ہنسا۔۔۔''حالانکہ نہ کچھ گزرتا ہے نہ شروع ہوتا ہے''

''تو ہم ایک کیفیت میں ہیں'' اُس نے کہا

''اور پھر ہم ایک دوسری کیفیت میں چلے جائیں گے'' مرشد بولا

''تو یہ ساری کیفیتیں وقت ہی کے روپ ہیں''

مرشد نے اثبات میں سر ہلایا۔

ایک کیفیت حرکت اور روزمرہ کی تگ و دو کی ہے اور اس کے بعد ایک کیفیت خاموشی اور بے حرکتی کی۔چھے بائی تین کے ایک گڑھے میں منوں مٹی کے نیچے بے حرکتی بھی شاید اپنے اندر ایک تحرک رکھتی ہے۔کبھی پڑھا تھا کہ مرنے کے بعد بھی بال اور ناخن بڑھتے رہتے ہیں، کب تک؟ یہ نہیں لکھا ہوا تھا۔

''تو اس کا مطلب ہے مرنے کے بعد بھی جسم میں نمو کی کوئی قوت موجود رہتی ہے۔

کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔۔۔''یہ صرف احساس ہے یا واقعی جسم میں زندگی کی حقیقی رمق موجود رہتی ہے''

مرشد نے کہا۔۔۔''زندگی تو کبھی ختم نہیں ہوئی، بس کچھ دیر کے لیے اس کا تسلسل معطل ہو جاتا ہے''

اُس نے سوچا اور لگا وہ چھے بائی تین فٹ کے گڑھے میں منوں مٹی کے نیچے بے حس و حرکت پڑا ہے۔جسم کے کچھ حصوں میں نمو کی قوت موجود ہے لیکن وہ خود ایک خواب میں ہے جس کے کچھ حصّے کڑوے ہیں کچھ میٹھے۔۔۔تو یہ خواب!

صور پھونکا جائے گا تو یہ دنیا ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔مجھے اٹھایا جائے گا لیکن کہاں۔۔۔دنیا تو ریزہ ریزہ ہو چکی ہو گی میں کہاں اٹھوں گا۔۔۔کسی خلد میں؟ کسی اور کرہ میں؟ کہاں؟ حساب کا میدان کہاں ہوگا، کسی خلاء میں؟

دنیا پرزے پرزے ہو کر تحلیل ہو جائے گی۔۔۔کلنڈر کا اگلا صفحہ۔۔آج کیا دن ہے۔۔۔اگلا دن کونسا ہوگا۔

باقی صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ کیجیے

بادشاہ کا قد

حسن منظر (کراچی)

جس چھوٹے سے ملک کے بادشاہ کا یہ قصہ ہے ایک دن اچانک اس کی جان کو ایک عجیب فکر لگ گئی۔

رات کو اچھا خاصا سویا تھا، کوئی بُرا خواب بھی نہیں دیکھا لیکن جب سو کر اٹھا اور ناشتے کے لیے تیار ہونے جا رہا تھا تو اس نے عادت کے مطابق قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر انگڑائی لی کہ کسلمندی دور کر سکے۔ خیر کسلمندی تو دور ہو گئی لیکن اسے لگا رات بھر میں کچھ نہیں تو اس کا قد تین چار اُنگل چھوٹا ہو گیا ہے۔ اس نے آئینے میں غور سے اپنے عکس کو سر سے لے کر پیر کی انگلیوں تک دیکھا اور جب دوبارہ خود کو پہلے سے چھوٹا لگا تو گھبراہٹ میں چاروں طرف گھوم کر دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا ہے اور پھر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اب اس نے جسم کو اکڑا کر سیدھا کیا جیسے خود اپنے کو سیلوٹ دے رہا ہو لیکن ڈھاک کے وہی تین پات۔ اس کی دانست میں قد چھوٹے کا چھوٹا ہی رہا۔

اس نے دل میں کہا: میری عقل کا فتور ہے یا نظر کا، ہوں میں اتنا ہی لمبا جتنا رات سویا تھا۔ بھلا قد رات بھر میں کیسے چھوٹا ہو سکتا ہے! تردّد دور کرنے کے لیے اس کے ذہن میں ایک ہی ترکیب آئی۔ جسم کو بھی ناپا جائے اور آئینے میں اس کے عکس کو بھی۔ چنانچہ اس نے خود کو ہاتھ کے پیمانے سے ناپا اوپر سے نیچے تک یعنی انگلیوں کو پھیلا کر چھوٹی اُنگلی کی نوک سے لے کر انگوٹھے کی نوک تک جو بڑا مشکل کام نکلا کیوں کہ نیچے کے دھڑ کو ناپنے کے لیے اوپر کے دھڑ کو جھکانا پڑتا تھا۔ اس میں اتنا کام تو آسان تھا جتنا رکوع میں جانے تک کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے آگے سخت دشوار۔ ٹخنوں تک پہنچتے پہنچتے اس کا جسم دہرا ہو گیا اور پیٹ کے دبنے سے سانس پھول گیا۔ گھبراہٹ میں اس کا جسم اسپرنگ لگے پرزے کی طرح خود بخود کھُل گیا۔

کچھ دیر سیدھا کھڑے رہ کر اس نے سانس درست کیا اور اب آئینے سے اپنا جسم ہٹا کر اپنے عکس کو ناپنا شروع کیا۔ اس میں پھر وہی مشکل اٹھ کھڑی کہ اوپر کا دھڑ تو ناپ میں آ گیا لیکن رکوع کی حالت میں پہنچنے پر جسم آئینے سے دور ہو گیا اور آنکھیں بجائے عکس پر ٹکنے کے پیروں کو دیکھنے لگیں۔ جھنجھلاہٹ میں اس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ کولھوں سے لے کر پیر کے تلوؤں تک کیسے ناپا جائے۔ اور جب گھبرا کر سانس درست کرنے کو وہ سیدھا کھڑا ہوا تو یہ بھی بھول گیا کہ اس کا اوپر کا گوشت اور پوست کا جسم کتنے بالشت تھا اور آئینے کے عکس والے کا کتنا۔

یہ عمل اس نے دو تین بار کیا اور ہر بار سیدھے کھڑے ہو کر وہ اپنے عکس کو دیکھتا تو اُسے اپنا قد اور زیادہ چھوٹا نظر آتا۔ وہ روہانسو ہو گیا۔ اگر آج ملکہ محترمہ یعنی امّاں جان زندہ ہوتیں تو انہیں بتاتا کس مشکل میں پھنس گیا ہوں مگر بدقسمتی سے وہ پچھلے ایک سال میں ماں باپ دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور ناچار تین مہینے ہی ہوئے اسے تخت نشین ہونا پڑتا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی عمر ہوتی ہے انتظام سلطنت سنبھالنے کی! اور حقیقت یہ ہے کہ وہ منہ لگے درباریوں سے کہا کرتا تھا، تب سے وہ ماں باپ کے صدمے کو بھلا رہا تھا۔

باہر سے خادمہ جب بھی دروازے پر ہولے سے دستک دے کر کہتی ''بادشاہ سلامت ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے'' یا ''بادشاہ سلامت ناشتہ آپ کا انتظار کر رہا ہے'' تو اس کی گھبراہٹ اور بڑھ جاتی، جسم کانپنے لگتا اور اُسے لگتا دل دھڑک دھڑک کر سینے سے باہر نکل پڑے گا لیکن ہر بار وہ مصنوعی طور سے آواز کو کڑک کر کے یہی کہتا: ''ہم تیار ہو رہے ہیں''۔

باہر خادماؤں، خادموں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں آخر معاملہ کیا ہے؟ آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا کہ بادشاہ سلامت نے ناشتے کے لیے آنے میں اتنی دیر لگائی ہو۔ اتنی دیر تو جب بھی نہیں لگاتے تھے جب خلد آشیاں ان کے والد حیات تھے اور یہ شہزادے تھے۔

اُدھر درباری آ کر محل کے خدمت گاروں سے پوچھ پوچھ جا رہے تھے حضور کب تک دربار میں تشریف لائیں گے؟ کتنے فریادی ان کی راہ دیکھ رہے ہیں، وزیر انتظار کر رہے ہیں کہ بادشاہ سلامت تشریف لائیں تو فیصلہ ہو آج دوپہر کو ان کا کیا پروگرام ہے؟ شام کو سیر و شکار کے لیے کس طرف جائیں گے؟ رات کو ناچ گانے کی محفل جمائی جائے یا نہیں؟

مگر درباریوں کا کہنا کہ کتنے فریادی اُن کی راہ دیکھ رہے ہیں غلط تھا۔ درست یہ تھا کہ انہوں نے فریاد لے کر آنا ترک کر دیا تھا۔

اُدھر ناپنے کے کام سے بیزار ہو کر بادشاہ سلامت خواب گاہ میں اپنے چھپر کھٹ پر بیٹھے پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ اتنی دیر میں وہ کئی دفعہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے صبح آنکھ کھلنے پر قد رات سونے سے پہلے کے قد سے دو انگل کم نکلا ہو گا، گھنٹے بھر میں چار انگل چھوٹا ہوا، پھر چھے انگل اور اب تک تو ایک بالشت سے زیادہ کم ہو گیا ہو گا۔ اگر قد اسی رفتار سے گھٹتا رہا تو میرا انجام کیا ہو گا! ایسا نہ ہو جب دربار میں تخت پر بیٹھوں تو سب ہنسنے لگیں بادشاہ سلامت کو رات بھر میں کیا ہو گیا، ٹھٹھر کر رہ گیا ہے۔ وہ بار بار خود کو یقین دلاتا: میرا قد چھوٹا نہیں ہوا ہے۔ آئینے کو رات جب میں سو رہا تھا کسی نے بدل دیا ہے۔ آخر کو ہاتھ میں پکڑنے والے ایسے آئینے نہیں ہوتے ہیں جن میں ایک طرف سے دیکھو تو صورت بڑی نظر آتی ہے اور دوسری طرف سے دیکھو تو چھوٹی۔

بچپن میں ایسا آئینہ اس نے اُس نائی کے پاس دیکھا تھا جو محل میں ان کی حجامت بنانے کے لیے آتا تھا اور شروع میں جب بال کٹواتے ہوئے وہ چیخ و

پکار کرتا تو وہ اس کے ہاتھ میں آئینہ دے کر کھیل میں لگا دیتا اور چپ چاپ اپنا کام کرنے لگتا۔ ساتھ میں گاتا جاتا یہ دیکھو شہزادہ بڑا ہو گیا، یہ دیکھو شہزادہ چھوٹا ہو گیا۔ مگر پہلی دفعہ شہزادہ اُس آئینے میں اپنی شکل کو گھٹتے بڑھتے دیکھ کر بھی اس بری طرح ڈرا تھا کہ کھلائی کی گود میں چڑھ گیا تھا۔ بچپن کے اُس آئینے کو یاد کر کے اُس نے خود کو سمجھایا۔ یقیناً یہ وہ آئینہ نہیں ہے جو ہمیشہ سے یہاں لگا تھا میں اتنے کا اتنا ہوں۔

پھر اُسے خیال آیا مگر وہ آئینہ جو بچپن میں مجھے نائی کھیلنے کو دیتا تھا وہ تو بہت چھوٹا تھا، اتنا چھوٹا کہ ملکہ عالیہ، امّاں جان کے ہاتھ کے بٹوے میں آ سکتا تھا۔ وہ اتنا بڑا کیسے ہو گیا!

اور اگلے لمحے اُسے خیال آیا واہ، وہ کوئی ایک آئینہ تھا دنیا بھر میں۔ اس سے بڑے بھی بنتے ہوں گے بلکہ یہاں اس شہر میں بھی ہوں گے۔

آخر جب اس سے کچھ نہیں بن پڑا اور خادمہ سجانی نے دروازے پر دستک دے کر کہا ”بادشاہ سلامت آپ کب باہر تشریف لائیں گے؟“ تو اس نے اندر سے کہا ”سجانی مجھے پیمانہ چاہیے“۔

سجانی نے گھبرا کر کہا ”اللہ خیر کرے آپ کو پیمانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

بادشاہ نے خفگی سے کہا ”فالتو سوال مت کرو میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو“

سجانی نے پوچھا ”عالم پناہ کیسا پیمانہ؟ وہ جو اسکول میں جانے والے لڑکے لڑکیاں استعمال کرتے ہیں یا وہ جس سے دوا کی خوراک ناپی جاتی ہے یا وہ جو کپڑا ناپنے کا ہوتا ہے جس سے درزی ناپ لیتا ہے؟ وہ فیتہ“ ساتھ ہی اُس نے کہا آپ کو تیز بخار تو نہیں ہے جو دماغ کو چڑھ گیا ہے؟

بادشاہ نے جلبلا کر کہا ”درزی والا فیتہ حاضر کرو“

تھوڑی دیر بعد دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی تو بادشاہ نے اُسے بس اتنا کھولا کہ خادمہ کا ہاتھ اندر آ سکے۔ اس کے ہاتھ سے فیتہ لے کر بادشاہ نے دروازہ بند کیا اور خوش خوش آئینے کے سامنے آن کھڑا ہوا اور اپنے عکس سے بولا ”اب دیکھتا ہوں تجھ میں اور مجھ میں کتنا فرق ہے۔

پہلی دفعہ ناپنے پر جب دونوں قد برابر نکلے تو اُسے اطمینان نہیں ہوا کیوں کہ عکس کو ناپنے میں سر اور ہاتھوں کو ہلانا جلانا پڑتا تھا اور اس کے ساتھ عکس بھی چھوٹا بڑا ہو جاتا۔ اب اس کے دماغ نے یہ اختراع کی کہ وہ چوک جس سے اس نے اپنے درزی کو کپڑے پر نشان لگاتے دیکھا تھا اس سے عکس کے سر کی چوٹی پر نشان لگانا چاہیے، پھر فیتے سے وہاں تک جہاں ایڑی کا عکس ہو، قالین پر فیتے کو لٹکا کر ناپا جائے۔

دروازے پر جا کر بادشاہ سلامت نے چاندی کے گلدان کے پیندے سے کھٹکا کیا۔ خدمت گار تو سب کیا لڑکے کیا لڑکیاں دروازے کے باہر ہی کھڑے تھے انہوں نے گھبرا کر ایک ساتھ کہا ”کیا حکم ہے عالم پناہ؟“ بادشاہ نے کہا ”مجھے وہ نیلا تکونا چوک چاہیے جس سے ہمارا درزی کچے سلے ہوئے کپڑے پر نشان لگاتا ہے“

سب نے بھونچکا ہو کر ایک ساتھ کہا ”اس کا کیا کریں گے حضور؟ آپ کو بخار تو نہیں ہے؟“ ساتھ ہی وزیر اعظم نے جو پریشان ہو کر آج بادشاہ کو کیا ہو گیا جو خواب گاہ سے تو نکل نہیں رہے ہیں اور وہیں بیٹھے الٹی سیدھی چیزیں طلب کر رہے ہیں کہا ”وہ کیوں؟ کس لئے عالیجاہ؟“

بادشاہ نے کڑک کر کہا ”تم سے مطلب؟ جو طلب کیا ہے وہ حاضر کرو“۔

تھوڑی دیر میں وہ نیلا تکونا چوک بھی آ گیا اور بجائے آئینے کے عکس کے مارے جلدی کے بادشاہ اس سے اپنے سر پر لائن کھینچ گیا پھر خجل ہو کر عکس سے آنکھیں چُرانے لگا جیسے وہ اس کا منہ چڑا رہا ہو۔

مسہری کے سرہانے رکھے ہوئے جگ سے انڈیل کر اس نے ایک گلاس پانی پیا اور جب اوسان کچھ درست ہوئے تو فیتے سے خود کو ناپنے چلا جو کام اس کی دانست میں بس اتنا تھا کہ فیتے کے ایک سرے کو ماتھے سے ٹکا کر باقی کو قالین تک گرا دیا جائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فیتہ گرا تو لیکن یہ جاننا دشوار ہو گیا کہ قالین کو چھوتے ہوئے کہاں تک کھلا تھا یعنی اس کے قد سے کہیں لمبا تھا۔ خیر اس تذبذب کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے شیشے پر نشان لگا کر سر سے پیر تک عکس کو ناپا۔ دونوں تقریباً برابر نکلے بجائے مطمئن کرنے کے پریشانی میں اضافہ کر گئے۔ وہ بڑبڑایا ”آئینہ جھوٹ بول رہا ہے“۔

اب وہ فرش پر فیتے کے ایک سرے کو ٹکا کر باقی کو سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے ماتھے تک لے گیا اور جتنی پیمائش نکلی اسے کاغذ پر نوٹ کر لیا۔ اسی وقت خواب گاہ کے دیوار کے گھنٹے نے بارہ بجائے اور اُس آواز کے ساتھ ہی اس کے پیٹ میں چوہے قلابازیاں کھانے لگے۔ دروازے کے باہر وزیروں، کنیزوں اور خدمت گاروں کی بھیڑ لگی تھی اور اُن کے بولنے کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ قد کے چھوٹے ہوتے چلے جانے کا کھٹکا اپنی جگہ سہی لیکن نیا اندیشہ یہ پیدا ہوا کہ وہ لوگ ہمدردی میں دروازہ توڑ کر اندر نہ آ جائیں۔ آخر کار اپنا شاہی لباس زیب تن کر کے اُسے باہر آنا پڑا۔

سب دو رویہ کھڑے ہو گئے اور بادشاہ اُن کے بیچ میں سے ہو کر کھانے کے کمرے کی طرف چل پڑا لیکن کنکھیوں سے دونوں طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا سب ہنسی ضبط کر رہے ہیں اور اس کے قد کو جانچ رہے ہیں۔ حالانکہ سب کی نظریں روبرو تھیں اور اس طرح وہ اُسے کیسے دیکھ سکتے تھے کہ جانچیں کل قد کتنا تھا اور آج کتنا ہے مگر ہر قدم پر اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ چلتے چلتے کہیں اس دم وہ بس اتنا نہ رہ جائے جتنا چھ سات سال کا بچہ ہوتا ہے۔

(جو تم ہو، اسے خلد آشیاں مرحوم بادشاہ کی آواز سنائی دی اور وہ سہم کر رہ گیا)

اچانک بغیر ارادے کے اس کی ایڑیاں لبادے کے اندر جو ٹخنوں تک پہنچتا تھا، اوپر اٹھ گئیں اور اب وہ پنجوں کے بل چل رہا تھا۔ خدا خدا کر کے جب وہ کھانے کی میز تک پہنچا تو کرسی پر ہمیشہ کی طرح بجائے سکون سے بیٹھ جانے کے دھب سے بیٹھ گیا جیسے کپڑوں کی گٹھری کسی نے پٹک دی ہو۔

آج اس نے ناشتہ کرنے میں جتنا ممکن تھا دیر لگائی۔ ایک ایک نوالے کو جو تھا تو اتنا ملائم کہ بے دانتوں کا کوئی بوڑھا بھی چبا سکتا تھا لیکن اُسے وہ اس طرح چبا رہا تھا جیسے کنکروں کو دانتوں سے پیس رہا ہو۔ مؤدب خدمت گار اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے اور دل میں کہہ رہے تھے ''یا اللہ یہ ماجرہ کیا ہے؟'' چاہتا تو دس آدمیوں کا کھانا پل بھر میں کھا جاتا اور آج نہ اس کے دانت چل رہے ہیں نہ منہ۔

جب جب بادشاہ کی نظریں اُن میں سے کسی طرف اٹھیں اور اُسے اپنی طرف تعجب سے دیکھتے پایا تو وہ خود اپنے اندیشے پر ایمان لے آیا کہ مجھ میں کچھ تو ہے جو یہ اس طرح مجھے دیکھ رہا ہے۔ گھبراہٹ میں اس نے نظریں ایک ایک کر کے باقی سب پر ڈالیں۔ سب جو تھوڑے جھکے تھوڑی گردن اس کی طرف گھمائے اُسے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کھٹاک سے اس طرح سیدھے کھڑے ہوتے گئے جیسے اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ سب کے چہروں سے مسکراہٹ رخصت ہو گئی۔

پلیٹوں میں جب کھانے کو کچھ نہ رہا تو بادشاہ اٹھ کھڑا ہوا اور ''آج دربار نہیں ہوگا'' کہہ کر پنجوں کے بل اُچک اچک کر چلتا ہوا اپنی خواب گاہ میں چلا گیا۔

اُس دن اس نے بس اس خادم کو جو اس کے جوتوں کی دیکھ بھال کا کام کرتا تھا خواب گاہ کے اندر آنے دیا اور اس سے ایک ایک کر کے اپنے ایک سو اکہتر (۱۷۱) جوڑی جوتے حاضر کرنے کو کہا۔ وہ ایک جوڑا لا کر حاضر کرتا، بادشاہ اُسے پہن کر جا کر آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا اور فیتے کو اپنے سر کے گنبد پر سے اس نشان تک لے جاتا جو صبح سے اس پر لگا تھا یعنی فرش کے متوازی اور ہر بار خادم سے پوچھتا ''ٹھیک ہے؟ سیدھا ہے؟'' تو وہ کہتا ''حضور ٹھیک ہے'' اور دبی زبان میں پوچھتا ''مگر کیا؟''

بادشاہ غصے سے کہتا ''نہیں ٹھیک نہیں ہے'' دوسرا جوڑا لاؤ اور وہ دوسرا جوڑا حاضر کرتا۔ اسی ادھیڑ بن میں دوپہر کے کھانے کا وقت نکل گیا۔

جب بادشاہ سارے جوتوں کو ٹھکرا چکا تو اس نے خادم سے کہا ''بازار جاؤ اور موٹے سے موٹے تلوں کے جوتے لے کر آؤ''۔

تھوڑی سی دیر میں خواب گاہ کے باہر جوتوں کے ڈبوں کا ڈھیر لگ گیا۔ خادم ایک ایک کر کے بادشاہ کو جوتے پہنا رہا تھا۔ وہ پہنتا اُچک اچک کر آئینے میں اپنے قد کا جائزہ لیتا اور فوراً ہی اتار کر دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر پھینک دیتا۔ وہاں رَد کئے ہوئے جوتوں اور ڈبوں کی پہاڑیاں سی بن گئیں۔

اپنے جوتوں کی طرف سے مایوس ہو کر بادشاہ نے راز داری میں اپنے اس خاص نوکر سے کہا ''شاہی موچیوں سے کہو جس جانور کی کھال سب سے موٹی ہوتی ہے اس کے تلے کے جوتے رات بھر بنا کر صبح حاضر کریں اور ایڑیاں اُسی کھال کی دُگنی موٹی ہوں''۔

شاہی جوتے ساز سب کے سب رات بھر بنے بنائے جوتوں کے تلے اکھیڑتے اور ان کی جگہ نئے تلے لگاتے رہے۔ کسی نے بھینس کی کھال چُنی کسی نے مگرمچھ کی کسی نے گینڈے کی۔ اس کے بعد کتنے ہی دن جوتوں کے بننے اور اُن کے رد کیے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ ان دنوں میں بادشاہ کا خاصہ تینوں وقت خواب گاہ میں حاضر کیا جاتا۔ وہاں وہ دن کا بڑا وقت خود کو آئینے میں جانچنے میں گزارتا، کبھی تھک کر لیٹ جاتا اور نیند کی جھپکی لے لیتا۔

پھر ایک دن وہ آیا جب بادشاہ نے طبیب خاص کو طلب کیا اور قسم دے کر کہا ''جو تمہیں بتایا جا رہا ہے وہ خواب گاہ سے باہر نہ پہنچے۔ تم نے مرحوم بادشاہ، ان کے باپ بادشاہ، اُن کے باپ بادشاہ کا علاج کیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر تم جی جان سے علاج کرو یعنی پوری عقل اور پورے تجربے کو کام میں لاؤ تو مردے میں جان ڈال سکتے ہو۔ ہم درست فرما رہے ہیں؟''

طبیب نے کہا ''جی سرکار۔ فرمائیے کس مردے میں جان ڈالنی ہے؟ میں پہلے اس مردے کو دیکھنا چاہتا ہوں''

بادشاہ نے کہا ''کودن مت بنو۔ تم شاہی زبان نہیں سمجھتے ہو؟ تمہیں میرے قد میں جان ڈالنی ہے۔

طبیب کو جھٹکا لگا۔ بولا ''مگر سرکار کا بدن تو سلامت ہے''

بادشاہ نے کہا ''پھر وہی کودن پنے کی بات۔ ہم تو سمجھتے تھے تم ایک نظر میں پہچان گئے ہو گے کہ آج ہمارا قد اتنا نہیں ہے جتنا کل تھا۔ اور کل اتنا نہیں تھا جتنا پرسوں۔

طبیب کا چہرہ تعجب سے پچک کر ایسا ہو گیا جیسے چٹنی کے لئے سُکھا کر رکھی ہوئی اَمبیا۔ اس سے کچھ کہتے بن نہیں پڑا۔ بادشاہ نے کہا ''ایسا نسخہ تیار کر کے لاؤ کہ نمبر ایک ہمارے قد کے چھوٹا ہوتے جانے کا عمل رک جائے''۔

طبیب نے ادب سے کہا ''دوسرے؟''

تمام درباریوں سے ہم قامت میں بلند ہو جائیں۔ ہمارا خیال ہے پہلے تین دن میں ہمارا یہ حال ہوا کہ پہلی رات ہم سوئے اتنا قامت لئے جتنا چھوڑ کر نو مہینے ہوئے ملکہ معظمہ ہماری امّاں جان رخصت ہوئی تھیں اور گیارہ مہینے ہوئے ملک معظم ابا جان مرحوم۔۔۔ صبح سو کر اٹھے تو قد کوئی انگل کم ہو چکا تھا''

طبیب حیرت سے اپنے مریض کو دیکھ رہا تھا۔

''دوسری رات میں ایک بالشت کم ہوا''

اس کے بعد؟

''دو بالشت''

طبیب کہنے کو ہوا ''آپ کو کیسے پتہ چلا؟ لیکن بادشاہ نے اس کی مشکل یہ کہہ کر آسان کر دی کہ ہم خود کو آئینے میں ناپتے ہیں۔''

’’اور نتیجہ کیا نکلتا ہے؟‘‘ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

’’عکس ہمیں چھوٹا دکھاتا ہے‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’کسی نے ہمارا آئینہ بدل دیا ہے اور اس کی جگہ ایسا لگا دیا ہے جو ایک طرف سے دیکھو تو چہرے کو بڑا کر کے دکھاتا ہے اور دوسری طرف سے چھوٹا‘‘

’’تو حضور آئینہ بدلوا لیتے‘‘

بادشاہ نے کہا’’آئینہ روز بدلنے کے لیے نکالا جاتا ہے اور پھر وہی لگا دیا جاتا ہے۔اس میں ہمیں سازش کارفرما نظر آتی ہے‘‘

طبیب نے کہا’’حضور میں سمجھ گیا مرض کیا ہے۔میں اس کا علاج کرتا ہوں‘‘

اگلے دن طبیب کے مشورے سے ہر قسم کے معالج محل میں جمع کیے گئے۔اُن میں کوئی چھینکنے کے مرض کا ماہر تھا،کوئی ڈکاروں کا،کوئی اگر اچھے خواب زیادہ آتے ہوں یعنی رات غم کی ہے اور خواب ہنسی مذاق کے آرہے ہیں اس کا معالج خاص تھا،کوئی خوشی کے موقع پر جو غم اور ماتم کے خواب دیکھنے کا شکار ہو اُس کے مرض کا،کوئی کھانسنے کا،کوئی کھنکارنے کا،کوئی ایسی آنکھوں کا جو سیاہ اور سفید چیزوں کو رنگین دیکھتی ہوں،کوئی ان کا جو رنگین چیزوں کو سفید اور سیاہ بنا دیتی ہوں۔غرض کہ پوری فوج تھی۔

شاہی طبیب نے ایک ایک کر کے سب کو اندر بھیجا اور بادشاہ نے ہر ایک سے ایک ہی سوال کیا۔

’’رائی کا پربت بنا سکتے ہو؟‘‘ وہ کہتا’’نہیں‘‘ اور بادشاہ کہتا’’نکل جاؤ‘‘

سب رد کر دیئے گئے اور ملک پر ادبار کی گھٹا چھا گئی۔نظم ونسق کچھ نہ بچا۔دن میں دہشت گردوں کا راج ہوتا رات کو ڈاکوؤں کا۔عورتوں مردوں نے گھر سے نکلنا بند کر دیا۔بچوں کو لوگ مدرسے نہ جانے دیتے۔بازار بند ہو گئے اور کھیتوں میں دھول اڑنے لگی۔اُدھر بادشاہ تھا کہ اس کا خاصہ اسی طرح خواب گاہ میں جاتا رہا۔وہ اُسے کھاتا تھوڑی دیر دن میں آرام کرتا،گھڑی بھر رات کو،باقی وقت آئینے کے سامنے کبھی پنجے اٹھا کر کھڑا ہوتا،کبھی ایڑیاں اور نتیجہ خاطر خواہ نہ پا کر آئینہ توڑ دیتا۔اس کے بعد دروازے پر کھٹکا کرتا۔خادم پوچھتا’’حکم حضور؟‘‘ بادشاہ کہتا’’سچا آئینہ لاؤ‘‘

شیشہ گروں کی بن آئی،وہ ٹوٹے ہوئے آئینے خچروں پر لاد کر لے جاتے اور انہیں پر لاد کر نئے آئینے لاتے۔

جب بہت دن ہو گئے اور سوائے خاصے کے ملازمین کے کسی نے بادشاہ کی شکل ایک بار بھی نہیں دیکھی تو پڑوس کے ملک کی شہزادی کو جس سے شادی کی بات دونوں کے بچپن میں چلی تھی خیال آیا میں تو انتظار ہی انتظار میں کہ کب بادشاہ کے قد کا چھوٹا ہوتے جانا تھمے وہ مجھ سے عقد کرے اور میں اس کے برابر کے تخت پر بیٹھوں بوڑھی ہو جاؤں گی کچھ مجھی کو کرنا چاہیے۔لیکن کیا؟

اس کی ماں ملکہ شب تاب نے کہا’’سیم تن ہوش کے ناخن لے، کس سے شادی کرنے جا رہی ہے ذرا سوچ تو سہی‘‘

اس نے کہا’’ملکہ محترمہ امّی جان کیوں کیا ہوا؟ میرا دیکھا ہوا ہے۔دیکھ کر ہی آپ نے اس رشتے کی بات چلائی تھی اور دیکھ کر ہی میں نے عندیہ ظاہر کیا تھا۔کیا وہ اتنے سالوں میں بدل گیا؟‘‘

ملکہ نے کہا’’اور نہیں تو کیا۔اب تم دیکھو گی تو پہچانو گی نہیں۔جن جن کو اس کی خواب گاہ میں داخل ہونے کی اجازت ہے اُن سے بات اڑتے اڑتے ہم تک پہنچی ہے۔اس کے گز گز بھر لمبے بال ہیں،پیروں کو چھوتی ہوئی داڑھی ہے۔ناخن ایسے ہیں کہ چاہے تو ان سے کیاریاں کھود دے اور پاس جاؤ تو اپنے نتھنے بند کر لو‘‘

شہزادی سیم تن گم متھولا بیٹھی رہی۔آنسو اس کی آنکھوں میں منڈلا رہے تھے لیکن اس کی خودداری نے گوارا نہ کیا کہ وہ انہیں اپنی ماں اور محلسرا کی خادماؤں کے سامنے بہائے۔آخر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا’’ملکہ معظمہ پھر تو میرا اُن سے شادی کرنا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔وہ بچپن میں میرے ساتھ کھیلے ہیں۔تب تندرست،کھلنڈرے اور ہنس مکھ تھے۔اب جب غم نے انہیں گھیر لیا ہے تو اُن سے کنارہ کر جاؤں!

ملکہ شب تاب نے کہا’’تو کیا کرو گی؟‘‘

سیم تن نے کہا’’جو کروں گی آپ بھی دیکھ لیں گی‘‘

اگلے دن اس نے اعلان نامہ جاری کیا۔شہزادی سیم تن کا ارادہ شادی کرنے کا ہے اور ان سے شادی کے خواہش مند کنوارے بادشاہوں، شہزادوں کو تاریخ مقررہ پر محل شاہی کے مقابلے کے میدان میں تشریف لانے کی دعوت دی جاتی ہے۔

جیسا کہ سب کے علم میں ہے شہزادی کے والد محترم شاہ عالی مقام کا انتقال ہو چکا ہے،سلطنت کی باگ دوڑ اُن کی والدہ محترمہ ملکہ شب تاب کے ہاتھ میں ہے جس سے وہ شہزادی کی شادی کے بعد دست بردار ہونا چاہتی ہیں۔سلطنت شہزادی کے جہیز میں دی جائے گی اس کے بعد وہ خود یاداللہ میں مصروف ہو جانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔

اعلان کا اتنا حصہ ہی پڑھ کر جن جن کو دعوت نامہ ملا ان کی تو رال ٹپک پڑی کہ اتنی خوبصورت بیوی بھی ملے گی اور وہ ملک بھی جو اتنا زرخیز ہے کہ وہاں کے کسانوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو آسودہ حال نہ ہو، نہ کوئی گیہوں سے کم فصل اُگاتا ہے نہ گیہوں کے سوا کسی اور اناج کی روٹی کھاتا ہے اور وہ بھی روکھی نہیں گھی چپڑی۔

مگر اعلان کا باقی حصہ پڑھ کر سب کے منہ لٹک گئے۔شادی کی شرائط میں نمبر ایک یہ تھی کہ امیدوار کی پہلے سے بیوی نہ ہو، نہ وہ رنڈوا ہو، نمبر دو وہ

لکھ کردے گا کہ اگر وہ دوسری شادی کرے گا تو اسے ملکہ سیم تن اوراس کے جہیز کی سلطنت سے دست بردار ہوکر باقی زندگی جنگل میں تن تنہا گزارنی ہوگی۔ نمبر تین تمام امیدواروں میں سے شہزادی شادی اس کنوارے بادشاہ یا شہزادے سے کرے گی جو قد میں باقی سب سے چھوٹا ہوگا۔ عمر میں شہزادی سے بڑا لیکن قد میں اتنا جتنا چھے یا زیادہ سے زیادہ سات سال کا لڑکا ہوتا ہے۔

جو شہزادے اپنے دراز قد ہونے پر ناز کرتے تھے آخری شرط پڑھ کر دل پکڑ کر رہ گئے بلکہ یہ کہنا چاہیے ایسے ٹھٹھر گئے جیسے ہاتھ لگانے سے چھوئی موئی کے پتّے۔ انہوں نے فیصلہ کرلیا تقریب میں جانا فضول ہے۔

ایک صبح جب بادشاہ سلامت سو کر اٹھے اور چھپر کھٹ سے اتر کر انگڑائی لے رہے تھے کہ ان کی نظر برابر میں رکھی ہوئی میز پر پڑی جس پر پنچ رنگ بورڈر کا خوبصورت دعوت نامہ کھلا رکھا تھا جس میں جلی حروف میں پیشانی پر لکھا تھا ''شہزادی سیم تن کی شادی''۔

انہیں جھٹکا سا لگا اور انگڑائی ادھوری رہ گئی۔ کون ان کی غفلت میں خلل انداز ہوا تھا اور کیسے وہ بغیر اجازت خواب میں آیا۔ اس نامۂ اعلان میں کچھ نہ کچھ اُن کے قد کے متعلق لکھا ہوگا۔ دل نے کہا ''یعنی یہ بات پھیل گئی ہے کہ بادشاہ کا قد چھوٹا ہوتا جارہا ہے اور اس سے قبل کہ وہ اتنا مختصر ہو جائے کہ بغیر محدب شیشے کے نظر نہ آئے، ہمیں نیا بادشاہ ڈھونڈ لینا چاہیے''

اس وقت بے چارے کو شدت سے احساس ہوا میرا باپ، میری ماں دونوں خلد آشیانی ہو چکے ہیں، نہ کوئی چچا ہے نہ ماموں جس سے اس کٹھن گھڑی میں مشورہ لے سکوں۔ بے اختیار بے چارے کے آنسو پھوٹ بہے۔ انہیں پونچھتے ہوئے اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے اعلان نامہ اٹھایا۔ کچھ دیر کاغذ پر لفظ ناچتے رہے۔ پھر جب اُن کا ہلنا تھما تو اس نے پڑھنا شروع کیا۔

اسے شہزادی سیم تن پر سخت غصہ آیا کہ میرے ساتھ کی کھیلی ہے اور گو بات کبھی پکی نہیں ہوئی تھی لیکن سب ہی جانتے تھے ایک دن اس کی شادی مجھ سے ہوگی اور آگے چل کر دونوں سلطنتیں ایک ہو جائیں گی کیونکہ شہزادی کا کوئی بھائی نہیں ہے مگر آہستہ آہستہ غصہ تعجب اور تعجب خوشی میں تبدیل ہوتا گیا۔

اعلان کا پڑھنا ختم کر کے بے اختیار اس کے منہ سے نکلا لاکھ شہزادے آئیں لیکن یہ بازی میرے ہی ہاتھ رہے گی۔ میری پہلے سے بیوی نہیں ہے، شہزادی مجھ سے عمر میں چھوٹی ہے میرا ابھی دوسری شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہوگا اس لیے راج پاٹ چھوڑ کر جنگل میں باقی عمر گزارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی آخری شرط تو اس پر تو کوئی پورا اتر ہی نہیں سکتا ہے۔ تاریخ مقررہ کو پہنچتے پہنچتے میرا قد اگر مزید چھوٹا نہیں بھی ہوا تو اب کونسا میں طویل قامت ہوں! ایک دم اُسے لگا اتنے مہینوں بعد آج اس شکنجے سے مجھے خلاصی ملی ہے جس نے سر کو جکڑ رکھا تھا۔

خوشی کے عالم میں خود بخود اس کے منہ سے ایک ایسی دھن نکلنے لگی جو اس نے بارہا ناچ دیکھتے ہوئے سُنی تھی۔ چھپر کھٹ کے برابر رکھی ہوئی میز پر سے اس نے چیزیں اٹھا کر ایک طرف رکھیں اور اُسے طبلے کی طرح بجانے لگا۔

یہ آوازیں باہر بھی پہنچ رہی تھیں۔ خاصے کے ملازمین نے دروازے کو روزن جتنا کھول کر اندر جھانک کر دیکھا اور حیران رہ گئے کہ بادشاہ سلامت ناچ رہے ہیں۔ یہ بات دم بھر میں پورے محل میں پھیل گئی اور جب انہوں نے ناچتے گاتے باہر نکلنا چاہا تو جو خادم اور خادمائیں دروازے سے کان لگائے کھڑے تھے وہ دور جا گرگرے۔

بادشاہ سلامت نے کھانا طلب کیا اور اعلان نامہ وزیر کے ہاتھ میں دے کر گویا ہوئے۔

''یہ تاریخ کب ہے؟''

اس نے کہا ''شاہِ عالم کل''

بادشاہ نے کہا ''مجھے نئی پوشاک چاہیے۔ موٹے تلے اور اونچی ایڑیوں کے جوتے سب پھینکوا دو اور مجھے باریک سے باری تلے کے جوتے چاہییں گے ایسے جن کی ایڑی ہی نہ ہو''۔

اُس کے اگلے حکم کی تعمیل میں شاہی حجام حاضر ہوئے۔ کوئی سر کے بال درست کرنے میں لگ گیا کسی نے داڑھی سنبھالی، باقی نے ہاتھوں پیروں کے ناخن۔ محل سے حزن والم کی فضا ایسے چھٹ گئی جیسے سخت سردی میں سورج کے سامنے سے بادل ہٹ جائیں۔

اگلے دن وہ رسم تھی۔ ملکہ شب تاب کے محل کے سامنے وہ میدان تھا جس میں ہمیشہ سے قسما قسم کے مقابلے اور کھیل تماشے ہوتے آئے تھے۔ ہاتھی گھوڑوں کے کرتب، تیر اندازی، تلوار زنی اور ناچ گانے۔ بادشاہ سلامت نے طے کرلیا تھا کہ وہ وقت مقررہ پر تو پہنچیں گے لیکن اتنی تاخیر سے کہ اب سب مقابل آ چکے ہوں۔ لیکن جب وہ نقاب لگائے وہاں پہنچا تو ہر طرف سے نعروں کے ساتھ لوگوں کے ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ارے یہ بونوں کے میلے میں اوج بن عوق کہاں سے آ گیا۔ کوئی اس پر لمبو کی پھبتی کس رہا تھا کوئی تاڑ کے درخت کی۔

تمام امیدواروں کے درمیان سے ہوتا ہوا جب وہ شہزادی سیم تن کے پاس پہنچا تو اپنا قد چھوٹا کرنے کے لیے گھٹنوں کو تھوڑا موڑ کر اور چھاتی کو جھکا کر کھڑا ہوا۔

شہزادی نے کہا ''بادشاہ سلامت تشریف آوری کا شکریہ''

بادشاہ نے کہا ''معاف کیجیے گا مجھے اگر معلوم ہوتا یہاں سب مجھ سے چھوٹے قد والے ہوں گے تو میں نہیں آتا مگر آپ تو لگ رہا ہے آپ میرا ہاتھ ٹھکرا دیں گی کیونکہ میرا شمار تو پستہ قد لوگوں میں ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ میں تو آپ سے بھی ایک بالشت اونچا ہوں۔

شہزادی کا چہرہ اس کنول کی طرح کھِل اٹھا جو پانی میں نہا کر ابھی ابھی ہوا اور روشنی میں آیا ہو۔ بولی ''وہ تو آپ ہمیشہ سے ہیں اور صرف مجھ سے

باقی صفحہ ۱۱۵ پر ملاحظہ کیجیے

وقت کا طوفان

نند کشور وکرم

(دہلی، بھارت)

رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے اور سریش بابو کی بیوی کب کی گہری نیند سوئی زور زور سے خرانٹے بھر رہی تھی مگر سریش بابو تھے کہ انتہائی کوشش کے باوجود سو نہیں پا رہے تھے۔ کمرے میں تاریکی اور اپنی بیوی کے خرانٹوں کے بیچ پہلو بدل بدل کر جب وہ سو نہیں پائے تو دھیرے سے اُٹھ کر برآمدے میں آ گئے اور وہاں ٹہل ٹہل کر اپنی ذہنی پریشانی سے نجات پانے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود انہیں قلبی اطمینان وسکون نصیب نہیں ہو رہا تھا اور وہ مسلسل ٹہل ٹہل کر کر آج دن میں ہوئے واقعہ کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سدیش بابو مرکزی سرکار کے محکمہ زراعت میں انڈر سیکرٹری تھے اور گزشتہ دس برس سے نئی دہلی میں الاٹ سرکاری فلیٹ میں رہائش پذیر تھے اور بڑے امن وسکون کی زندگی گزار رہے تھے کہ اسی دوران دیکھتے ہی دیکھتے ان کی ننھی منی اکلوتی بیٹی سمرتی جوان ہو گئی اور انہیں بھی عام والدین کی طرح اس کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی۔

لیکن یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ یہ چنتا تو بیٹی کے جوان ہونے پر ہر ماں باپ کو لاحق ہو جاتی ہے اور وہ اس کیلئے بر ڈھونڈنے لگتے ہیں لیکن اب نئے زمانے کے ساتھ ساتھ طور طریقے بھی بدلتے جا رہے تھے۔ پہلے یہ ماں باپ کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ اپنے بچوں کے لئے اچھے رشتے تلاش کریں اور اس سلسلے میں اپنے سگے سمبندھیوں کی مدد بھی لیں۔ مگر اب اعلیٰ تعلیم ،مہانگروں کی شہری زندگی اور گلوبلائزیشن نے ماں باپ کو اس کام سے فارغ سا کر دیا تھا اور اب زیادہ تر بچے یہ کام خود ہی انجام دیتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں صرف ماں باپ کی رضامندی حاصل کرنے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ اگر والدین راضی ہو جائیں تو ٹھیک ورنہ وہ خود ہی اپنی مرضی سے سول میرج یا دوستوں کے شمولیت اور تعاون سے کسی مندر، مسجد یا گورودوارے میں جا کر یہ مسئلہ حل کر لیتے ہیں۔

سدیش بابو کو بھی یہ فکر گھُن کی طرح کھائے جا رہی تھی کہ ان کی جوان بیٹی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ساٹھ ستر ہزار روپے تنخواہ پانے کے باوجود شادی کے لئے ہاں نہیں کر رہی تھی، حالانکہ رشتہ داروں اور برادری سے کئی رشتے آ رہے تھے۔ مگر وہ کیا کریں؟ وہ تو شادی کے لئے ہاں ہی نہیں کر رہی تھی۔ جب بھی وہ اس سے شادی کے لئے اصرار کرتے تو وہ ہر بار ٹال دیتی۔ اور ہمیشہ یہی کہتی۔ ''پاپا آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ جب مجھے شادی کرنی ہوگی اور مجھے کوئی لڑکا پسند آئے گا۔ مَیں خود آپ کو بتا دوں گی۔''

بیٹی کی اس تسلی کے باوجود ان کی چنتا دور نہیں ہو رہی تھی کیونکہ عام طور پر اُن کے سبھی رشتہ داروں اور جان کاروں کی بیٹیاں بیاہی جا چکی تھیں اور ان کی بیٹی پچیس سال کی ہونے پر بھی ابھی تک کنواری تھی۔ اور ان کے لاکھ چاہنے پر وہ شادی کے لئے ہاں نہیں کر رہی تھی۔ مگر ایک دن جب وہ دفتر سے لوٹے اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے تو ان کی بیوی سنگیتا نے ان سے کہا۔'' آپ کے لئے ایک خوش خبری ہے۔؟''

''کیا؟'' انہوں نے چونک کر پوچھا۔

''سمرتی نے ایک لڑکا پسند کر لیا ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ آپ بھی اس سے مل لیں۔''

''لیکن لڑکا کرتا کیا ہے؟''

''وہ بھی اس کی کمپنی میں کام کرتا ہے اور ڈیڑھ لاکھ روپے تنخواہ پاتا ہے۔ اور وہ چاہتی ہے کہ آپ سنڈے کو اس سے کسی جگہ مل لیں۔

''لڑکا کہاں کا ہے اور اس کے ماں باپ کیا کرتے ہیں۔؟ سدیش بابو مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے بولے۔

''اس بارے میں مجھے کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ اور پھر ہم نے پتہ کر کے لینا بھی کیا ہے۔ کیونکہ جب اُس نے لڑکا پسند کر لیا ہے اور اس نے وہاں شادی کرنی ہی ہے تو ہمیں زیادہ پوچھ تاچھ کی ضرورت کیا ہے۔ پھر بھی سنڈے کو جب ملیں گے تو آپ نے جو پوچھنا ہے پوچھ لیجیے گا۔''

سنڈے کو وہ لوگ اس سے ملنے 'گے لارڈ' پہنچے جہاں انہیں لڑکے سے ملاقات کرنی تھی۔۔ سمرتی نے سبھی کا تعارف کرایا اور وہ سب اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے مگر وہ لڑکا مسلسل کھڑا حیرت واستعجاب سے سدیش بابو کو دیکھ رہا تھا۔ اور سدیش بابو سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے سوچ رہے تھے کہ وہ اس کے آبائی شہر اور والدین کے بارے میں پوچھیں کہ اس لڑکے نے پہل کر کے بڑی نمرتا سے اور بڑی دھیمی آواز میں اُن سے ہی سوال کر دیا۔

''انکل کیا آپ راجپورہ کے رہنے والے ہیں؟

''جی''

'انکل!' کیا آپ نے مجھے پہچانا۔ مَیں بھی اسی جگہ کا رہنے والا ہوں؟''

سدیش بابو ہکّا بکّا اسے غور سے دیکھنے اور سوچنے لگے کہ آخر یہ لڑکا کون ہو سکتا ہے؟ مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔۔ تب انہوں نے اپنی حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا......

''بیٹا! آپ کہاں رہتے تھے۔اور آپ کے پتا جی......''

''میرے پتا جی کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔وہ تو آپ کے محلے ہی میں رہتے تھے۔

''کون؟'' حیرت واستعجاب سے اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔راج کمار نے اُن کی حیرانی دیکھتے ہوئے کہا۔

''رام رکھامل، جو آپ کے ساتھ پرائمری اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔''

رام رکھامل کا نام سنتے ہی سدیش بابو کو بجلی کا کرنٹ سا لگ گیا اوران کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''اوہ تو تم رام رکھامل کے بیٹے ہو؟''

''جی انکل!''

''اچھا اچھا'' رام رکھامل کا نام سن کر انہیں بات کرنے کے لئے الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد اُنہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ہمت بٹور کر پوچھا۔'' کیسے ہیں رام رکھامل جی؟''

''جی ان کا تو کوئی تین سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔''

''اوہ'' ان کے منہ سے 'اظہارِ افسوس' میں بس اتنا ہی نکل سکا۔اس کے بعد انہیں سوجھ ہی نہیں رہا تھا کہ اب وہ اس سے کیا سوال کریں۔کیونکہ رام رکھامل ان کا کبھی تیسری چوتھی کلاس میں ہم جماعت تھا اور اس کا باپ ان کے محلے میں جوتے چپل کی مرمت کیا کرتا تھا۔مگر یہ بات وہ اپنی بیٹی کو کیسے بتا سکتا ہے؟ اور وہ بھی اس سچوئشن میں جبکہ شادی کی بات لگ بھگ طے ہو چکی ہے اور رام رکھامل کا لڑکا راج کمار آج ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے اور ڈیڑھ لاکھ روپے تنخواہ پا رہا ہے۔پھر وہ اپنی بیٹی کو کیسے بتا سکتے ہیں کہ اس لڑکے کا دادا اُن کے گھر کے سامنے موچی کا کام کرتا تھا۔اور پھر ایسی صورتِ حال میں جبکہ وہ اس مقام پر ہے کہ اسے کسی طرح سے اپنے آپ سے کمتر خیال نہیں کیا جا سکتا۔وہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ مہینہ تنخواہ پاتا ہے اوراس کی بود و باش کا معیار بھی کئی لحاظ سے بہتر تھا۔

سدیش بابو کی زبان تالو سے چپک گئی۔اُن سے کچھ کہتے نہیں بن رہا تھا۔اگر کسی اور موقع پر وہ اس سے ملے ہوتے تو وہ خوشی اور فخر سے اسے گلے سے لگا لیتے مگر اب تو ان کی بیٹی کی پسند کا معاملہ تھا اور وہ ان کا ہونے والا داماد تھا۔ان کی بیٹی اسے پسند کر چکی تھی تو کیا وہ اسے بتا سکتے ہیں کہ اس کے دادا ان کی گلی میں کیا کام کرتے تھے؟ نہیں وہ بھلا اسے کیسے بتا سکتے ہیں اور پھر جب بیٹی نے شادی کا تہیہ کر ہی لیا ہے تو ان کے اڑچن ڈالنے کے بھی کیا معنی۔اگر وہ اس کی مخالفت کریں گے تو اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ کل وہ جا کر کورٹ میں سول میرج کر لیں گے۔اور پھر آج ذات برادری، مذہب دھرم کو نظر انداز کر کے بے شمار شادیاں ہو رہی ہیں۔۔اس لئے انہیں راضی ہونا ہی پڑے گا۔

وہ دل ہی دل میں یہی سب سوچ رہے تھے کہ ان کی بیٹی نے ان کی خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''پاپا کیسے لگے راج کمار؟''

سدیش بابو کا جی چاہا وہ بیٹی کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیں مگر وہ یہ سب کیسے بتاتے اور پھر انہوں نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ وہ بھی بیٹی کی ہاں میں ہاں ملائیں۔لہٰذا انہوں نے بھی کچھ توقف کے بعد چہرے پر زبردستی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا......

''بہت اچھے۔اور پھر خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ ہمارے شہر کے اور اپنے واقف کار بھی ہیں۔بھلا اور ہمیں کیا چاہیے'' اتنا کہنے کے بعد انہوں نے چائے کا پیالہ اُٹھایا اور جلدی جلدی چائے کی چسکیوں میں اپنے اندر کی ندامت کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے......

- بقیہ -

رنگوں کے پیچھے

''میں نہیں ہوں گا تو اس کلنڈر کے کیا معنی'' مرشد سے پوچھا

مرشد نے کہا۔۔'' کلنڈر موجود رہے گا کہ وہ وقت کی علامت ہے لیکن ہم ختم ہو جائیں گے کہ ہماری گھٹی میں فنا ہے''

''جب اوّل و آخر فنا ہی ہے تو پھر یہ کھیل کیا ہے۔روز صبح کلنڈر کا صفحہ الٹنے کے کیا معنی ہیں؟''

مرشد مسکرایا۔۔'' اگر ہر شے کے معنی تلاش کئے جائیں تو سفر رک جاتا ہے، کچھ نہ جاننا ہی بہتر ہے، یہی زندگی کا حُسن ہے''۔خوبصورتی اور بدصورتی، سیاہی اور روشنائی ساری زندگی ان کی تلاش اور پہچان میں گزر جاتی ہے۔

''میں جاننا اور پہچاننا چاہتا ہوں'' اُس نے مرشد سے کہا۔

''تو سفر کا آغاز کرو'' اُس نے جواب دیا۔پھر خود ہی کہا۔۔''لیکن سفر تو جاری ہے، یہ روز جو تم کلنڈر کا صفحہ بدلتے ہو، یہ سفر کے احساس کی دلیل ہی تو ہے''

اُس نے روز صفحہ بدلنا چھوڑ دیا اور چلتا رہا، چلتا رہا، یہاں تک کہ ایک روز ایک بہت بڑے آئینے کے سامنے پہنچ گیا۔

اُس صبح اُس نے سارے صفحات ایک ساتھ ہی اُلٹ دئے تھے!

○

''گم نامی کی جانب''

شہناز خانم عابدی

(کینیڈا)

میرے میاں چودھری فضل اللہ لدھیانے سے پاکستان ہجرت کر کے فیصل آباد میں آباد ہوئے۔تقسیم کے فسادات اور خون خرابے سے ان کا بھرا پُرا خاندان سارے کا سارا محفوظ رہا۔ یہ ایک عجیب اور نا قابلِ فہم حقیقت تھی جس کو ان کے اڑوس پڑوس والوں بلکہ سارے قافلے والوں نے محسوس کیا اور ہر شخص جو ان سے ملنے آیا اپنے اپنے اعتقادات اور اپنی اپنی فکر کے مطابق اس کی تفہیم کی۔اس کے باوجود اس خاندان پر فسادات کی المنا کی اسی طرح مسلط رہی جس طرح دوسرے فساد زدہ اور جبری ہجرت کے مارے خاندانوں پر۔۔۔اشجارِ زیست جڑوں سے کٹ گئے، اکھڑ گئے، جل گئے، پودے ٹھٹھر گئے، پھول پتی بکھر گئے۔

چودھری فضل اللہ کا خاندان فیصل آباد میں ایک بار پھر بکھرا اور لوگ اِدھراُدھر نکل گئے۔فیصل آباد سے میں، چودھری فضل اللہ اور ہمارے بچے کراچی پہنچے اور ایک نئی لیکن پھیلتی اور بڑھتی ہوئی غریب طبقے کی بستی میں قیام کیا۔قریبی بازار میں چھوٹا سا خراد کے کام کا کارخانہ قائم کیا۔روزی، روٹی اور رہائش کا بندو بست ہو گیا لیکن جی ٹھکانے نہ لگا۔چودھری فضل اللہ نے میرے سمجھانے بجھانے کی پرواہ نہ کی اور گھر بدل لیا۔کام مزید چل نکلا، دل بھی ٹھہر گیا البتہ مکان، ہانڈی، چولھا، چوکی بدلتے گئے۔بالآخر ایک مکان جس کے کمرے کسی چھوٹی موٹی کوٹھی جیسے تھے اور جس کا آنگن کشادہ تھا نہایت سستے داموں میں مل گیا۔

رہن سہن کے ابتدا ہی میں محلے کی عورتوں میں سے ایک دو بوڑھی بڑی عورتوں نے یہ انکشاف کیا کہ ''مکان پر نحوست کا سایہ ہے۔۔اور ہاں صحن کے بیچوں بیچ جو آم کا درخت ہے اس سے ہشیار خبردار رہنا،مشہور ہے کہ اس کی جڑوں میں اس مکان کے قدیمی مالک نے اپنی بیوی کا گلا کاٹ کر خون ڈالا تھا اور پھر خود درخت سے لٹک کر مر گیا تھا۔''

میں نے اپنے میاں چودھری فضل اللہ کو جب یہ ہولناک واقعہ سنایا تو اس نے جواب میں ایک قہقہہ لگایا۔اس کی عادت تھی کہ جب مجھے چپ کرانا ہوتا تو معاملے کی مناسبت سے یا تو ایک لمبی 'ہوں' سے یا پھر ایک 'بلند آہنگ قہقہے' سے مجھے چپ کرا دیتا۔میں نے مکان کے موضوع کو اپنے ذہن سے نکال کر باہر پھینک دیا۔اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی دوبارہ نہیں آئیں کیونکہ وہ آبادی ہزار گز کے پلاٹوں پر مشتمل تھی اور اس کے مکین ایک دوسرے سے ملتے ملاتے نہیں تھے ماسوا کسی تقریب کے۔ ہر موقعہ پر باقاعدہ دعوت دیئے جانے کی ضرورت پڑتی۔۔۔۔۔اس بستی میں لوگ گاڑیوں پر آتے جاتے۔ پیدل چلتے ہوئے اکا دُکا آدمی کو نچلے طبقے کا اچھوت سمجھا جاتا۔پڑوس کے محلوں میں رکشا چلتے لیکن اس محلّے میں مجال ہے کوئی رکشہ نظر آ جائے۔

اس منحوس مکان میں رہائش ہم سب کو راس آئی۔میاں کا معمولی سا سیٹ اپ خراد کے ایک بڑے کارخانے میں بدل گیا۔آہستہ آہستہ طارق روڈ کے علاقے میں بھی کارخانے کی ایک شاخ قائم ہوگئی۔مکان جو پہلے ہی کسی انگریز کی کوٹھی جیسا لگتا تھا میرے میاں چودھری فضل اللہ نے اسے موڈرن بنگلے میں تبدیل کر دیا۔سرونٹ کوارٹر بھی بنوا لئے جن میں ڈرائیور، باورچی ایک دو اور ملازم اور ان کے بیوی بچے رہتے تھے۔

میں خوش تھی ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی پیسے کی تنگی سے محفوظ ہونا ہی کسی عورت کے لئے جنت میں رہائش سے کم نہیں ہوتا۔اولاد کے معاملے میں بھی مجھے بڑا سکون میسّر تھا۔دونوں مہنگے اسکولوں میں پڑھتے تھے،استاد گھر آ کر ٹیوشن پڑھاتے۔لڑکے کرامت اللہ کے لئے ایک پختہ عمر کے کالج کے پروفیسر اور لڑکی کے لئے ایک کالج گرل۔لڑکا،لڑکی دونوں اپنی اپنی کلاسوں میں ہمیشہ ٹاپ کرتے۔

خوش حالی کے ساتھ آدمی تنہا نہیں رہ پاتا۔۔۔ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آدمی جب مشکلات میں گھرا ہوتا ہے تو لوگ اس سے دور بھاگتے ہیں حتیٰ کے رشتہ دار تک منہ موڑ لیتے ہیں جب کہ ان کی اور ان کے تعاون کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔۔۔۔اور خوشحالی کے دوران ہر چہار اطراف سے یورش کر دیتے ہیں۔۔۔۔میں نے اس صورتِ حال پر غور بھی کیا ہے اور حیران بھی ہوئی ہوں ۔۔۔میرا اپنا حلقہ دیکھتے ہی دیکھتے وسیع اور وسیع تر ہوتا چلا گیا۔نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے کئی ایک کلبوں اور اداروں کا رکن بننا پڑا ہر ویک اینڈ اپنے خانہء عافیت سے باہر تادیر وقت گزارنا پڑتا۔کئی پارٹیوں میں شریک ہونا پڑتا۔ادھر بچوں کی بھی کایا کلپ ہو رہی تھی بیٹی مومی مختصر لباس میں اپنی جیسی اور لڑکیوں کے ساتھ گھومنے لگی تھی۔ بیٹا کرامت کانوں میں ہیڈ فون کی ڈنڈیاں ٹھونسے اپنے کمرے میں ہمہ وقت ناچتا، مٹکتا،تھرکتا پایا جاتا یا پھر کسی نو ایجاد فون پر انگلیاں گھما کر جانے کیا کیا کرتا۔پیسے کی ریل پیل اچانک بڑھ گئی تھی۔ہمارے میاں چودھری فضل اللہ پر اب اللہ سے زیادہ غیر اللہ فضل کرنے لگے تھے۔ پہلے کبھی کبھار جم خانے سے رات گئے نشے میں ٹُن لوٹتے تھے۔اب ہر رات لڑکھڑاتے قدموں سے گاڑی سے گھر کے اندر آتے۔کسی کسی رات دن چڑھنے کے بعد تشریف آوری ہوتی۔اور وہ بھی سر پکڑے بڑی بڑی جمائیاں لیتے ہوئے۔آتے ہی کسی صوفے پر گر کر نیبو پانی پیتے۔ان کے اتارے ہوئے کوٹ پر اور قمیض پر نارنجی، سرخ اور کبھی کبھار کالے رنگ کی گل افشانیاں دیکھنے میں آتیں۔جب میں بے مو

سم کی روپے پیسوں کی بارش کے بارے میں ان سے کچھ پوچھتی یا ان کے کپڑوں پر لگے لپ اسٹک کے داغ کی طرف انگلی اٹھاتی تو جواب میں کبھی 'بلند آہنگ قہقہہ' یا پھر زوردار گونج جیسی لمبی 'ہوں' میرے سوالات کا منہ بند کردیتی۔

ہمارا 'منحوس' مکان 'بابرکت' ثابت ہوکر ایک شاندار بنگلے میں تبدیل ہوچکا تھا۔ صحن میں کھڑا ہوا آم کا درخت جس سے مجھے خبردار رہنے کو کہا گیا تھا ایک سال چھوڑ کر پھل دیتا اور جس سال پھلتا میں اس کے آم بٹواتے بٹواتے بیزار آجاتی۔ اور جس برس پھل نہ دیتا تو تھوڑا سا بور لاکر کیریاں دیتا۔ میں ان کیریوں کا بڑے چاؤ سے اچار ڈلواتی چند مرتبان پانی کے اور چند تیل کے۔ اچار کی سوغات میں جن کے پاس بھی بھجواتی وہ تعریف کے فون کال سے دل خوش کر دیتیں۔ میں جب آم کے درخت کا سوچتی تو اس خیال سے کانپ کر رہ جاتی کہ اس مکان میں رہائش کرنے کے ابتدائی دنوں میں کئی مرتبہ اس کو کٹوا پھینکنے کا فیصلہ کیا لیکن کبھی کوئی مہمان رہنے کے لئے آگئے یا پھر کسی ناگہانی مصروفیت نے میرے دل و دماغ کو گھیر لیا۔

الغرض میری روزمرہ زندگی اس منحوس مکان اور آم کے اس درخت کے ساتھ جس کی جڑوں کو کسی خبطی، جنونی نے نجانے کن حالات کے تحت اپنی بیوی کے خون سے سینچا تھا اور اپنے بدن کو اس درخت سے لٹکایا تھا، میری، میرے میاں چودھری فضل اللہ اور ہمارے دونوں بچوں کی خوب نبھ رہی تھی۔ میاں کی روز روز کی شراب نوشی اور عیش کوشی، بچوںں کی مغرب زدگی کے ماسوا زندگی گلزار تھی۔

ان دنوں موسم کی تبدیلی کچھ زیادہ نمایاں ہونے لگی تھی۔ خواتین افسانہ نگاروں کی زبان کے مطابق گلابی جاڑا سچ مچ کے جاڑے میں بدلتا جا رہا تھا۔ میں بنگلے کے اندرونی صحن میں آرام کرسی پر نیم دراز موسمِ سرما کی لذت آگین دھوپ اور چائے گھونٹ گھونٹ لے رہی تھی۔ اچانک پائل کی چھنک کے ساتھ میں نے چونک کر کیکتی کو دیکھا۔ کیکتی کا تعلق لمباڑا قوم سے ہے۔ کراچی شہر میں برس کے بارہ مہینے قوم کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ لمباڑا قوم کے بھی کچھ لوگ سال میں دو تین مرتبہ کراچی کے چکر لگاتے ہیں۔ جب وہ آتے ہیں تو کیکتی میرے ہاں ضرور آتی ہے۔ میری ہدایت کے مطابق سیکیورٹی والے اس کو نہیں روکتے ہیں وہ بلا جھجک اندرونی صحن تک آجاتی ہے۔ کیکتی کو میں ہمیشہ نیچے سے اوپر کی جانب دیکھتی ہوں۔ لمباڑا قوم کی یہ رنگا رنگ لڑکی میری اس عادت سے واقف ہے۔ اور اپنے آپ کو مجھے دکھانے بھی لگی ہے۔ اپنے دائیں پاؤں سے ایک بجتا ہوا ٹھمکا لگا کر وہ کسی پرانے دراوڑی زبان کے گیت کے بول گا کر پہلے ہلکے قدم اور پھر تیز رکھتے ہوئے، رقص کرتے ہوئے کبھی ایک جانب اور کبھی دوسری جانب گھومتی ہے۔۔ اپنے رنگ برنگے گھیر دار لہنگے کو گھٹنے تک اٹھا کر کبھی دائیں اور کبھی بائیں ٹانگ آگے کر کے پلٹتی تو اس کے بلاؤز میں رنگ برنگے دھاگوں سے ٹکے ہوئے شیشے جھلمل جھلمل کرنے لگتے۔ اس دن بھی وہ معمول کے مطابق گاتے ہوئے رقص کرنے لگی لیکن اچانک اس کے تھرکتے پاؤں ساکت ہوگئے، گیت کے بول اس کے ہونٹوں پر ٹھہر گئے۔

''ہائے دیوا'' اس کی زبان سے نکلا۔

میں نے اس کو انتہائی تعجب سے دیکھا۔ وہ آم کے پیڑ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹ کر پھیل گئی تھیں اور گالوں پر گودے ہوئے سبز ستارے اوپر اٹھ کر اس کی پیشانی کو چھونے لگے تھے۔ پلاسٹک کے کڑوں سے ڈھکے ہوئے اس کے دونوں بازو آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور ہونٹوں سے خانہ بدوش درواڑیوں کی زبان کے لفظ آپ ہی آپ پھیل رہے تھے۔

''کیا بات ہے کیکتی تو ناچتے ناچتے رک کیوں گئی۔''؟ میں نے خاصی بلند آواز میں سوال کیا

میری آواز کے زیرِ اثر جیسے وہ اپنے آپے میں آگئی۔ اس نے اپنی کلمے کی انگلی سے آم کے پیڑ کی جانب اشارہ کیا۔

''بی بی جی!۔ آپ نے دیکھا آم کے پیڑ پر۔'' اپنا فقرہ مکمل کئے بغیر وہ چپ ہوگئی۔

میں نے اس کی اٹھی ہوئی انگلی کی جانب دیکھا۔ آم کے پیڑ پر مجھے کوئی خاص پرند یا چیز نہیں دکھائی دی۔ البتہ اس پر بور آرہا تھا۔ اس پر حیران ہوتے ہوئے کہ پیڑ پر بور آنے کو میں نے کیوں نہیں دیکھا میں نے کیکتی سے کہا'' وہاں کیا ہے آم کا بور ہی تو ہے۔''

''آم کے پھول بی بی جی۔۔۔۔ آم کے پھول۔۔۔۔ رُت کے بنا۔۔۔۔ سردی کی رُت میں۔۔۔۔ ہائے دیوا۔۔۔۔ معافی۔۔۔۔ معافی۔۔۔۔'' کیکتی آسمان کی طرف دیکھکر اپنے ہاتھ جوڑنے لگی اور بغیر کوئی بات کئے، کچھ لئے، پلک جھپکتے میں میری نظروں سے غائب ہوگئی۔ اس کے جانے کے بعد میں آرام کرسی سے اٹھی ملازمہ کو آواز دی کہ وہ چائے کی پیالی اٹھا لے جائے۔ اور ایک نظر آم کے پیڑ پر ڈالی۔ اس پر بور آرہا تھا۔۔۔۔ بے موسم کا بور۔

بے موسم کا بور۔۔۔۔ بے موسم کے آموں میں بدلنے میں دیر نہیں لے گی۔ اس کے خلاف کیکتی کے ردِّعمل کے بعد کسی اور کا ردِّعمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ میرے ملنے والوں میں ایسے لوگ کم تھے جو ان باتوں پر زبان کھولتے۔ میں نے خود اس پر ایک دو مرتبہ سوچا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ سردیوں میں آموں کی کھیپ کا آنا خلافِ فطرت واقعہ ضرور ہے۔۔۔۔ اگرچہ کہ بور کم آیا اور کیریاں اور آم بھی کم کم آئے لیکن آئے۔

شہر کے اکناف فارم ہاؤزوں کی تعداد میں اچانک اضافہ ٹاک آف دی ڈے Talk of the day کے طور پر ہوا تو خواتین نے بھی اس پر باتیں کیں۔ اس طرح مجھ تک بھی ساری باتیں پہنچیں لیکن میرے ذہن میں یہ

خیال کیسے آ سکتا تھا کہ شراب، جوئے اور جسم فروشی کے ان اعلیٰ معیار کے فحاشی کے اڈوں میں میرے میاں چودھری فضل اللہ لدھیانہ والے کا پیسہ بھی لگا ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ میری اپنی بیٹی مومی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ فارم ہاؤزوں میں جانے لگی ہے۔اور یہ کہ وہ منشیات کی ایڈکٹ (عادی) ہو چکی ہے۔ یہ سب معاملات میرے کانوں تک غیر معمولی تاخیر سے پہنچے۔ان کے علا وہ یہ ہولناک سچائی کہ میرے میاں چودھری فضل اللہ پر جو فضل غیر اللہ ہو رہا ہے اور جو مَن میرے گھر پر برس رہا ہے وہ منشیات کا زیرِ زمینی کاروبار ہے جس میں میرا رفیقہ حیات شریک ہے مجھ پر اس وقت کھلی جب میں اس سے ملنے پولس لاک اَپ گئی۔ وہاں اس سے بات کرنے میں مکمل ناکامی ہوئی۔ میرے لاکھ پوچھ گچھ پر بھی وہ کچھ نہ بولا حتٰی کہ میں رونے لگی۔ پولیس کا ایک آدمی مجھے وہاں سے لے گیا یہ کہہ کر ''ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔''

سوشلائز کرنے کے فائدے کے طور پر مجھے بیگم آئی جی پولس کے توسط سے آئی جی سے ملنا آسان ہو گیا۔آئی جی نے بڑی نرمی سے مجھ کو معاملات کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ضمانت پر اپنے میاں کو چھڑانے سے باز رکھنے کا مشورہ دیتے ہوئے مجھ سے کہا کہ منشیات ایک زیرِ زمین کاروبار ہی نہیں ایک ورلڈ وائڈ چین کا حصّہ ہے۔ہم یہ معلومات حاصل کرنے میں لگے ہیں کہ اس کی کراچی شاخ میں آپ کے ہز بینڈ چودھری فضل اللہ کے علاوہ اور کون لوگ شامل ہیں، یہ حلقہ کتنا وسیع ہے۔ آئی جی صاحب نے صاف لفظوں میں کہا ''بیگم فضل اللہ ہم آپ کے ہز بینڈ کو پولس لاک اَپ سے فوری طور پر سنٹرل جیل شفٹ کر رہے ہیں۔ وہاں سے انتہائی خفیہ طور پر کراچی سے باہر کسی اور جیل میں منتقل کر دیا جائے گا۔ فی الحال آپ اس معاملے کو بند کتاب سمجھیں۔ بس اتنا ذہن نشین کر لیں کہ چودھری فضل اللہ کی جان کو زبردست خطرہ درپیش ہے۔منشیات کے عالمی قصائی پہلے ہی اس کی زبان بندی کا حکم نامہ جاری کر چکے ہوں گے۔''

آئی جی صاحب کے بنگلے سے جب میں گھر پہنچی تو میرا بیٹا کرامت جو میرے ساتھ ساتھ لگا گھوم رہا تھا مجھ سے لپٹ گیا۔

اور بولا۔''موم گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں آپ کے ساتھ ہوں ہم دونوں حالات کا مقابلہ کرینگے۔''

کرامت جو ہر وقت گانے ناچنے اور دوستوں کے ساتھ آوارگی میں مگن رہتا تھا۔ میرے ایک واحد سہارے کے طور پر کھڑا ہو گیا تھا اور اچانک بڑا بھی ہو گیا تھا۔ مجھ سے بھی عمر میں بہت بڑا۔

بیٹی مومی کو صورتِ حال کا رات دیر گئے پتہ چلا جب وہ اپنی کسی نام نہاد گرل فرینڈ کے پاس سے گھر لیٹ نائٹ آئی۔ اس نے بہت دنوں کے بعد پہلی مرتبہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

اس کی آنکھوں نے میری آنکھوں سے کہا۔

''ممّا میں آپ کی بیٹی ہوں۔ ازلی اور ابدی آپ کی ہوں اور آپ کی رہوں گی۔''

زندگی ایک مرتبہ پھر حالات کے محاصرے میں آ گئی تھی۔۔۔۔

ایک مرتبہ پھر معاشرہ میرے خلاف کھڑا ہو گیا تھا۔۔۔۔میں جو مشکلات میں ایک مرتبہ پھر گھر گئی تھی۔۔۔۔معاشرہ مجھ سے متصادم تھا۔۔۔۔معاشرے کی انگلیوں کا رخ میری جانب تھا اور ہر جانب سے ہم پر تھو تھو پڑ رہی تھی۔۔۔۔ منشیات فروشی کا کالک ہمارے چہروں پر تھوپا جا رہا تھا۔ حالانکہ میرا ایسے کسی معا ملے سے کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ سب کچھ مجھ سے بالا ہی بالا ہوا تھا۔ میں نے تر نت فیصلہ لیا۔''میں جوان معاملات سے بالا تھی۔۔۔۔لاتعلق تھی۔۔۔۔لاتعلق ہی رہونگی۔''

میں نے وہ بنگلہ چھوڑ دیا اس آم کے درخت سے نجات پالی جس کی جڑوں میں کسی نے اپنی بیوی کا خون ٹپکایا تھا۔ اور جس کے ڈالے سے لٹک کر ایک انسانی زندگی نے اپنا خاتمہ کیا تھا۔

میں نے وہ شہر ہی چھوڑ دیا جس میں میرے شوہر نے منشیات فروشی کے ناپاک دھندے سے اپنی روح کو پلید کیا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کرامت اور اپنی بیٹی مومی کے ساتھ بدنامی سے گم نامی کی جانب چھلانگ لگا دی۔

○

''درہم برہم تصویریں''

ٹوٹے پھوٹے آئیں جیسے، گھٹتے گھٹتے سانس
پیروں سے چمگادڑ چمٹے، سر پر کھڑکیں بانس
جھاڑو جھاڑن موج منائیں، ان کا اپنا راج
پیپا بیٹھا ڈھول بجائے، کتھک ناچے چھاج
درہم برہم سب تصویریں، طرفہ تر احوال
مرزا غالب اُلٹے لٹکیں، سجدے میں اقبال
اُڑتی پھرتی جھاڑی پکڑے لوگوں کی شلوار
جب تک وہ شلوار چھڑائیں، رخصت ہو دستار

نذیر احمد شیخ (•)

○

ننگی

رخسانہ صولت

(اسلام آباد)

میں نے آنکھیں کھول کر کنوئیں کی منڈیر سے پرے جھانکنا چاہا۔تو میری پلکیں مکڑی کے جالے میں اٹک کر رہ گئیں۔اوہ......تو یہ بھی ابھی ہی ہونا تھا۔کنواں واقعی اتنا اجاڑ بیابان اور بھیانک ہے۔کاش کوئی مجھے یہ بتا سکتا۔نہیں۔کبھی میرا دماغ جنگلوں پہاڑوں کی غلط سمت میں بھی بھٹکنے لگتا ہے۔

میں نے تو سنا تھا کنوؤں کی گہرائی ایک مخصوص حد پر ختم تو ہو جاتی ہے۔مگر چشمے کا منبع اتنا وسیع ہوتا ہے۔کہ کنوئیں کی مخصوص حد اس جگہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے......اوہ......

میں بھی کن بھول بھلیوں میں الجھ گئی۔جب میں نے اپنی گردن واپس پیچھے کی طرف موڑنا چاہی تو محسوس ہوا میری آنکھوں کی گھنی باڑ جڑ سے اکھڑ رہی ہے۔تکلیف سے بند چشموں کے منہ پھٹنے لگے "ماں" بے اختیار زبان پر یہ لفظ سسکیاں لینے لگا۔اچانک قہقہوں کی کھنک نے میری سوچوں کے تاج محل مسمار کر دیئے۔آج یہ سوگواری کی بُو کیوں پھیلی ہوئی ہے۔کیا موسم کا مزاج بھی ہرجائی ہو گیا" ایک لمحے کے لئے آواز تھم گئی۔مگر یہ تو دھرتی کے باسیوں کا خاصا ہے۔قدرتی عوامل اس خاصیت سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔

"پھر یہ سب کیوں اور کیسے ہوا؟"

آواز سوالیہ نشان میں ڈھل گئی۔

"بات تو پتے کی کہی تھی" میں نے نظروں کی دوربین سے بولنے والے کے وجود کو ٹٹولنا چاہا۔تو نظریں سخت دیواروں اور زنگار ماحول سے ٹکرا کر واپس دماغ کے خالی کشکول میں سہم گئی۔

"آہ ماں! بہت بزدل ہو" ...... تیر بھی چلنا جانتی ہو۔مگر اس کے بعد دیکھنے کا حوصلہ بھی رکھو۔ہمت پیدا کرو اور سامنے آ کر بات کرو۔

اب تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ انسان کی خاصیت قدرتی عناصر اور عوامل نے اپنا لئے ہیں۔مگر کیوں اور کیسے؟"

آنکھیں ہیں!؟

دیکھ سکتی ہو!؟

دیکھ لو۔دنیا کے بوسیدہ جالوں سے اٹے مفلسی غربت اور افلاس کے کائی زدہ سمندر میں جھانکو ہاں ہاں...... آگے بڑھ کر جھانکو......دیکھو۔اور خوب غور سے دیکھو۔انسانیت کی زخمی اندھی اور لنگڑی لولی سسکتی لاش کو دیکھو۔

جس کے اردگرد موٹی موٹی مکھیاں اپنی زبان میں کوئی نوحہ گاتے ہوئے رقص کناں ہیں۔

کہو یہ منظر پسند آیا؟

اس نے مجھے گھورا۔میں نے مسکرا کر دیکھا۔

آگے بڑھو۔اور دیکھو!

یہ اشرف المخلوقات کے نادر نمونے ہیں۔جو اپنے آباؤ اجداد کے نام کو مثل طور زندہ جاوید کرنے کے لئے ہمہ وقت کوشاں ہیں اس نے دانتوں میں انگلی دبالی۔سامنے چند ننگ دھڑنگ بھینسے ایک کمزور اور مریل سے مینڈھے کی گردن دبائے ہوئے ڈکار رہے تھے۔دوسری طرف ایک پری چہرہ ایک بدہئیت اور بھونڈے سراپے والے سیاہ وحشی کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف تھی۔میرے دوست کی نظریں اس جوڑے پر جم گئیں۔اسے جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔میں نے طنزاً کہا "دیکھا" یہ بھی ایک نیچرل عمل ہے"

پہلی بار وہ بولا۔

"اس لئے کہ نیچرل عمل نیچرل ہونا چاہیے۔جیسا کہ نیچر آزاد ہے۔اس کی روح آزاد ہے پھر فطرت کے کسی عمل پر کوئی پہرے تو نہیں اس کا ہر انداز خوبصورت دلنشیں اور افادی ہوتا ہے۔اور اب سن لو تم۔کہ اس سمندر کا سب سے خوبصورت جوار بھاٹا اسی جگہ پر نظر آیا ہے۔

میرا چہرہ لٹک گیا۔روح کی زردیاں کائنات پر دھند بن کر چھا گئیں۔ذہن سولی پر لٹک گیا

"ٹھیک ہے دوست! تمہارا قصور نہیں۔تم بھی ٹھیک ہو......مگر کاش کہ تم یہ جانتے۔اس فکری لبرٹی کی قیمت کتنی زیادہ ادا کرنی پڑتی ہے۔تم اس شیش محل کے اندر فطری آزادی کی بات کرتے ہو۔یہ جانتے ہو۔کہ اس شیش محل کے خوبصورت صاف شفاف دیواروں کے باہر کا یہ منظر تمہیں نیچرل لبرٹی کا ایک عنصر نظر آیا۔مگر اس فطری تقاضے کو پورا کرنے کے لئے ان اونچی اونچی دیواروں کو بھی تو کرچ کرچ کر دو"

اس لمحے میری آواز کے ساتھ کتنی دردناک آوازیں شامل ہو گئیں تھیں۔ہم سب حیران تھے۔

"یہ سب کیسے ہوا؟ یہ کس کی آوازیں تھیں۔تم نے بے اختیار پوچھ ڈالا"

اور بجائے اس کے جواب میری زبان سے ادا ہوتا سمندر کے ہرے ہرے پانی سے سینکڑوں گردنیں سطح پر ابھر آئیں۔ان کے چہرے نچے ہوئے تھے۔خراشوں نے دلخراش تصویروں کا روپ دھار لیا تھا۔کسی کی آنکھ غائب تھی تو کسی کا سر منڈا ہوا تھا۔کسی کے ہونٹ کٹے ہوئے تھے تو کسی کے کان کا

ایک سرالٹک رہا تھا۔

حسرتوں اور آرزوؤں کے لاشے ان کی آنکھوں میں بے کفن تھے۔ زبانیں کٹی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ٹک اس طرف دیکھتی رہیں۔ اور پھر غائب ہو گئیں۔

پانی کی سطح پھر برابر ہو گئی تھی۔

رنگین مچھلیاں کبھی سطح پر ابھر آتیں۔ کبھی زیرِ سطح اٹکھیلیاں کرتی پھرتیں۔

سفید سفید شفاف پروں والی مرغابیاں اپنے جھرمٹ میں آتیں اور اپنا سینہ سمندر کے سینے سے رگڑ کر لذت کے نشے میں مخمور ہو کر پھر اڑ جاتیں ''ہاؤ رومانٹک؟'' اس کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ زبان لڑکھڑانے لگی۔ اور جسم جھر جھری لینے لگا۔

ہوش میں آؤ دوست۔ یہ کائنات کی ایک حقیقت ہے۔ حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کرتے۔

''دوست یہ سب کیا تھا؟''

''یہ سب برہنہ کیوں تھیں......؟

''ان کے چہروں پر خون کیسا تھا......؟

''تم پریشان کیوں ہو؟''

''جاننا چاہتے ہو تو سنو۔ یہ بھی نیچرل لبرٹی کا ایک نیا انداز تھا فرق صرف یہ ہے کہ اس نیچرل ماحول میں یہ سب کچھ عجیب اور مافوق الفطرت تھا۔ اس کی سزا یہی ہو سکتی تھی نا؟ اس سے بھی بدتر۔

اگر تم ان کی زبان سمجھتے تو یقیناً یہ جان جاتے۔ کہ وہ اس سارے عذاب سے خوفزدہ نہیں۔ وہ خود تو بھینٹ چڑھ گئیں مگر راستے کے پرخار کھنڈرات میں انگلیوں کے نشان چھوڑ دیئے ہیں۔ تاکہ کوئی تو اس راہ پر ان کی تقلید کرے''

''وہ کون ہوگا؟''

''میں بتاؤں؟''

''مجھ میں...... ہاں سامراجی عفریت کا میں شکار ہوں۔ یہ میرے بال دیکھ رہے ہو۔ نہ یہ بال کٹیں گے نہ آنکھیں پھوٹیں گی۔ نہ زبان کٹے گی...... اور میں اس طوفان میں وہ آہنی دیوار بن جاؤں گی۔ جسے زلزلوں کی دھمک بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکے گی۔

''سچ واقعی یہ تم کہہ رہی ہو''؟ اس کے لہجے کی خوشی دم توڑ گئی مگر تم۔ پھر ایک رنگین خوبصورت مچھلی ہو۔ تمہارے لیے باہر کی ہوا بڑی زہریلی ہے۔ بہت ہی......اپنے اندر ہی گھٹ کر دم توڑ دو گی......

میں بھڑک اٹھی...... میں جلوں گی......لہولہو ہو جاؤں گی...... ہوا کا زہر نگل لوں گی......تلواروں کے زخم پی جاؤں گی۔ مگر اس راستے پر جب پیر اٹھ گئے۔ تو کوئی لوٹا نہیں سکے گا۔

اس لیے کہ میں قبیح معاشرے میں اپنے ہم جنسوں کا ایک دوسرے کی گردن پر خون نہیں دیکھ سکتی۔ اندھا سماج اپنی موت آپ مر کر رہے گا۔

اچھا! تو ٹھیک ہے۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی ہم دونوں نے ایک چھلانگ لگائی اور شیش محل کو برف کی طرح باریک ذرّوں میں تبدیل کر دیا۔ باہر روشنی کی فضا میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور حیران رہ گئے۔ ہم دونوں ننگے تھے۔ لباس کی کوئی دھجی بھی تو جسم پر باقی نہیں تھی۔ میں نے دیکھا اس کا جسم بھی خراشوں اور زخموں کی ایک نمائش تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے......اس نے مجھے گھورا لفظ اس کے ہونٹوں سے پھسلے۔

''ننگی''

''کون......میں''

''میں......تم کائنات''

اور ہم اپنے اپنے برہنہ جسم چھپانے کیلئے مخالف سمتوں میں دوڑ پڑے۔

ایک آواز گونج رہی تھی ''نیچرل عنصر نیچر کا ایک حصہ ہوتے ہیں......پھر نیچر تو برہنگی کا نام ہے''

''پھر ہم سب ایک دوسرے سے آنکھیں کیوں چراتے ہیں''

میں پل بھر کو رکی......اور جھیل میں تیرتے کنول اپنی ہتھیلیوں میں بھر لیے۔

''ہشت! ننگی''

ایک قہقہہ گونجا اور کائنات کے حسن میں ڈوب گیا۔

''سائنسدانوں کا دعویٰ''

سوئٹزر لینڈ کے سائنسدانوں نے انسانی دماغ سے مشابہہ چپ تیار کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ مذکورہ چپ اسی طرح کام کر سکتی ہے جس طرح انسانی دماغ معلومات کو پروسیس کرتا ہے۔ سائنسدانوں کا دعویٰ ہے جس برق رفتاری سے انسانی دماغ کام انجام دیتا ہے اس چپ کی مدد سے اتنی ہی رفتار سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس چپ کی ایجاد سے اس راز سے بھی پردہ اُٹھ گیا ہے کہ دنیا کے موثر ترین کمپیوٹرز کس طرح کام کرتے ہیں۔

○

''آفت کی پوٹ''

دیپک بدکی

(دہلی، بھارت)

کہتے ہیں جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں۔ انسان کی سوجھ بوجھ اور ہمہ دانی اس میں کچھ بھی نہیں کر پاتی۔ یہ حقیقت میرے سامنے اس وقت کھلی جب میں نے روشن لال سپرو اور اس کی بیوی رجنی کو پہلی بار دیکھ لیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایک بگلے کی شادی ایک کوّے کے ساتھ کیسے ممکن ہوسکی۔

ملاقات کے وقت رجنی لگ بھگ چالیس سال کی عورت لگ رہی تھی اور روشن لال اس چار پانچ سال بڑا معلوم ہو رہا تھا۔ دونوں نے تقریباً تیس برس اکٹھے ایک ہی چھت کے نیچے گزارے تھے البتہ کچھ ابتدائی برسوں کو چھوڑ کر ان کے بستر ہمیشہ الگ رہے۔ رجنی ساری عمر ایک پتی برتا عورت کا روپ بھرتی رہی جبکہ روشن لال نے نان ونفقہ مہیا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

دراصل پرانے زمانے میں شادیاں بچپن ہی میں ہوا کرتی تھیں۔ والدین بچوں کی رائے جانے بغیر ہی ان کی شادی طے کر لیتے تھے۔ برہمنوں کے ذریعے دونوں کے زائچے ملوائے جاتے تھے اور اگر گرہوں میں کہیں کوئی نقص نہ ملتا تو شادی پکی ہو جاتی تھی۔ بہر حال اتنا انیائے تو میری سمجھ سے باہر تھا۔ ایسا کام یا تو کوئی نابینا کر سکتا تھا یا پھر کوئی سوتیلا جس کی آنکھیں گدّی میں ہوں۔ مجھے ان کے والدین پر تعجب ہو رہا تھا کہ انھوں نے کیا سوچ کر ان دونوں کے بیچ ازدواجی گانٹھ باندھ لی تھی۔ بے چارے دونوں اس دلدل میں پھنس کر عمر بھر ایک دوسرے کا بوجھ ڈھوتے رہے۔

روشن لال شادی کے سمئے صرف پندرہ سال کا تھا۔ میٹرک میں داخلہ لیا تھا۔ چونکہ وہ بہت ہی ذہین تھا اس لیے پتا جی کو پورا بھروسہ تھا کہ بیٹا میٹرک پاس کر کے محکمۂ مال میں ضرور نوکر لگ جائے گا اور پھر ان کے گھر میں بھی اسامیاں ڈالیاں اور نذرانے لایا کریں گی۔ لیکن بیٹے نے معلّمی کو ترجیح دے کر اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

مشترکہ کنبہ تھا۔ والدین اور چار اولاد۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ روشن لال ان میں سب سے بڑا تھا۔ باپ ستّر روپے ماہوار کی نوکری پر اتنے بڑے عیال کی پرورش کر رہا تھا۔ نہ کہیں کوئی چک تھا اور نہ ہی کوئی میوہ باغ۔ ارزانی کے دن تھے بڑی فراغت سے نبھتی تھی۔ روشن لال اسکول ماسٹر کیا بنا کہ گھر میں پچاس روپے زیادہ آنے لگے مگر ساتھ ہی ایک فرد کا اضافہ بھی ہو گیا۔ تنگدستی بدستور جاری رہی۔ شومیِ طالع یہ کہ ماں ورثے میں اپنے ساتھ غصہ اور تند مزاجی لے آئی تھی جس کی بدولت گھر ہمیشہ کورو کشیتر بنا رہا۔ وہ بات بات پر خفا ہو جاتی، چیختی چلاتی اور آسمان سر پر اٹھا لیتی۔ اس کے جلال وغضب سے بچنے کے لیے فرار پسند خاوند نہ صرف دفتر کے بعد اپنے دوستوں کے سنگ وقت گزارتا بلکہ رات کو اکثر رت جگے کے بہانے دور پہاڑی پر واقع دیوی کے مندر چلا جاتا۔ نتیجے میں ماں کا سارا غصہ بچوں کو جھیلنا پڑتا تھا۔

بہو آئی تو وہ بھی جھڑ بیری کا کانٹا نکلی۔ سیاہ فام تو تھی ہی اس پر زبان دراز بھی تھی۔ کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔ ساس سیر تھی تو بہو سوا سیر۔ رجنی بات بات پر نافرمانی کرتی اور ساس سے لڑنے کے لیے موقعے کی تاک میں رہتی۔ نتیجے میں کچھ جھڑپوں کے بعد ہی ہٹی کٹی ساس بلڈ پریشر کے عارضے میں مبتلا ہوگئی اور کئی روز بستر پر پڑی رہی۔ پھر کیا تھا، گھر کا کام یا تو روشن لال کو کرنا پڑا یا پھر اس کے بھائی بہنوں کو کیونکہ رجنی سر درد کا بہانہ کر کے خود کو کمرے میں بند کر کے لیٹ گئی۔ آہستہ آہستہ ساس کی بیماری معمول بن گئی، روشن لال اور اس کے بھائی بہن کھانا بناتے، کپڑے دھوتے اور بعض اوقات سارے مکان کی صفائی اور لپائی پتائی بھی کرتے۔

رجنی کی بڑی بہن دہلی میں مقیم تھی۔ ایک دفعہ اپنے شوہر کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں بتانے کشمیر چلی آئی۔ چھوٹی بہن نے گھر گرہستی کے بارے میں نمک مرچ لگا کر درد بھری کہانیاں سنائیں تو وہ پسیج گئی۔ پاس ہی بیٹھے اس کے شوہر نے رجنی کو صلاح دی۔ ''کیا رکھا ہے کشمیر میں؟ نہ روزگار دستیاب ہے اور نہ صلاحیت کی قدر ہوتی ہے۔ گدھے گھوڑے سب برابر۔ ایک ہی رسّی سے ہانکے جاتے ہیں۔ اپنے پتی دیو سے کہہ دو کہ کنویں کا مینڈک نہ بنے۔ دہلی میں نوکری ڈھونڈ لیں۔ اچھی تنخواہ مل جائے گی۔''

''وہ نہیں مانیں گے۔ کہتے ہیں یہاں پر ماتا پتا ہیں، بہن بھائی ہیں۔ ان کی ذمہ داری کون لے گا''، رجنی نے رنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

''میں ان کی دُبدھا سمجھ سکتا ہوں۔ آخر ماں باپ، بھائی بہن کا بھی کوئی حق ہوتا ہے۔ مگر ذرا یہ بھی تو سوچ لو کہ اگر وہ دہلی جائیں گے یہاں سے کئی گنا زیادہ تنخواہ پائیں گے۔ پھر وہاں پر اتنی بچت ہو سکتی ہے کہ ہر ماہ کچھ روپیہ گھر بھیج سکتے ہیں اور آگے جا کر بھائی بہنوں کی شادیاں بھی دھوم دھام سے کر سکتے ہیں۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔''

مشورہ معقول تھا۔ رجنی نے اپنے شوہر کو دہلی لے جانے کے لیے ایڑی چوٹی کا پسینہ بہایا اور آخر کار کامیاب ہوگئی۔ روشن لال اس لیے بھی راضی ہوا کیونکہ اس نے شادی کے بعد پرائیویٹ طور پر بی ایڈ اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کر لی تھیں مگر محکمے نے اس کی تعلیمی قابلیت کو نظر انداز کیا تھا۔ موقع ملتے ہی دونوں میاں بیوی والدین اور بھائی بہن کو چھوڑ کر دہلی پہنچ گئے۔

ساس سسر کا بکھیڑا ختم ہوگیا۔ رجنی اپنی اس کامیابی پر بغلیں بجانے

لگی۔ وہ ایک نئے ماحول میں پہنچ گئی تھی جہاں صرف وہ تھی، اس کا شوہر تھا اور اس کی چھوٹی سی دنیا تھی۔ ہر لڑکی کی طرح اس نے بھی بچپن میں ایک حسین گھر بسانے کا خواب دیکھا تھا اور اب وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا تھا۔ اس نے دنیا کی پرواہ کیے بغیر اپنی اڑان کی سیمائیں طے کرنا شروع کر دیں۔

اجنبی شہر میں ہر جانب بھیڑ ہی بھیڑ نظر آ رہی تھی۔ ہر چہرہ انجانا لگ رہا تھا اور جو چند جانے پہچانے لوگ تھے بھی وہ خال خال ہی دکھائی دے رہے تھے۔ کسی قیدی پرندے کا پنجرہ اچانک کھول دیا جائے وہ پھر سے اُڑ جاتا ہے اور کھلے آسمانوں میں بے تحاشہ پرواز کرتا رہتا ہے۔ اسے نہ بھوک کی فکر رہتی ہے اور نہ سفر کی تھکاوٹ ستاتی ہے۔ اس کو یہ خیال نہیں رہتا کہ آزادی اپنے صیاد بھی پیدا کرتی ہے۔ دونوں میاں بیوی اس بھیڑ میں کھو جانے کے خواہاں تھے۔ اب نہ ماں باپ کی ہدایتیں تھیں اور نہ ساس سسر کی نصیحتیں۔

روشن لال کی تقرری ایک گورنمنٹ اسکول میں بطور استاد ہو گئی۔ دو سو روپے ماہانہ ملنے لگے جو آج کے بیس ہزار کے برابر تھے۔ رجنی کھلی فضا میں سانس لینے لگی۔ اس نے سہیلیوں اور نئے جانکاروں کا ایک جال سا پھیلا دیا۔ اُدھر شوہر صبح سویرے لنچ کا ڈبہ لے کر دفتر نکل جاتا اِدھر رجنی دہلی کی سڑکیں ناپنے نکل جاتی۔ کبھی بہن کے گھر، کبھی سہیلیوں کے پاس اور کبھی رشتے داروں کے ٹھکانوں پر۔ نہ کوئی پوچھنے والا تھا اور نہ ہی ٹوکنے والا۔ البتہ پابندیٔ وقت کا احساس اتنا شدید تھا کہ پتی کے گھر پہنچ جانے سے پہلے ہی وہ گھر میں حاضر ہو جاتی۔

آزادی یک طرفہ نہیں ہوتی۔ روشن لال بھی کھلی فضاؤں میں پر تولنے لگا۔ اجنبی دنیا، اجنبی لوگ، اجنبی رشتے۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی نہ بندھو۔ اس کے دوستوں کا دائرہ بڑھ چکا تھا مگر اکثر و بیشتر ایسے تھے جو بادہ و جام کے رسیا تھے۔ روشن لال کو شب زفاف ہی سے بیوی کی صورت پسند نہ تھی۔ دونوں کے درمیان کبھی کوئی جسمانی یا جذباتی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی حالانکہ روشن لال نے اس بات کا کبھی کھل کر اظہار نہ کیا۔ بہر حال اسی تشنگی کے باعث وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ بالا خانوں پر دستک دینے لگا اور بعض اوقات وہیں پر راتیں بھی گزارنے لگا۔ جس رات جلدی گھر آ جاتا وہسکی کی بوتل کھول کر بیٹھ جاتا اور چار پانچ پیگ پی کر لڑھک جاتا۔ اخراجات اتنے بڑھ گئے تھے کہ اپنے سوا باقی ساری دنیا بھول گیا۔ آبائی گھر کی یادیں سب ورق پارینہ بن کر رہ گئیں۔

دہلی آئے ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ نزدیکی اسکول کی ایک استانی پورنیما مہتا دل دے بیٹھی۔ اجلا چہرہ مہرہ، پنجابی چال ڈھال اور خوش گلو۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ پورنیما کے قرب سے روشن لال اپنی زندگی کے خلا کو پُر کرنے لگا۔ نزدیکیاں اتنی بڑھ گئیں کہ باقی سبھی وجود دھندلے پڑ گئے۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ رجنی کو کچھ بھی خبر نہ ہوئی۔ جب آنکھ کھلی تو سب کچھ لُٹ چکا تھا۔ روشن لال نے اس اب مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ گھر آتا تھا تو مہمان کی مانند اور رہتا تھا تو بیگانوں کی طرح۔ رجنی میں اسے ایسی ڈائن نظر آ رہی تھی جو کھائے تو منہ لال، نہ کھائے تو منہ لال۔ وہ حیران و پریشان تھی کہ یہ سب اچانک کیسے ہو گیا۔ رکھیل سے چوکس رہنا اور طوائفوں کی خبر گیری کرنا گرہستنوں کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ بڑی ہمت کر کے اس نے رکھیل کے گھر اور آفس پر کئی بار ہلا بول دیا اور جتنا ہو سکا اس کو برا بھلا کہہ کر واپس آ گئی مگر طوائفوں کے منہ لگنے کے لیے دل گردہ چاہیے، وہ کہاں سے لاتی۔ اور پھر ایک ہوتی تو چلی بھی جاتی، وہاں تو پورا بازار سجا تھا کہاں کہاں چلی جاتی۔

روشن لال ان سب باتوں سے لاتعلق اپنی دُھن میں مست چلا جا رہا تھا۔ مستی کا کیا! وہ تو اندھا بنا دیتی ہے۔ اس نے نہ جانے کس کوٹھے پر آتشک بیماری مول لی۔ بہت علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا اور زندگی کے باقی ماندہ دن اسی طرح مزے سے گزارنے لگا جس طرح پہلے گزارتا تھا۔ بیوی گھر گھر جا کر روتی رہی اور اپنے شوہر کو بدنام کرتی رہی مگر وہاں کسی کا کیا بگڑنے والا تھا۔ وہ رشتے داروں کی ہمدردی پانے کے لیے کشمیر بھی جانے لگی مگر وہاں بھی کسی نے کان نہیں دھرا۔ بس تھوڑی بہت ہمت بندھائی اور دو چار بول ہمدردی کے بول دیے۔ دراصل جو سننے والے تھے وہ تو رحمت حق ہو چکے تھے اور جو بچ گئے تھے وہ انھیں کب کا بھول چکے تھے۔ یہ وہی آبائی وطن تھا جہاں سے رجنی اپنے خاوند کو بھگا کر لے گئی تھی پھر وہاں کون تھا جو اب ان کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو جاتا۔ میاں بیوی دونوں کی حالت اس سانپ کی سی ہو گئی جس کے منہ میں چھچھوندر ہو، نگلے تو اندھا اُگلے تو کوڑھی۔ اندر اندر دل جلتا رہا اور اوپر اوپر فرحت کا خول چڑھاتے رہے۔

آخر کار وہی ہوا جس کا روشن لال کو کب سے انتظار تھا۔ باون سال کی عمر میں ہی وہ بھگوان کو پیارا ہو گیا۔ اپنی نگوڑی ناٹھی بیوی کے لیے صرف پنشن کی رقم چھوڑ گیا۔ اس نے مرنے سے پہلے اپنی وصیت اسکول کے غریب بچوں کے نام کر لی تھی۔

''میں، روشن لال سپرو ولد جگن ناتھ سپرو ساکن ۵۳، بلاک سی، ٹیگور گارڈن، دہلی اعتراف کرتا ہوں کہ میری شادی میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ میری ازدواجی زندگی ہمیشہ کانٹوں کا بستر بنی رہی۔ میری بیوی چغد ہے۔ دوسروں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اس نے اپنی اور میری زندگی تباہ کر دی۔ چنانچہ اس کا کوئی بچہ نہیں ہے اس لیے اس کی ضروریات زندگی محدود ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اس کو بہلا پھسلا کر اس کی جائیداد ہڑپ لیں گے۔ اس لیے میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد گورنمنٹ سے واجب الادا رقوم میں سے صرف پنشن اور گریجوٹی کی رقم میری بیوی رجنی سپرو کو دی جائے جو اس کو کفایت شعاری سے جینے کے لیے کافی ہے۔ باقی واجب الادا رقوم اور جائیداد، جس میں میرا ذاتی فلیٹ، انشورنس، بنک و ڈاکخانے کے کھاتے

باقی صفحہ ۸۱ پر ملاحظہ کیجیے

''نئی تاریخ''

ڈاکٹر جمال نقوی

(کراچی)

بم سے اور گولی سے تسخیر کیا جائے گا
اب ہر اک شخص کو زنجیر کیا جائے گا

پہلے لاشوں سے بھری جائنگی قبریں ساری
پھر نیا شہر بھی تعمیر کیا جائے گا

سچ کتابوں میں، نہ ذہنوں میں رہے گا محفوظ
جھوٹ اس طرح سے تشہیر کیا جائے گا

یہ تو سب ہوگا، مگر دل میں خیال آتا ہے
کیا کبھی درد کو تصویر کیا جائے گا

جو بھی لکھا ہے جمالؔ اسکو مٹا کر اکدن
نئی تاریخ کو تحریر کیا جائے گا

○

محمودالحسن (راولپنڈی)

لُغت شناس نہ کوئی سُخن طراز مِلے
مِلے تو پھر کوئی دانائے حرفِ راز مِلے
خُدا کرے کہ بہ فیضِ جُنونِ عِشق مجھے
متاعِ درد ملے، سوزِ جاں گداز مِلے
نہ صُوفیوں میں، نہ پیرانِ خانقاہ میں تھے
رہِ وفا میں جو زندانِ پاکباز مِلے
سُنی ہیں ہم نے وفا کی کہانیاں کیا کیا
وُہ کون تھے جنہیں محمودؔ اور ایاز مِلے
نہیں مِلا تو مجھے میرے زخم کا مرہم
یہ اور بات کہ لاکھوں کرشمہ ساز مِلے
زبان سُوکھ گئی اب تو پیاس سے یارب
اس انتظار میں شاید مئے حجاز مِلے
وُہ جس کی لے سے ہم آہنگ ہوں طیورِ چمن
مرے چمن کو کوئی ایسا نئے نواز مِلے
مِلا ہے جو بھی اُنہیں سے مِلا، خدا کی قسم
جو اس جہان میں ہر شے سے بے نیاز مِلے
میں اُس دیار کی ہوں جُستجو میں سرگرداں
نہ این و آں میں جہاں کوئی اِمتیاز مِلے
یہ کاش حضرتِ اقبال سے کوئی پوچھے
کہاں کہاں اُنہیں شاہین و شاہباز مِلے
مرے خدا کو مرے سامنے جو لے آئے
خُدا کرے کبھی ایسی مجھے نماز مِلے
ہزاروں جسم ٹٹولے گئے مگر محمودؔ
نہ جاں گداز ملی ہے نہ دلگداز مِلے

○

سُرورانبالوی

(راولپنڈی)

جستجو جس کی سرِ دار ہمیں لائی ہے
دلِ نادان اُسی کا ہی تمنائی ہے

اے شبِ ہجر کہاں جاتی ہے کُچھ دیر ٹھہر
ایک مدت سے ترے ساتھ شناسائی ہے

عشق کو یاروں نے اِک کھیل ہی جانا لیکن
عشق میں اپنوں کے طعنے بھی ہیں رسوائی ہے

کاش مل جائے بھرے میلہ میں اکدن وہ بھی
اس طرح کی بھی تمنّا کبھی بر آئی ہے؟

آج کے دور میں دُکھ کون کسی کے بانٹے
بات ہم نے دلِ ناداں کو یہ سمجھائی ہے

ایک مُدت سے تجھے دل میں بسا رکھا ہے
ایک مُدت سے ترے در پہ جبیں سائی ہے

عشق نے دار پہ بھی سچ ہی کہا ہے ہر آن
عقل کا کیا ہے یہ ہر دور میں ہرجائی ہے

ڈوبنے والے کے ارمان لئے ہے دل میں
مُدتوں سے یہ جو پانی پہ جمی کائی ہے

بزم سے اپنی ہمیں اُس نے اُٹھایا تو سُرور
''دودتک دل کے دھڑکنے کی صدا آئی ہے''

○

غالب عرفان

(کراچی)

حرفِ آفاقیات لکھتا ہوں
آدمی کو نجات لکھتا ہوں

اپنے اندر کی سیر کر کے میں
ذات کو کائنات لکھتا ہوں

اُس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد
منظرِ شش جہات لکھتا ہوں

وصل کی چاندنی نہ راس ہو تو
ہجر کی واردات لکھتا ہوں

صبح کی ابتدا سے پہلے ہی
خواب کے واقعات لکھتا ہوں

درد کے تجزیے کے آخر میں
اس کا ہر التفات لکھتا ہوں

پڑھتے رہتا ہوں وقت کا چہرہ
آئنے کی صفات لکھتا ہوں

اس کی تصویر سامنے رکھ کر
داستانِ حیات لکھتا ہوں

بارگاہِ شعورِ عرفاںؔ میں
ذہن کے حادثات لکھتا ہوں

○

انتظار باقی (جھنگ)

تم نے کبھی نگاہ کو صحرا بنا دیا
آنسو کبھی روانی میں دریا بنا دیا

تیرے لبوں کی طرزِ بیاں نے اے چارہ گر
ہر داستانِ کرب کو مژدہ بنا دیا

اُسمیں ہے تیری یاد کی خوشبو بسی ہوئی
زخمِ جگر کو تُو نے تو غنچہ بنا دیا

گردِ سفر جو سر میں ہمارے پڑی کبھی
اسنے ہمیں زمین کا بیٹا بنا دیا

خاموش جب تلک تھا، کوئی جانتا نہ تھا
مجھ کو وضاحتوں نے تماشا بنا دیا

راہِ سفر میں شاخِ بدن چھید چھید کر
کانٹوں نے رہگذار کا نقشہ بنا دیا

پاؤں میں چاہتوں بھرے گرداب دیکھ کر
دریا نے میرے واسطے رستہ بنا دیا

میں کوہِ شوقِ دید ہوں عبرت بھرا نشاں
تیری بس اک تجلّی نے سُرمہ بنا دیا

دیر و حرم کا اُس نے عجب تصفیہ کیا
کعبے کو دیر، دیر کو کعبہ بنا دیا

باقیؔ، بُرا ہو شوق بھرے انتظار کا
مجھ کو کسی کا نقشِ کفِ پا بنا دیا

❍

غلام مرتضٰی راہی
(فتح پور، بھارت)

فلک پہ ابر نہ سایہ کسی شجر میں رہا
پناہ مانگتا پھرتا میں رہگزر میں رہا

جو ہفت خوانِ تخیل مری نظر میں رہا
وہ طے ہو کیسے؟ یہی سودا میرے سر میں رہا

مدافعت سے نہ فرصت کبھی ملی مجھ کو
کہ گھوم پھر کے سفینہ مرا بھنور میں رہا

جب اس کے در سے میں پلٹا تو کوئی راہ نہ تھی
عجب طلسمِ ملاقات کے اثر میں رہا

ہم اک بلند عمارت کے زیرِ سایہ رہے
اُجالا اس کی شبوں کا ہمارے گھر میں رہا

حدِ نگاہ سے آگے مری، پہنچنے پر
غبار کارواں سے کارواں نظر میں رہا

الگ تھی ایک تو رُوداد اس پہ حسنِ بیاں
مجھے لگا کہ میں شامل ترے سفر میں رہا

❍

خیال آفاقی
(کراچی)

فرشتوں میں ہی رہتے ہیں، نہ شیطانوں میں رہتے ہیں
ہم انساں ہیں تو اپنے جیسے انسانوں میں رہتے ہیں

خزاں سے جب ہوئے واقف تو یہ عُقدہ کھُلا ہم پر
کہ یارانِ چمن کیوں جا کے ویرانوں میں رہتے ہیں

ہمارے دل میں بھی رہتے تھے کچھ ارمان دنیا کے
مگر اب جیسے خود ہم اپنے ارمانوں میں رہتے ہیں

نئے انداز کے اڑتے پتنگوں سے کوئی پوچھے
کہیں جگنو بھی جا کے سوختہ جانوں میں رہتے ہیں

سیاسی خانوادوں کے ٹھکانے کیا بتائیں ہم
یہ زیریں ہو کہ بالا کچھ ہو ایوانوں میں رہتے ہیں

خبر ہے، مسجدوں کا رخ کیا ہے جب سے دہشت نے
خدا کو ماننے والے بھی بُت خانوں میں رہتے ہیں

پھر اک دن ایسا آتا ہے، ہلا سکتے نہیں لب تک
وہ ساری زندگی جو اپنے فرمانوں میں رہتے ہیں

اجل ان کو بھی پیوند زمیں کر دیتی ہے آخر
جو قلعوں، بالاخانوں اور کاشانوں میں رہتے ہیں

ملے کچھ تو ہمیں بھی کربِ آگاہی سے چھٹکارا
خیالؔ آؤ چلیں کچھ دیر نادانوں میں رہتے ہیں

○

نسیم سحر (راولپنڈی)

آج اِک دُور کے منظر سے بُلاوا آیا
دشت میں تھا کہ سمندر سے بُلاوا آیا

فیصلہ تھا تو یہی، اب نہیں جانا واپس!
شاید اُس کا بھی اِسی ڈر سے بُلاوا آیا

گُم ہؤا چاہتا تھا مَیں کہیں اپنے اندر
جب مِرے جسم کے باہر سے بُلاوا آیا

میری بے خوابی، کہ جانے ہی نہ دیتی تھی اُدھر
بارہا ورنہ تو بستر سے بُلاوا آیا

فتح کا جشن منانا ہے، سو واپس آؤ!
پیچھے ہٹتے ہوئے لشکر سے بُلاوا آیا

بند کر دینی پڑیں اپنی بیاضیں ساری
چھٹّیوں پر تھا کہ دفتر سے بُلاوا آیا

مضمحل تھے در و دیوار مِری ہجرت سے
کبھی دیوار، کبھی دَر سے بُلاوا آیا

مُلتوی اَور سبھی کام تو کر سکتا ہوں
رُک نہ پاؤں گا جو اُوپر سے بُلاوا آیا

سر کے بل جاؤں گا مَیں سُوئے مدینہ اب تو
کیوں نہ جاؤں کہ مقدر سے بُلاوا آیا!

دربدر، خاک بسر مَیں تو تھا صدیوں سے نسیمؔ
یاد آئی کِسے، کیوں گھر سے بُلاوا آیا؟

○

مقبول منظر

(جھارکھنڈ، بھارت)

سیاہ راہ کا پہرہ لگا تھا رستے میں
مقابل اُس کے مرا حوصلا تھا رستے میں

مرے وجود کا شاید وہ ایک حصہ تھا
جو ساتھ ساتھ مرے چل رہا تھا رستے میں

اُسی کی یاد کی خوشبو ہے ہم سفر میری
مجھے جو چھوڑ کے تنہا گیا تھا رستے میں

کڑی تھی دھوپ، تھے پیروں میں آبلے پھر بھی
میں لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا رستے میں

بُجھا گیا اُسے آنچل سے اپنے وہ ظالم
لئے چراغِ وفا میں کھڑا تھا رستے میں

زہے نصیب! کچھ اُس نے ہی رہنمائی کی
کھڑا جو میل کا پتھر ملا تھا رستے میں

قدم قدم پہ کسی امتحاں سے گذرا ہوں
قدم قدم پہ کٹھن مرحلہ تھا رستے میں

بتا رہا ہے مہاجر بچشمِ تر منظؔر
کہ اُس کا قافلہ کیسے لُٹا تھا رستے میں

❍

مناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

کہانی کیسے ہم لائیں بیاں تک
کسی صورت نہ جب آئے زباں تک

کسی مجبور کی حسرت ہی کیا ہے
اگر آئی تو فریاد و فغاں تک

فسانے بھی سلوکِ دوستاں کے
بس آ کر رک گئے اشکِ رواں تک

کبھی ایثار ہی تھی جو سراسر
وفا اب رہ گئی سود و زیاں تک

سناتے جور و جبر دشمناں کے
ہیں لے دے کے مرے ہی آشیاں تک

کہاں کچھ کام آئے بال و پر بھی
مری پرواز کب ہے آسماں تک

مناظؔر کا پیامِ دل شکستہ
کوئی لے جائے تو نا مہرباں تک

❍

جاوید زیدی
(نیویارک)

بنے لاکھ وہ مسیحا میرا چارہ گر نہیں ہے
میرے دل کے ٹوٹنے کی جیسے کچھ خبر نہیں ہے

اے طبیب جسم و جاناں، اے حکیم ہوش منداں
جو نہ شامِ غم ہو اپنا میرا نوحہ گر نہیں ہے

میری غربتوں کے ساتھی، یہ ہی رند، یہ ہی عاصی
کوئی پارسا جہاں میں میرا ہم سفر نہیں ہے

یہ ہے فیض ہجرتوں کا، یہ ثواب دِین و دنیا
میں ہوں در بہ در مسلسل میرا کوئی گھر نہیں ہے

کسی اور جا صدا کر کسی اور آستاں پر
میں فقیرِ بےنوا ہوں میرے پاس زر نہیں ہے

وہی سچ کا زہر پینا، وہی دل کی بات لکھنا
میرے پاس اور زیدیؔ، نیا کچھ ہنر نہیں ہے

○

ڈاکٹر نذیر فتح پوری
(پونے، بھارت)

قدم جو اٹھا وہ گراں کب ہوا ہے
ہمارا سفر رائیگاں کب ہوا ہے

رہا سرخ موسم، کبھی سرخ کاغذ
ہمارے لہو کا زیاں کب ہوا ہے

چکائی گئی کس سے قیمت جنوں کی
حسابِ دلِ دوستاں کب ہوا ہے

بنامِ بصیرت سہا ہے جو ہم نے
غزل میں وہ سب کچھ بیاں کب ہوا ہے

ابھی تو ہے تخلیق کی مانگ سونی
ادب غیرتِ کہکشاں کب ہوا ہے

ابھی انگلیاں تازہ دم ہیں ہماری
قلم سے ابھی خوں رواں کب ہوا ہے

نذیرؔ اس کی دیوار کا نرم سایہ
ہمارے لیے سائباں کب ہوا ہے

○

اشرف جاوید
(لاہور)

نظر آتا ہے جو بیٹھا ہُوا باہر میرے
سانس لیتا ہے حقیقت میں وہ اندر میرے

اپنی قامت تو کبھی مجھ پہ نہیں کھُل پائی!
اک دیا جلتا ہے، بس آ کے برابر میرے

چاک سے اُس کو اتارا ہے تو اب سوچتا ہوں
ٹوٹ جائے نہ کہیں ہاتھ سے گر کر میرے

بے خیالی میں ٹھنی رہتی ہے خود سے اُس کی
نوچتا رہتا ہے وہ بیٹھا ہوا پَر میرے

اب تو لگتا ہے بَسر ہو گی سفر میں ساری
راستے پاؤں پڑے رہتے ہیں اکثر میرے

اُس کا پیکر ہے کہ پارس سے تراشیدہ وجود
ہاتھ سونے کے ہوئے جاتے ہیں چھُو کر میرے

خوش ہُوا جاتا ہے دے دے کے اذیّت مجھ کو
زخم کو آنچ دکھاتا ہے ستم گر، میرے

نکلا جاتا ہوں میں منجدھار سے لے کر اُس کو
ہاتھ ملتے نظر آتے ہیں سمندر میرے

رکھ دیا ہے سرِ محرابِ غزل ایک چراغ
کاٹے جاتی ہے ہوا خوف سے چکر میرے

○

سید سعید نقوی
(نیویارک)

جو خریدار ہے قیمت بھی وہی لکھتا ہے
اس عبادت میں یہ میزان ہوا کرتا ہے

حیف گھونگے پہ اماں کوئی نہیں دیتا ہے
وہ سمندر ہو کہ ساحل جو یہاں بہتا ہے

روشنی مانگ کے پائے ہیں اجالے ہم نے
لایئے دیدۂ عبرت جو کہیں بکتا ہے

کسی امید کی بوتل میں مقید رکھوں
یہ ایک جن جو میرے استخواں میں رہتا ہے

وہ ترکِ رسمِ وفا جب بھی آزماتے ہیں
سیالِ عشق کا بھاؤ زمیں پہ گرتا ہے

ہوسِ دیدہ وری جب بھی نظر میں رکھی
آسماں حدِ نظر سے بھی پرے ملتا ہے

جو شخص اپنی ہی قیمت سمجھ نہیں پاتا
دکانِ وقت میں کوڑی کے مول بکتا ہے

○

دو پل مِٹھے

(پنجابی)

تحریروترجمہ: حنیف باوا

(جھنگ)

آج بڑا خوشگوار دن تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل تیر رہے تھے۔ گرمی کی شدت میں بہت حد تک کمی ہوگئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بوندوں کی بارش پھوار کی صورت میں برس رہی تھی جو دن کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔

صبح کا وقت تھا جب میں جھنگ شہر کے ٹانگوں والے اڈے پر اومنی بس سے اُترا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی اس بس سے باہر آ گئی۔ ہم دونوں میونسپل کمیٹی کے پرائمری سکولوں میں پڑھا رہے تھے۔ میں لڑکوں والے وہ لڑکیوں کے سکول کی استانی تھی۔

ہم ایک دوسرے سے شناسا نہیں تھے۔ میں نئے شہر کے انصاری محلے سے آتا تھا اور وہ مگھیانے شہر کے شہید چوک سے سوار ہوتی تھی۔ یہ اتفاق سمجھو یا وقت کی مجبوری کہ ہم تقریباً ہر روز ایک ہی بس میں سفر کرتے تھے۔

بادل مزید گہرے ہو چکے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بوندوں میں اور تیزی آ گئی تھی۔

بس سے اتر کر وہ جلدی سے اڈے کے ٹین کی چھت کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں بھی اُس سے کچھ فاصلے پر اُسی ٹین کی چھت کی پناہ میں آ گیا تھا۔ اُس روز میں نے اُسے کافی نزدیک سے دیکھا تھا۔ اُس وقت وہ مجھے بہت خوبصورت لگی تھی۔ گول منہ، تیکھے نقوش، گورا نشوہ رنگ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا حسن میرے اندر اترتا جا رہا ہو۔ کاش وہ میرے پاس اسی طرح کھڑی رہے پر۔

وہاں کچھ دیر رُکنے کے بعد جب اُس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو اُسے لگا جیسے مینہ کے تھم جانے کا کوئی امکان نہ ہو۔ چنانچہ وہ فوراً وہاں سے چل پڑی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

دراصل ہم دونوں کے سکولوں کی طرف ایک ہی راستہ جاتا تھا۔ میرا سکول اُس کے سکول سے آدھا فرلانگ دور تھا۔

وہ آگے آگے تھی اور میں اُس کے پیچھے۔ میں ہر روز اسی طرح کرتا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو میں اُس کی مورنی جیسی چال اور اُس کے جُثّے کی پھبن کا کیسے مزہ لے سکتا تھا۔

اُس نے آج تک جان بُوجھ کر کبھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا تھا کہ اُس کے مگر آنے والا کون ہے اور کیسا ہے۔ لیکن پھر بھی میں اپنے اندر اُس کے لیے ایک کشش سی محسوس کر رہا تھا۔ جس نے کہ شاید اُس کے دل کو کبھی نہیں چھیڑا تھا۔ وہ تو بس اپنے آپ میں مست بے دھیان ہو کر قدم اُٹھاتی جاتی۔ اگر کسی لمحے وہ بھولے سے پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتی تو ایک پل کے لیے اُس کی نظریں میرے نزدیک کھیلتی دکھائی دیتیں اور پھر واپس چلی جاتیں۔ مجھے اُس کا یوں دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔

باریک پھوار اور ٹھنڈی ہوائیں مل کر موسم کو مزید سہانا بنا رہی تھیں۔ لیکن سڑک پر اُس وقت خال ہی کوئی بندہ دکھائی دے رہا تھا۔ شاید ہر فرد کے لیے یہ خوبصورت موسم اتنی کشش نہ رکھتا ہو جتنا کہ میرے لیے۔ بھلا یہ موسم میرے لیے اس قدر کشش کیوں نہ رکھتا۔ میرے آگے جو مٹیار اس سہانے موسم میں بارش میں بھیگتی جا رہی تھی اُس کے انگ انگ کو یہ اتھری پھوار چوم رہی تھی۔

سڑک کی دونوں جانب کی دکانوں میں بیٹھے دکان دار باہر آئے بغیر ہی خوشگوار موسم کا مزہ لے رہے تھے۔ خاص کر میرے آگے آگے جانے والی کے جسم کے ساتھ چپکے ہوئے کپڑے سے جو حسن چھن کر باہر آ رہا تھا اُسے دیکھنے کے لیے اُن کی نظریں دُور تک اُس کا پیچھا کرتیں تو اُن کے چہروں پر ایک عجیب طرح کی رونق آ جاتی۔ میری نظریں بھی اُس کے اس حسن کو اپنے دل کے کسی کونے میں سنبھال کر رکھ رہی تھیں۔

مینہ اُسی رفتار سے برس رہا تھا۔ موسم کچھ ایسا خوبصورت ہو رہا تھا کہ میرا من چاہنے لگا کہ خدا کرے یہ موسم کبھی ختم نہ ہو ہم دونوں اسی طرح مینہ میں بھیگتے رہیں۔ وہ میرے آگے رہے اور میں اُس کے پیچھے

ہم جب ذرا سا اور آگے گئے تو سامنے سڑک دائیں جانب شاہ کبیر کا دربار تھا اُس دربار کی کھلی فضا کو دیکھ کر میرے اندر اچانک یہ خواہش جاگ پڑی کہ کیوں نا میں اُسے روک کر کہوں:

''آؤ ذرا اس دربار میں کچھ دیر کے لیے رُک جائیں۔ جب مینہ ذرا ہلکا ہوگا تو چل پڑیں گے''

دراصل اُسے روکنے کی اس چاہت کے پیچھے اُسے مینہ سے بچانے کی خواہش نہیں تھی بلکہ میں تو چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح بھیگتی رہے اور میں اُس کے لباس سے باہر اوڑھے ہوئے گورے رنگ کو نظر بھر کر تکتا رہوں۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ اس سنسان مزار کے پوتر استھان میں داخل ہو کر کچھ لمحات تک اُس کی قربت سے لطف اندوز ہوسکوں جو اُس مزار کی چاردیواری میں مجھے میسر آئی اور اُس کی اس قربت سے فائدہ اٹھا کر کہوں:

''اس وقت آپ مجھے بہت اچھے لگ رہے ہو''۔۔۔ میرا جی چاہتا کہ آپ میرے پاس اس طرح موجود رہیں''

''میری ان باتوں کا بے شک وہ کوئی جواب نہ دے بس چہرے پر ہلکی سی مسکان بکھیر کر میری جانب نظریں اٹھا کر دیکھ لے بس''

میں اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے قدرے تیز قدم اٹھاتا ہوا اُس کے قریب گیا۔ اُس سے بات کرنا چاہی لیکن میں کون سے تعلق کو مدِ نظر رکھ کر، کون سی امید کا دامن تھام کر اُس سے دو بول بولنے کی جسارت کرتا۔ میرے ہونٹ تو جیسے سِل گئے تھے۔ میں چپ کی بُکل مار کر اُسی فاصلے پر آ گیا جہاں میں پہلے تھا۔

بارش قدرے کم ہوگئی تھی لیکن موسم بدستور خوشگوار تھا۔ مجھے یہ موسم بڑا پیارا لگ رہا تھا بھلا ایسا موسم کسے اچھا نہ لگے جس میں ایک دوشیزہ اپنے جوبن کے تمام رنگ گھول رہی ہو۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ یہ موسم اُس کے لیے کسی مصیبت سے کم نہ ہو۔ اسی لیے وہ اپنی برہنگی کو اپنی چادر سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن چادر بھی بھیگ کر بذاتِ خود بے بس دکھائی دے رہی تھی۔

اب ہم سڑک کے اُس حصے میں داخل ہو چکے تھے جس میں ایک جانب تمام رہائشی مکان تھے اُن کے دروازے تو ضرور کھلے تھے لیکن اُن کے سامنے پردے لٹک رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر اُسے لگا جیسے اب اُس کی طرف کوئی نہ دیکھ رہا ہو۔ اسی لیے اب وہ تھوڑا بے فکر ہو کر چل رہی تھی۔ اب اُس نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب جب دائیں بائیں سے قدرے اُس کی توجہ ہٹی تو اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے میں تھا اُس کے روز کے سفر کا ساتھی۔

شائد مجھے دیکھ کر اُس کی چال میں کچھ لڑکھڑاہٹ آ گئی تھی۔ ہوسکتا تھا میری موجودگی کے احساس نے اُسے چھیڑا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اُس کے اندر میرے نزدیک آنے کی خواہش نے سر اٹھایا ہو۔

کچھ اور آگے جا کر اُس نے پھر پیچھے کی جانب نظر پھیری۔

میرے من کے اندر اُس کے لیے جو گداز پیدا ہو گیا تھا اُس کی اس ایک نظر نے اُس میں اضافہ کر دیا تھا۔

جب ہم نے پیراں والی گلی کا موڑ مڑ کر نور پور والے راستے کو اختیار کیا تو دائیں جانب سے ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

باوا جی آ جاؤ۔ بارش رُک لینے دیں پھر چلے جانا۔

میں نے اُس آواز کی طرف دیکھا تو سامنے میرا ایک دوست اپنے گھر کی دہلیز کے اندر کھڑا تھا اُس کے چہرے پر ایک طنز بھری مسکراہٹ مچل رہی تھی جیسے وہ میرے نام کے پردے میں میری ہم سفر سے مخاطب ہو۔

''نہیں یار۔۔۔ سکول سے پہلے ہی دیر ہوگئی ہے''

اُس کے منہ سے میرا نام سن کر جیسے وہ چھوئی موئی سی ہوگئی تھی۔ شائد وہ اس آواز کے اندر سے جھانکتے اشاروں کو سمجھ گئی تھی۔ یا پھر میرا نام سن کر اُس کی چال میں وقتی طور پر تبدیلی آ گئی تھی۔ اُس کی اس چال نے بھی مجھ پر کچھ جادو سا کر دیا تھا۔

یہ میری خواہش تھی یا پھر اس میں کچھ سچائی کا شائبہ بھی یہ میں نہ جان سکا۔ ہاں اتنی بات ضرور محسوس ہوئی جیسے میرے من کی کھلی کھڑکی سے ایک مدھر آواز اُڑ کر اُس کے بدن سے کھیلنے لگی تھی۔

اب ہم اس کے سکول سے کچھ ہی فاصلے پر تھے۔ اسلم شیشے والے کے گھر سے گزر کر چند قدم کے فاصلے پر اُس کا سکول تھا۔

اُس کے ایک آدھ بار پیچھے مڑ کر دیکھنے اور میرا نام سن کر چھوئی موئی ہو جانے پر مجھے لگا کہ جیسے یہ اُس کی طرف سے میرے لیے کچھ سندیسے ہوں۔ اچانک میرے اندر سے جو یہ سوچ اُبھری اُس نے مجھے حوصلہ دیا کہ میں اُس سے کوئی بات کروں۔ لیکن کچھ تیز قدم اُٹھانے کے بعد پھر خیال آیا کہیں اُس سے بات کرنی مہنگی نہ پڑ جائے۔ اُس کی جانب جو قربت کا احساس مجھے ہوا کہیں وہ ختم نہ ہو جائے۔ پھر سے دوریاں پلّے نہ پڑ جائیں۔ میرے پاؤں پھر سے سست ہو گئے۔ میرے اور اُس کے درمیان جو فاصلے کم ہوئے تھے میری سُست روی نے ان فاصلوں کو پھر سے بڑھا دیا۔

اب میں تذبذب میں پڑ گیا۔ اُس کے ساتھ بات کروں یا نہ کروں۔ اُس کے قریب جاؤں یا نہ جاؤں۔

آخر میں اس تذبذب سے نکل کر میں نے ارادہ کیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اُس کے ہونٹوں کو اپنے دو بولوں کا لمس ضرور دوں گا۔ شائد یہ لمحات پھر کبھی ہاتھ نہ آئیں۔ چنانچہ میرے اور اُس کے مابین پھر سے جو فاصلے حائل ہو گئے تھے میں نے انہیں اپنے تیز قدموں سے ختم کیا اور اُس کے نزدیک جا کر میں نے بڑے ہی نرم لہجے میں کہا:

''آپ بہت زیادہ بھیگ گئی ہیں''

اُس کی جانب سے جواب سننے کے لیے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میری یہ بات سن کر وہ جیسے چھوئی موئی سی ہوگئی۔ اُس نے ایک پل کے لیے کوئی جواب نہ دیا۔ میں گھبرا سا گیا کہیں کوئی اور چاند نہ چڑھ جائے۔ میں نے سوچا۔

اچانک اُس کے ہونٹ ہلے۔ ایک باریک سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ مجھے لگا جیسے کوئی چوڑیاں چھنک پڑی ہوں۔ کوئل نے جیسے اپنے مدھر سُر ہوا میں بکھیرے ہوں۔ جیسے کسی بانسری نے اپنی لے کو فضاؤں کے حوالے کیا ہو۔

''جی۔۔۔ آپ بھی تو۔۔۔ میری طرح ہی۔۔۔''

اُس کے چہرے پر مسکان سے بھیگی شرم و حیا نے بات کو پورا نہ ہونے دیا تھا۔

اتنے میں اُس کا سکول آ گیا۔ پہلے وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائی پھر جلدی سے سکول کی دہلیز کو عبور کر گئی۔

وہ مجھے بھیگے ہوئے دیکھ کر مسکرائی تھی یا پھر میرے ساتھ کچھ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا کچھ بھی تھا۔ میں جیسے نشے میں شرابور اُس کی میٹھی آواز کے سحر میں ڈوبا ہوا اپنے سکول کی جانب چل پڑا۔

اس کے بعد وہ مجھے کبھی نظر نہ آئی۔ شائد اُس کا کسی دوسرے سکول میں تبادلہ ہو گیا تھا کچھ بھی تھا لیکن وہ اپنے ادھورے شیریں بول اور ننھی مسکان ہمیشہ کے لیے میرے دل کے ویہڑے میں بو گئی۔

پگھلتے لمحوں کی تصویر

براق مرزا
(ممبئی، بھارت)

''زندگی دراصل پگھلتے لمحوں کی تصویر ہے۔ انسان محض ایک بوند کی صورت وجود میں آتا ہے۔ پھر شکمِ مادر سے رشتہ منقطع کر کے جب وہ اس عالم ناسوت میں قدم رکھتا ہے تو لحہ بہ لحہ اس کے پگھلنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پیدائش سے لے کر حیات کی آخری ساعت تک وہ وقت کی آنچ پر پگھلتا رہتا ہے اور مختلف تصویروں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ اس کی مدتِ حیات سے لمحے کٹ کٹ کر وقت کی بے کراں وسعتوں میں تحلیل ہوتے رہتے ہیں اور وہ لاشعوری طور پر دھیرے دھیرے موت کی سمت بڑھتا رہتا ہے''۔

مقالہ کا پہلا پیراگراف لکھ کر اس نے قلم اور رائٹنگ پیڈ Bed Side Table پر رکھ دیے۔ پھر بستر پر دراز ہو کر سوچوں کے آسمان میں پرواز کرنے لگا۔ وہ اکثر رات کے وقت ماضی کی بھول بھلیاں میں کھو جاتا اور زندگی کے مختلف تجربات و مشاہدات کو کوئی افسانہ یا مضمون کی شکل دینے کی کوشش کرتا۔

وہ ایک اسکالر تھا۔ اس نے شہرہ آفاق کہانی کار پریم چند پر Ph.D کیا تھا۔ اگر چہ وہ اپنے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کو کسی تخلیق کے پیرایہ میں ڈھالنے کے فن سے بخوبی واقف تھا تاہم پچھلے کئی مہینوں سے وہ کسی بھی کہانی یا مضمون کو اختتام تک نہیں پہنچا پاتا تھا۔ غالباً اس کی ہر تخلیق ادھوری رہ جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہو یا اسے احساس ہو گیا ہو کہ اس کی زندگی موت کے دہلیز پر قدم رکھ چکی ہے اور اب کسی بھی پل سانسوں سے اس کا رشتہ ٹوٹ سکتا ہے۔ یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ جب موت کا خوف کسی انسان کے قلب و ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے تو اس کی عقل و دانش جواب دے جاتی ہے۔

رات کے قریب ڈھائی بج رہے تھے اور وہ بستر پر لیٹا خیالوں کی کائنات میں گم تھا۔ یہ ایک Old age Home کا کشادہ کمرہ تھا جہاں ڈاکٹر مجیب کے بستر کے علاوہ مزید چار پانچ بستر لگے ہوئے تھے اور ان بستروں پر مُردوں کی سی حالت میں پڑے لوگ محوِ نیند تھے۔ کمرے میں گہرے سکوت کا قبضہ تھا۔ ڈاکٹر مجیب کے فہم و شعور کا طائر برق رفتاری سے پرواز کرتے ہوئے انہیں ایک ایسے مقام پر لے گیا جہاں زندگی ایک فوٹو البم کی مانند ان کے سامنے کھلنے لگی اور بہت ساری تصویریں ان کے ذہن کے پردے پر ابھرنے لگیں۔ امّی ابو کے ساتھ ان کے بچپن کی تصویریں پھر جوانی کے دنوں کی رنگین تصویریں، پھر آمنہ کے ساتھ ان کی شادی کی تصویریں۔۔۔ وہ جیسے جیسے اپنے آپ کو مختلف تصویروں میں دیکھ رہے تھے ان کے مقالہ کو معنی و مفہوم ملتا جا رہا تھا۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک وقت نے انہیں نہ جانے کتنی تصویروں میں ڈھال دیا تھا۔

پھر اچانک ان کے ذہن کے عقاب نے اُڑان کی سمت بدلی تو ان کے شعور کی وادی کا منظر بھی بدل گیا اور اب ان کے فہم کے پردے پر امان کی تصویر گھومنے لگی۔ امان ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تھا تو ڈاکٹر مجیب اور آمنہ کا گھر فرحت و نشاط سے جھوم اٹھا تھا۔ ڈاکٹر مجیب کے ذہن میں اس کی مولودیت سے لے کر ایام جوانی تک کی بے شمار تصویریں ابھرنے لگیں اور ایک دوسرے میں تحلیل ہونے لگیں۔ وقت کے ساتھ اس کی تصویریں بھی بدلتی رہیں اور وہ زندگی کے میدان میں آگے بڑھتا رہا۔

ڈاکٹر مجیب اور آمنہ نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کے تعلق سے کبھی کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ امان کمپیوٹر انجینئر بننا چاہتا تھا۔ والدین نے اس کی یہ خواہش پوری کی۔ پھر دھوم دھام سے اس کی شادی ہوئی اور گھر میں ایک خوبصورت بہو آ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے امان ایک بیٹا اور ایک بیٹی کا باپ بن گیا اور ڈاکٹر مجیب اور آمنہ دادا دادی بن گئے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار میں آگے بڑھتا رہا۔ موسموں کے قافلے آگے آتے رہے اور جاتے رہے۔ امان کے دونوں بچے بڑے ہو گئے۔ پھر گھر چھوٹا پڑنے لگا۔ ایک سڑک حادثہ میں ڈاکٹر مجیب کا پیر ٹوٹ گیا اور وہ اپاہج ہو گئے۔ زندگی چلتے رہنے کا نام ہے۔ اپاہج انسان کی زندگی سوکھی ندی کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کے لیے وقت تھم جاتا ہے۔ سارے موسم پتھر سے ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مجیب کے لیے بھی اب یہ دنیا بے رنگ و نور ہو چکی تھی۔ جھرنے، دریا اور سمندر ساکت و جامد ہو گئے تھے۔ اب ہر طرف تاریکیاں تھیں، اُداسی تھی، مایوسی تھی۔ پہلے ملازمت سے رشتہ ٹوٹا پھر خون کے رشتے کمزور پڑنے لگے۔

جب تک آمنہ حیات تھیں وہ کسی طرح زندگی سے لڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر ایک دن وہ بھی ان کا ساتھ چھوڑ کر دور کہیں ستاروں میں جا بسیں اور تب ڈاکٹر مجیب کے گرد پوری طرح اندھیرا چھا گیا۔ بتدریج بیٹا، بہو اور پوتا پوتی کی توجہ بھی دور ہوتی چلی گئی اور وہ ایک پُرانے ٹوٹے ہوئے فرنیچر کی طرح اپنے کمرے میں قید ہو کر رہ گئے۔ ان کی نظر میں یہ زندگی کی بدترین تصویر تھی اور خود کو اس تصویر سے علیحدہ کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا۔

اسی دوران امان کو کینیڈا کی ایک کمپنی سے ملازمت کا آفر آ گیا اور وہ کینیڈا چلا گیا۔ پھر اس نے کینیڈا ہی میں سکونت پذیر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی شریک حیات عائشہ اس فیصلے سے بے حد خوش ہوئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ابو یعنی

ڈاکٹر مجیب کو نہ وہ اپنے ساتھ کینیڈا لے جا سکتے تھے اور نہ ہی انہیں گھر میں اکیلا چھوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا امان اور عائشہ نے فون پر ایک دوسرے سے مشورہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ابو کو کسی Old Age Home میں منتقل کر دینا بہتر ہوگا اور اس طرح ڈاکٹر مجیب کو بہو نے Old Age Home میں شفٹ کر دیا۔ آبائی مکان فروخت کر دیا گیا اور عائشہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کینیڈا چلی گئی۔

Old Age Home میں رہ کر ڈاکٹر مجیب کو زندگی کی کڑوی حقیقت کا احساس ہوا۔ دنیا کے رشتے ناطے کتنے جھوٹے اور کمزور ہوتے ہیں وہ یہ سوچ کر حیران تھے جس امان کو اُنگلی پکڑ کر انھوں نے چلنا سکھایا تھا آج وہ انہیں بیسا کھیوں کے سہارے چھوڑ کر اُن کی دنیا سے بہت دور جا چُکا تھا۔ کیا یہی دنیا کی ریت ہے؟ کیا اولاد کا فرض اسے یاد نہیں رہا؟ کیا وہ یہ بھی بھول گیا کہ عمر کے آخری ایام میں ایک باپ کی بس یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا اس کے جنازے کو کندھا دے کر شہرِ خموشاں تک پہنچائے اور اپنے ہاتھوں سے اسے قبر میں اُتارے۔ جب کبھی ایسے سوالات اُن کے ذہن کو نشتر چبھوتے درد کا ایک سیلاب اُن کی آنکھوں میں جھلملانے لگتا۔ مگر وہ اپنے آنسو کو روک لیتے یہ سوچ کر کہ ایسی اولاد کے لیے آنسو بھی خرچ کرنا بے معنی ہے۔

قریب پندرہ سال بعد امان اپنے آبائی شہر لوٹا تھا۔ اس بار وہ گرمی کی چھٹیاں اپنے ہی ملک کے مختلف شہروں میں گزارنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے شہر اور وطن کی یاد بھی آئی تو گرمی کی چھٹیاں بتانے کے لیے۔ اپنے ابو سے ملنے کے لیے نہیں۔ ممکن ہے اس نے سوچ لیا ہو کہ ابو اب شاید اس دنیا سے جا چکے ہوں۔ مگر فیصل اور عالیہ کے ذہن میں اپنے دادا ابو کی تصویر آج بھی زندہ تھی۔ جب دونوں بچوں نے دادا ابو سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو امان کو بھی خیال آیا کہ اسے کم از کم Old Age Home جا کر ابو سے ملنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ کس حال میں ہیں۔۔۔ زندہ ہیں بھی یا ملکِ عدم سدھار گئے۔ دوسرے ہی دن وہ اپنی فیملی کے ساتھ Old Age Home گیا۔ اس نے اپنا تعارف دے کر جب منیجر سے ڈاکٹر مجیب کے بارے میں دریافت کیا تو منیجر نے ایک پیپر تھما دیا۔ یہ پیپر ڈاکٹر مجیب کا وصیت نامہ تھا جو کچھ اس طرح تھا۔

''ہم کیوں پیدا ہوتے ہیں اور کیوں مر جاتے ہیں؟۔۔۔ یہ ایک سوال ہے جس کا مدلل جواب جب سے انسان سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تب سے لے کر آج تک کوئی تلاش نہیں کر پایا۔ دنیا کے سارے رشتے ایک دوسرے کی ضرورت کے لیے بنے ہیں۔ اس لیے میری نظر میں ان رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ نہ کوئی ماں ہے نہ باپ، نہ بیٹا نہ بیٹی، نہ بیوی نہ شوہر۔۔۔ ہم سب ساعتِ وقت ہیں جو وقت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور اپنا سفر پورا کرنے کے بعد وقت ہی کی آغوش میں گم ہو جاتے ہیں۔ انسانی زندگی سے جڑی دو ہی باتیں سچ ہیں۔ ایک اس کا پیدا ہونا دوسرے اس کا مرنا۔ میں عمر کے اس پڑاؤ میں ہوں جہاں موت کے برفیلے ہاتھ کسی بھی پل مجھے اپنے سینے سے لگا سکتے ہیں اور میرا وجود مٹی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ جس دن ایسا ہو جائے میری گزارش ہے کہ میری تدفین کے لیے میرے کسی وارث کی تلاش نہ کی جائے کیونکہ میں اکیلا ہوں، بالکل اکیلا۔۔۔ میرا کوئی اپنا نہیں جو مجھے قبر تک پہنچا سکے!''

ڈاکٹر مجیب کا یہ وصیت نامہ پڑھ کر امان بالکل سکتے میں آ گیا۔ اس کے قلب و ذہن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی اور آنکھوں میں پشیمانی کا عکس اُبھرنے لگا۔ پھر عائشہ نے بھی اس کے ہاتھ سے پیپر لے کر اپنے سُسر کی وصیت پڑھی اور اس کی آنکھیں بھی شرم سے جھک گئیں۔

ڈاکٹر مجیب کے اس مقالہ کو اختتام مل گیا تھا مگر ان کا وجود وقت کی وسعتوں میں تحلیل ہو چُکا تھا۔

- بقیہ -

''آفت کی پوٹ''

اور معیادی ڈیپازٹ شامل ہیں اور جن کی تفصیل میں منسلک کر رہا ہوں، کی بکری کر کے حکومت کی نگرانی میں میرے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا جائے اور اس ساری رقم کو بنک میں ٹرسٹ کے نام پر جمع کیا جائے۔ اس رقم پر جو بھی سالانہ بیاج ملے گا اس کو ہر سال میرے اسکول کے سب سے غریب اور ذہین تین بچوں میں وظیفے کے طور پر تقسیم کیا جانا چاہیے۔ ٹرسٹ کے ممبران ڈائریکٹر ایجوکیشن اور اس اسکول کا پرنسپل اور وائس پرنسپل ہوگا جس اسکول میں میں نے سب سے آخر میں کام کیا۔
دستخط روشن لال سپرو، پرنسپل۔''

اس طرح سے روشن لال نے اپنے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی مگر رجنی اس لحاظ سے بھی بڑی ڈھیٹ نکلی۔ بیاسی سال کی عمر تک بہن کے گھر میں پڑی رہی۔ شوہر کے مرنے کے ترت بعد رشتے داروں نے بہت پیار جتایا مگر جونہی انھیں وصیت کے بارے میں پتہ چلا تو سبھی نے دوریاں اختیار کر لی۔ البتہ بہن تو اپنا خون تھی وہ طوطے کی طرح چشم نہیں پھیر سکی۔ آخری دم تک رجنی کو جھیلتی رہی۔

میں البتہ آج تک یہ گتھی نہیں سلجھا سکا کہ دونوں میں سے کون خوش نصیب تھا۔ شوہر، جو زندگی کی صعوبتوں سے جلدی چھٹکارا پا کر رخصت ہو گیا یا پھر رجنی جو شوہر کی بے التفاتی کے باوجود بیاسی سال تک بے روک ٹوک جیتی رہی۔ سچائی کی خبر بس اوپر والے کو ہی ہے۔

سبقت

شاہد جمیل
(گوجرانوالہ)

پتہ نہیں آج بیدو کے ہاتھوں کو کیا ہو گیا تھا کہ دُھلے ہوئے برتنوں کا ڈھیر بلند ہی نہیں ہو پا رہا تھا جبکہ بنا دُھلے برتن اُس کے چاروں طرف اور کُھرے کے ہر کونے میں بکھرے پڑے اپنی جُھٹال دکھا کر اُس کا منہ چڑا رہے تھے۔ ہر روز کی طرح برتن دھونے کے سارے لوازمات جیسے ادھ گھلی ہری صابن، راکھ اور ٹاکی سب موجود تھے مگر کام تھا کہ نمٹنے میں نہ آ رہا تھا۔ درمیان میں جب وقفے وقفے سے چودھرانی کی آواز کے نوکیلے الفاظ "جلد کرو تمہارے ہاتھ تو نہیں ٹوٹ گئے" اُس کے کانوں کے پردے سے ٹکراتے تو ایک دم اُس کے ہاتھوں کی نصف دائرے کی حرکت تیز ہو جاتی مگر اگلے ہی لمحے پھر وہی سُستی، وہی بیزاری۔ آج جیسے اُس کے ہاتھ پاؤں پُھولے ہوئے تھے۔ یہ کام اُس کیلئے نیا نہیں تھا بلکہ وہ تو نصف صدی سے یہ کام کرتی آئی تھی۔ پھر اُسے ایک دم یاد آیا کہ اس کی ماں بھی تو یہی کام کیا کرتی تھی۔ اُسے وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا جب اُس کی ماں شدید بیماری کی وجہ سے دو دن حویلی میں کام کرنے نہ آ سکی تو تیسرے دن اس کی چودھرانی نے اسے نوکروں کے ذریعے گھر سے اٹھوایا اور اس کی چلونگی کھرے میں لا کر رکھ دی۔ وہ ٹھنڈے پانی سے اپنی ماں کے کانپنے کو بڑھتا دیکھ رہی تھی اور پھر اسی حالت میں اس کی ماں نے کُھرے کی ایک دیوار پر ہمیشہ کیلئے اپنا سر ٹکا دیا تھا۔

اُسے اپنی ماں کی طرح بخار تو نہیں تھا مگر اس کی سانسیں گرم اور تیز تیز چل رہی تھیں۔ شام ہونے کو تھی اور برتنوں کے ڈھیر ویسے کے ویسے پڑے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ابھی اس نے چودھرانی کی پنڈلیوں کی مچھلیوں کو بھی پھوڑنا تھا اور اس کے بعد ہی وہ اپنے گھر جا سکتی تھی۔ آج کے دن کچھ بھی نیا نہیں تھا، سب چیزیں پہلے کی طرح تھیں جیسے راکھ، صابن، ٹاکی، برتن اور چودھرانی کی پنڈلیوں کی مچھلیاں مگر پتہ نہیں کیوں اسے کچھ نیا لگ رہا تھا، اسے اپنے اندر یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے، کچھ اچھا یا پھر کچھ مختلف، اس نے لمبی سانس لی اور بے اختیار اس کے مونہہ سے اُف میرے خدایا نکل گیا۔ اُسے اپنا شوہر دھنا اور بیٹا جیرو دھیان میں ایک پگڈنڈی سے گاؤں کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ ان دونوں کے سایوں کو تو وہ آسانی سے پہچانتی تھی مگر تیسرے سائے سے وہ مانوس نہ تھی۔ یہ کسی جانور کا سایہ تھا جو کبھی تو اتنا چھوٹا ہو جاتا کہ بلی کا بچہ محسوس ہونے لگتا اور کبھی اتنا بڑا کہ اس کا قد دوسرے دونوں کی کمروں کے برابر ہو جاتا۔ تیسرے کی رسی جیرو نے پکڑی ہوئی تھی اور دھنا نرم پتوں والی شاخ کی ہلکی ہلکی ضربوں سے اُسے ہانک رہا تھا۔

گھنٹے بھر کی لگا تار مشقت کے بعد برتنوں کے دو طرح کے ڈھیر ایک طرح کے ڈھیر میں تبدیل ہوئے اور وہ ہاتھ خشک کرتی چودھرانی کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گئی۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ چودھرانی سے صاف صاف کہہ دے کہ آج اُسے جلدی گھر جانا ہے مگر جیرو کے ابّا نے اُسے ہر طرح کی بات کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ بجھے ہوئے دل کے ساتھ اس نے چودھرانی سے کہا کہ لاؤ بی بی جی میں آپ کی پنڈلیاں دبا دوں۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ پتہ نہیں یہ منحوس چودھرانی کیا کھاتی ہے اور کیا کرتی کراتی ہے کہ ہر روز اس کی پنڈلیوں کی مچھلیاں پھول جاتی ہیں۔ اس کی مچھلیاں دبا دبا کر اس کے ہاتھوں کے انگوٹھے اور انگلیوں کی پوریں شل ہو جاتیں مگر ان کا اکڑاؤ کم ہونے میں نہ آتا۔ اب تو ان گٹھلیوں کی بات پنڈلیوں سے چل کر کافی اوپر تک چلی گئی تھی اور جوں جوں یہ بات بڑھ رہی تھی توں توں بیدو کے لکڑی جیسے ہاتھوں کی مشقت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ جب سے چوہدری نے دوسری شادی کی تھی تب سے تو بڑی چودھرانی کا جسم اور بھی ابل گیا تھا۔

گُفتاں کی بانگ کے کافی دیر بعد بیدو کام کاج اور لتاڑ سے فارغ ہوئی۔ گلی میں بڑے بڑے قدم اٹھاتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی کہ جیرو اور اُس کے ابّا گھر پہنچ چکے ہوں گے۔ کیا پتہ وہ اب جانور کو نہلا رہے ہوں۔ اُن کو تو اتنی عقل بھی نہیں کہ جانور کو رات کو نہلانا نہیں چاہیئے، جانور کے بیمار ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر ایک دم اُسے وہم ہوا کہ رات کو جانور کو نہلانے کی وجہ سے اُس کی ٹانگیں جڑ گئی ہیں اور صبح کے وقت اُسے اٹھاتے ہیں تو وہ اٹھ نہیں رہا۔ کیا پتہ وہ قینچی سے اس کی اُون مونڈ رہے ہوں۔ کوئی پتہ نہیں رات کے اندھیرے میں ان کی قینچی اُون کی بجائے کھال میں گُھس گئی ہو اور جانور خون میں لت پت ہوا پڑا ہو!! نہیں نہیں!!! ایسا کچھ نہیں ہوگا، اُکھڑی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھوں سے باہر کا دروازہ کھولا اور گھر کے اندھیرے خاموشی کو دیکھ کر بھانپ گئی کہ وہ لوگ ابھی نہیں آئے۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو وہ لوگ ابھی نہیں پہنچے کہ اس طرح وہ ان کو یہ تو بتا سکے گی کہ رات کو جانور کو نہ نہلائیں یا پھر اندر میں اس کی اُون نہ اتاریں۔ اس نے کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے حقے کو جگایا، اس کی نڑی اور نیچے کو نلکے کے پانی سے اچھی طرح تازہ کیا، اُپلوں کی آگ جلائی اور چلم بھر کر ڈھیلی چارپائی کی گود میں بیٹھ کر بڑے بڑے کش کھینچنے لگی۔

رات اپنے دوسرے پہر میں داخل ہو چکی تھی جب اُسے دروازے پر ہلچل محسوس ہوئی۔ دھنا نے اس کی رسی پکڑی ہوئی تھی اور جیرو اس کی پچھلی ٹانگیں اُٹھا کر اُسے گھر کے اندر دھکیل رہا تھا۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے سب سے پہلے دروازے کو مضبوطی سے بند کیا اور دونوں جانور کو باندھنے کے

بعد ایک بار پھر اُس کے اردگرد چکر کاٹ کر اس کا جائزہ لینے لگے، یوں جیسے اِس سے پہلے وہ لوگ نیند میں سارا کام مکمل کر آئے تھے اور اب جاگ کر اصل صورت حال کا جائزہ لینے لگے تھے- جیرو نے دونوں ہاتھوں میں بھر کر اُسے زمین سے ذرا اوپر اٹھایا اور پھر نیچے پھینک کر کہنے لگا من کے قریب لگتا ہے- دھّنا کہنے لگا بیوقوف وزن کی بات نہیں کرتے -جس کا ہے اُس کیلئے سیروں اور منوں کی کوئی اہمیت نہیں- مسلمان ہونے کے بعد اُن کی معلوم تاریخ میں یہ اُن کے خاندان میں پہلا واقعہ رونما ہونے جارہا تھا- دبی دبی زبان میں انہوں نے گاؤں گلی کے لوگوں میں اپنے ارادے کو ظاہر تو کر دیا تھا مگر کسی نے اُن کا یقین نہیں کیا- لوگ سمجھتے تھے کہ وہ مذاق کر رہے ہیں- اُن کے ذہن میں یہی تھا کہ یا تو جیرو دور پار سے کسی کا جانور چرائے گا ورنہ ان کے پاس اس کام کیلئے جانور کہاں سے آئے گا -جبکہ چرائے ہوئے جانور کو ایسا ہی ذبح کیا اور ایسا ہی نہ کیا- کسی کو کیا پتہ کہ اُن کے گھر میں وہ تین لوگ تھے اور تینوں کمانے والے تھے- بیدو کو بچے کھچے کھانے کے علاوہ عید تہوار اور موقع بہ موقع صدقے کے پیسے بھی ملتے تھے، جیرو نے بھی دوسرے گاؤں کے زمیندار کے ساتھ سیپ کی ہوئی تھی اور دھّنا بھی ہر روز آس پاس کے دیہات سے کچھ نہ کچھ مانگ لاتا تھا- یوں بھی ان کا خرچہ ہی کتنا تھا ،مانگے تانگے کے تمبا کو اور بچے کھچے کے کھانے سے بھلی چنگی گذر اوقات ہو رہی تھی- پچھلے کئی سال سے پیسے جمع کرنے کے بعد وہ اپنے خاندان کی صدیوں پرانی روایت بدلنے اور نئی تاریخ رقم کرنے کے درپے تھے-

حقیقت تو یہ تھی کہ اُن تینوں میں سے کوئی بھی اُس رات پل بھر کو نہ سو سکا- اگرچہ وہ اپنے کپڑوں سے اپنے منہ ڈھانپ کر اور آہستہ سے کروٹیں لے کر ایک دوسرے کو اپنا سویا ہونا ظاہر کر رہے تھے- کبھی جیرو پیشاب کے بہانے اُٹھ جاتا اور کبھی دھّنا پانی پینے کی غرض سے- بیدو جب کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی تو اُس نے آدھی رات سے ہی تھوم پیاز چھیلنا شروع کر دیئے- اُس کا بہانہ بنا کر وہ دونوں انگڑائیاں لیتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے نیند مکمل کر چکے ہوں- جانور کو دھریک کے پتے کھلاتے اور چلم دوبارہ بھرتے بھراتے اُن کے کانوں میں اذان کی آواز پڑی- دھّنے نے جیرو کو کہا کہ تم نماز پڑھ لو، وہ کہنے لگا مجھے تو نماز نہیں آتی ابّا تُو ہی پڑھ لے- ابّا ناراض ہو گیا کہ تو بڑھاپے میں مجھ سے ہی سارے کام کروانا، خود کچھ نہ کرنا نکھے- بیدو کو موقع مل گیا- کہنے لگی تم دونوں رہنے دو، پتہ نہیں کیا خاندان ہے تمہارا، تم لوگوں کو تو کچھ بھی نہیں آتا- وہ منہ ہاتھ دھو کر پرانے کھیس پر کھڑی تو ہو گئی مگر آگے اُسے بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ نماز میں کیا پڑھتے ہیں- اس کا مقصد تو ان کو دکھانا ہی تھا کہ نماز پڑھی جا رہی ہے- اِس لئے تھوڑی سی بلند آواز میں بسملا، اللہ و کبر پڑھتی رہی اور کھیس لپیٹنے تک اُس کے اچھے خاصے پسینے چھوٹ گئے- اِس کے ساتھ ہی جیرو نلکا گیڑ کر مُڈھی دھونے لگا- دھّنے نے لگی لگائی چھریوں اور بُگدے کو ایک بار پھر ریتی سے تیز کیا- جیرو کہنے لگا ابّا کیا صلاح ہے- دھّنے نے جیرو کی طرف دیکھا اور کہنے لگا پُتّر بسم اللہ کرتے ہیں- میں نے ایک بار میاں جی کو سپیکر میں کہتے سنا تھا کہ مسلمانوں نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے پتہ نہیں کیا لے جاؤ البتہ اس کا مطبل یہ بنتا تھا کہ ایک دوسرے سے پہلے وہ کام کرنے کی کوشش کرو- ویسے بھی نیک کام میں دیر کیسی- اُس نے جیرو کو مخاطب کر کے کہا کہ میں اور تیری ماں جانور کو قابو کریں گے اور تم چھری چلانا، تمہیں وہ تو یاد ہے ناں جو چھری چلاتے پڑھتے ہیں- جیرو جو پہلے ہی اپنے باپ سے نماز والے کام میں جھینپ گیا تھا کہنے لگا ہاں ابّا مجھے آتا ہے، میں نے اِس سے پہلے بھی چودھریوں کے کئی جانور حلال کئے ہیں-

گھر کے ایک کونے میں ہی انہوں نے جانور کو حلال کیا اور اب گھاس ڈالنے والی کھاد کی بوریوں سے بنی ہوئی چادر بچھا کر اس کی کھال اتارنے لگے- ان کو کھال اتارنے کا بہت تجربہ تھا، جیرو اور دھّنا منٹوں میں مرے ہوئے جانور کی کھال اُتار لیا کرتے تھے مگر آج انہیں احساس تھا کہ یہ جانور مرا ہوا نہیں بلکہ حلال کیا ہوا ہے- اسلئے بڑی احتیاط سے چھریوں کے چھوٹے چھوٹے کٹ لگا کر کھال اتار رہے تھے- کھال اتارنے کے دوران ان کو کھالیں جمع کرنے والوں کے اعلانات بھی یاد آ رہے تھے کہ قربانی کے جانوروں کی کھال انتہائی احتیاط سے اتارنی چاہیئے کیونکہ اس کا بھی ثواب ہے- اسی احتیاط کے دوران جیرو کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلی پر چھری کے کئی زخم بھی لگے مگر اُس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا- یہ پہلا موقع تھا کہ کسی جانور کا گوشت بناتے ہوئے انہیں اتنی احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا ورنہ تو وہ گوشت کو چیلوں کی طرح ایک منٹ میں چیر پھاڑ دیتے تھے- ان کے احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی ان سے پوچھ لیتا تو وہ یہ تک بتا سکتے تھے کہ کُل اتنے سو اتنی بوٹیاں بنی، بوٹیاں بن چکیں تو لگے ہاتھ انہوں نے اس کے تین حصے بھی کر دیئے اور ہر حصے کو پرنے میں ڈال کر تینوں نے اسطرح جوکھا کہ ایک بوٹی بھی کسی میں کم یا زیادہ نہیں تھی-

صبح کا اجالا ذرا پھیلا تو گوشت تقسیم کرنے کا مرحلہ درپیش تھا- دھّنے نے اپنے پرنے میں ایک حصے سے اچھی اچھی بوٹیاں ڈالیں اور کاندھے والے کھیس میں چھپاتا ہوا چودھریوں کی حویلی میں پہنچ گیا- چودھری صاحب ابھی نہانے دھونے کی تیاریوں میں مصروف تھے- انہوں نے دھّنے کو ایک طرف کوئی چیز اٹھائے ہوئے کھڑا دیکھا تو کہنے لگے دھّنے کیا بات ہے اور یہ پرنے میں صبح صبح کیا اٹھا رکھا ہے- دھّنا پہلے تو ذرا گھبرایا اور پھر کچھ دیر توقف کے بعد بولا چودھری جی گوشت لایا ہوں، اس دفعہ ہم نے بھی قربانی کی ہے- چودھری صاحب پہلے کھلکھلا کر ہنسے اور پھر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہنے لگے، مگر دھّنے قربانی تو عید کی نماز کے بعد ہوتی ہے اور عید کی نماز میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے، یہ قربانی نہیں ہے صدقہ ہے اور ہم صدقے کا گوشت نہیں کھاتے -دھّنا لڑکھڑاتے بوجھل قدموں کے ساتھ واپس مڑا تو یہ سوچ کر اور بھی پریشان ہو گیا کہ وہ بیدو اور جیرو کو کیسے بتا پائے گا کہ اُن کی خواہش کی تکمیل کے بیچ ایک بار پھر کئی سال کا طویل اور پر مشقت سفر حائل ہو چکا تھا-

پیوستہ رہ شجر سے

ڈاکٹر زین السالکین سالک

(اسلام آباد)

شاید یہ میری زندگی کی آخری تحریر ہوگی۔ آج مجھے جو تجربہ ہوا وہ اگر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ شاید میرے اندر زندہ رہنے کی جستجو کچھ دن اور رہتی اور میں رفتہ رفتہ زندگی کی طرف لوٹ آتا۔ اس کی سرگرمیوں میں اس طرح بھرپور انداز میں حصہ لینے لگ جاتا جس کی تمنا میں ہمیشہ سے کرتا آیا ہوں۔ لیکن آج تک نہ کر سکا۔ آج مجھے اپنی زندگی کے ڈرامائی مناظر یاد آ رہے ہیں جن میں ایک میرے بچپن بِتایا شہر بھی ہے۔ جس میں میں مگن تھا جن میں ایک میرا پیارا اسکول بھی شامل تھا۔ مجھے مدرسے میں پڑھنے کی قدر اچھی طرح سے معلوم تھی۔ کیونکہ ہم بھائیوں کو تعلیم سے دو سال تک محروم رکھا گیا تھا۔ اس کے لیے میں اپنے باپ کو ذمہ دار نہیں ٹھہراؤں گا۔ اس لئے نہیں کہ اُس دور میں ان کے خیالات پیری مریدی کی طرف زیادہ تھے۔ اور گھر والوں کی طرف وہ کم توجہ دیتے تھے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ ایک معصوم انسان تھے۔ حد سے زیادہ معصوم۔ کام ان کی عبادت تھی۔ جس میں انہیں دن رات کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ وہ اولین کمپیوٹر کے دور کی مشینوں کے انجینئر تھے اور اپنے کام میں مشاق جس کا اعتراف ان کی کمپنی کے لیے پچیس سالہ خدمات کا خصوصی برطانوی کلب میں شمولیت، قیمتی سونے کی سوئیس کلائی کی گھڑی، خصوصی رومن ایکس کا ہندسہ لکھی نک ٹائی اور تعریفی سرٹیفکیٹ تھا۔ کمپنی کے ڈائریکٹر مسٹر وڈ سٹاک کے ساتھ ان کی تصویر کا فریم آج بھی میری خوابگاہ میں آویزاں ہے اور میری ان سے محبت کی یاد ہر روز تازہ کر کے ان کے تعلق کو گہرا کرتا ہے۔ میرے لیے یہ تصویر ان کے خاندان سے تعلق کی یہ نشانی میرے لیے کافی ہے۔ مجھے ان کے کسی اہل خاندان سے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ یہ کوئی ایسی نئی بات نہیں ہے۔ یہ تو ہماری سماجی روایات میں ہوتا ہی آیا ہے کہ اپنے رشتہ دار آپ کو قبول نہ کریں۔ اس لیے کوئی حیرانی بھی نہیں۔ ہاں البتہ دکھ ہے اور بہت شدید دکھ جسے میں اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دوں گا۔ قدرت نے خونی رشتے بنا کر انہیں محبت کے عنصر کو کچھ زیادہ ہی ٹھونس ٹھانس دیا ہے یا پھر حالات و واقعات کی رو میں جذباتیت میں ڈوب چکا ہوں جو اس طرح افسوس کر رہا ہوں۔ کاش مجھ میں انسانی رشتوں کی یہ محبت اس طرح نہ ہوتی تو دکھوں کے سمندر کو میں بھی بآسانی پار کر لیتا۔ دکھ سہنے کی انسانی صلاحیت والی زندگی سے دیوتا جلتے ہیں۔ کیونکہ انہیں کسی امرت، کسی آبِ حیات کی ضرورت نہیں۔ اکلیس وہ پہلا فانی آدمی تھا جس سے انہوں نے اپنی اس خلش کا بدلہ لیا تھا کیونکہ اس نے انہیں زندگی کی بے ثباتی اور موت کا مزا نہ چکھ سکنے کی صلاحیت سے محروم ہونے کا طعنہ دیا تھا۔

میں تو ایک ذرۂ بے نشاں، حقیر انسان ہوں۔ شاید میرے باپ نے بھی اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا جو وہ ہر ایک سے معافی کے طلبگار تھے اپنی بیماری کے دور میں۔ مَیں نے اپنے آدرش بہت اونچے بنا لئے تھے جو آج دھڑام سے نیچے آ گرے ہیں۔ میرے تایا نے آج صاف صاف کہہ دیا کہ تمہارا اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تمہاری شادی فریحہ سے نہیں ہو سکتی۔۔۔ تم اس کے میک اپ تک کا خرچہ تو برداشت نہیں کر سکتے تو میں کیسے تمہیں اپنی بیٹی دے دوں۔ پہلے اپنے آپ کو اس قابل تو بناؤ۔

تایا کے سٹڈی روم میں ان کے بہت سے شکار کئے ہوئے جانوروں کے حنوط شدہ سروں کی ٹرافیاں لٹک رہی ہیں اور بھُس بھرے دیگر خونخوار درندے جانور بھی موجود ہیں۔ طرح طرح کی شکاری بندوقیں، تلواریں، خنجر بھی ترتیب سے رکھے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک قدِ آدم خاندانی شجر کا فریم ہے جس کی تصویر اتارنے کی سخت ممانعت ہے۔

میں فریحہ کو بچپن سے دیکھتا آیا ہوں۔ میرے لیے یہ سمجھنا بہت مشکل نظر آ رہا ہے کہ جب ہمیں ایک ساتھ کھیلنے کودنے کی بچپن سے اجازت تھی تو آج اچانک یہ کیوں۔۔۔ میں تو اسی خاندان سے ہوں۔۔۔!

مجھے پورا یقین ہو گیا ہے اب ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ نہ ایک ہو سکیں گے۔ اس کے بارے میں میری یادیں بچپن سے پیوستہ ہیں۔ جب ہم سب کزن مل کر Karakataoa East of Java فلم دیکھنے گئے تھے۔ میں نے اسے بڑے ہونے کے بعد بہت کم دیکھا کیونکہ وہ زیادہ تر بیرون ملک رہی۔ میرے ذہن میں اس کی بچپن کی تصویر تھی جب وہ انگلش کی نظمیں میرے والد اپنے چچا کو اور میری توجہ اپنی طرف پوری مرکوز کرا کر اپنی سلیولیس کرنکل فراک میں کھڑی ہو کر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کے اشاروں سے ''سلیپنگ۔۔۔ لیس ماما'' پوری سنانے سے پہلے جان نہ چھوڑتی تھی اور ابو اور میں پورے انہماک سے سننے کے بعد تالیاں بجاتے، ابو پیٹھ ٹھونکتے اور اسے رنگ برنگی پنّیوں والی چاکلیٹ جو اس کے لیے پہلے سے جیب میں ڈال کر لاتے تھے دیتے وہ اصل میں مجھے گھر لیجانے آئے تھے۔ کیونکہ میں اکثر کبھی خود اور کبھی اپنے ان عم زادوں کے اسرار پر ان کے گھر رہنے کی ضد کر کے ٹھہر جاتا تھا۔ یہ بہت تسلسل سے ہو رہا تھا۔ ہوتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے عمر کی کئی حدیں پار کی تھیں تو آج یہاں تک پہنچا تھا۔

میں نے گاندھی کی سماج سیوا، اچھوتوں کے خلاف روّیے کو بدلنے کی تحریکوں کے بارے میں پڑھا تھا۔ آج مجھے ذات پات کا موضوع پھر یاد آ گیا ہے۔ ہماری فلموں اور ادب میں کبھی یہ موضوع خاصا دہرایا جاتا تھا۔ انہیں مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ شودر، ہریجن، دِلّت اور نہ جانے کیا کیا، انگریزی میں Pariah کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ جب کسی کو آؤٹ کاسٹ کرنا ہو تو۔۔۔! مجھے آج محسوس

ہورہا ہے کہ میں اچانک ایک شودر بن گیا ہوں۔زندگی کے دروازے مجھ پر بند ہو چکے ہیں۔کسی بہت بڑی غلطی،احساسِ ندامت سے وہ شرمندگی نہ ہوتی جو مجھے آج ہوئی ہے۔مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ایسا میرے ساتھ ہوا ہے۔

میری تائی اماں بندوق والا خاندان گجرات ممبئی کی ہے۔تایا کی ہوائی کمپنیوں کے ٹریول ایجنٹ اور اس سے پہلے جہاز راں شپنگ کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر تعینات تھے۔بہت رکھ رکھاؤ والے انسان ہیں۔ان کی بک شیلف میں لارنس آف عریبیہ کی ''سیون پلرز آف وزڈم'' کئی ممالک کے چینی مٹی کے سوینیئرز اور شیلف کے سب سے اوپر والے خانے میں محوِ رقص رہتا ہے۔۔۔وہ پائپ والا تمبا کو پیتے اور دوسری جنگ عظیم اور شمالی کوریائی جنگ اور سرد جنگ کے موضوع پر تھرلر پڑھنا پسند کرتے ہیں اور ٹی وی پر امریکی سوپ آپرا کے بھی بڑے شوقین ہیں۔تایا تائی کو امریکہ کا شروع سے بڑا اشوق تھا۔اس لیے میرے دونوں تایازاد بھائی آج کل امریکہ میں سیٹل ہیں۔اور کل کلاں کو ان کے والدین بھی وہاں ہمیشہ کے لیے اپنا بڑھاپا گزارنے چلے آئیں گے۔۔۔میری دعائیں ان کے ساتھ رہیں گی۔خدا ان کا سایہ ہم چھوٹوں پر قائم رکھے۔۔۔میں یہ دعائیں شاید زیادہ دلجمعی سے مانگتا اگر وہ مجھے بھی اپنے خاندان کا فرد سمجھتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔مجھے پر ان کے ویسے ہی بہت احسانات ہیں وہ ہر ایک رشتہ دار کی مدد کرنے کا جی جان سے حوصلہ اور استعداد رکھتے ہیں۔

بندوق والا خاندان کے ایک فرد پر جب لندن میں بینکنگ فراڈ کیس میں غلط فردِ جرم عائد ہو رہی تھی وہ اپنے اس بھتیجے کو چھڑا لائے تھے جس نے ان کی چھوٹی بیٹی کو طلاق دے دی تھی۔شاید اس لیے کہ وہ بھی ارب پتی تھا یا پھر واقعی ان کی خاندانی شرافت و اقدار رگ حمیت جاگی تھی۔ایسا کام تو بہت روشن عالی دماغ شخص ہی کر سکتا ہے یا پھر میں یونہی مان لوں کہ وہ واقعی عظیم آدمی ہیں۔میرے معاملے میں بھی وہ اتنا غلط تو نہیں کہہ رہے میں اگر اس خاندان میں پیدا ہو گیا ہوں تو میرا قصور تو نہیں ہے۔کونسا ایسا شخص ہو گا جو اپنی پیدائش کے لیے خاندان چُننے کی قدرت و استطاعت رکھتا ہو۔اگر یہ غیبی قوت و قدرت مجھے حاصل ہوتی تو میں اس خاندان میں تو کم از کم پیدا نہ ہوتا۔۔۔اور انہیں شرمندہ نہ کرتا۔۔۔اس کے علاوہ رشتے کے انکار کی کوئی وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ہاں ایک خیال ضرور گزرتا ہے کہ کہیں وہ اپنی اس منہ بولی خالہ کی بیٹی کی طرف داری تو نہیں کر رہے جس سے میری منگنی ٹوٹ چکی ہے۔اس بات کو عرصہ دراز ہو چلا ہے۔منگنی کی رسم میں وہ نہ صرف شریک تھے بلکہ منگنی کرانے میں بھی ان کا ہاتھ تھا اور انہوں نے میری وکالت بھی کی تھی رشتے کے معاملے میں۔

خالہ کا خاندان اتنا معمولی نہ تھا۔خالو نان کمیشنڈ ریٹائرڈ فوجی تھے۔میرے حالات تو ہمیشہ سے خستہ رہے۔بیرونِ ملک نوکری کے سفر بھی اس طرح سود مند نہ ثابت ہو سکے کہ میں سماج کے متمول گھرانوں میں سر اٹھا کر جی سکتا۔۔۔مایا کی پوجا ہمارے معاشرے میں اس طرح پھیل اور پنپ چکی ہے کہ اب کوئی اصلاحی انقلابی تحریک اُسے سُدھار نہ سکے گی۔۔۔زمانہ اپنی کٹھور چالیں چلتا اتنا آگے نکل چکا ہے کہ اسے زنجیر ڈالنا ناممکن ہے۔اقدار بدل جائیں تو انہیں قبول کرنا بڑا جان لیوا عمل ہوتا ہے اور انسان سے بہت کچھ نوچ لیتا ہے اور اس کے ساتھ گزارا بہت ہی مشکل بنا دیتا ہے۔

ہونے کو تو رشتے کا انکار کوئی اہم واقعہ نہیں۔ایسا تو لڑکی کے معاملے میں ہوتا ہی ہے کہ کئی رشتوں سے انکار کرنا پڑتا ہے۔تب کہیں جا کر مناسب رشتہ ملتا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مجھے اس کا بھی کوئی افسوس نہیں ہونا چاہیے لیکن کچھ باتیں،یادیں ماضی کی میرے دل میں بازگشت کرتی ہیں جو ایک کرب میں مبتلا کر رہی ہیں۔۔۔اور جن کی وجہ سے مجھے یہ کہنا پڑ رہا ہے۔۔۔جن میں تائی اماں کا یہ جملہ بھی شامل ہے کہ ''تم تو ہمارا خون ہو۔۔۔''

شاید وہ کالج کے دور میں میرے دُبلے پن اور کمزوری کی میری حالت دیکھ کر جذباتی ہو گئی تھیں۔۔۔اور مجھے گھر لے آئی تھیں اور میں کافی عرصے اُن کے گھر رہا تھا۔جب اُن کی اپنی اولادیں نہیں تھیں وہ پرانے زمانے کی بڑی طمطراق اور دبدبے والی خاتون تھیں۔۔۔زندگی کے بارے میں ان کا ایک جیسا روّیہ تھا اور وہ اس پر قائم تھیں اور ہر ایک کو اسی سان پر چڑھا کر تلوار کرتی تھیں۔

کتنا ضروری ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے بہن،بھائیوں، عزیزوں سے ناراضگی ختم کر کے دل صاف کر لیے جائیں تا کہ مرتے وقت کوئی الجھن نہ ہو۔ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا کہ حج و عمرہ پر جانے سے پہلے لوگ ایسا ملنا لازمی سمجھتے تھے کیونکہ یہ سفر مہینوں برسوں کا ہوتا تھا۔جانے والے کو یہ نہ پتہ ہوتا تھا کہ وہ واپس آئے گا بھی یا نہیں؟ اور یہ انہوں نے جتنے حج اور عمرے کیے کیا۔

ایک رات مجھے طویل نفلیں،نیم اندھیرے میں پڑھتے دیکھ کر انہوں نے کہا تھا کہ ''ایسی ٹکریں مارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔۔۔وہ تمہیں نہیں ملے گی''

انہیں میرے دل کا حال کیسے معلوم تھا۔۔۔یہ میں آج تک نہ سمجھ سکا۔۔۔یا پھر انہوں نے جوانی کی نفلیں سمجھ کر اس کے پس منظر کا اندازہ اپنی تجربہ کار نظر سے لگا لیا تھا لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میں تو صرف سکونِ قلب کی تلاش میں تھا اور صرف اسی مقصد سے پڑھ رہا تھا۔ **انما الاعمال بالنیات**

ماضی بڑا عجیب پر اسرار بھی ہوتا ہے۔جیسے ریگزار پر گزرتے ہوئے بل کھاتے سانپ کی لکریں۔۔۔!یا چند ہی لمحات پیشتر گزرے ہوئے کارواں کے نقشِ پا۔۔۔!

صحرا میں کوئی تن آور درخت نہیں ہوتا۔۔۔چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیاں ہوتی ہیں یا ببول کے کانٹے یا زہریلے دودھ اور کانٹوں سے مزّین کیکٹس۔۔۔اور جب کبھی وہ اسے بیتے ماضی کے حال میں آ نکلتے ہیں چبھتے ہیں تو بڑی تکلیف دے جاتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ایسے درختوں سے کیسے پیوستہ رہ سکتا ہوں یہ تو مجھ میں پیوستہ ہوئے جا رہے ہیں۔۔۔!میں بہار کا انتظار کس لیے کروں۔۔۔بہار میں انہی ببولوں،کانٹوں اور کیکٹس کی بہتات ہو گی۔۔۔!

آسانی

زہرہ سمن علی (بلغراد، سربیا)

گھونگھٹ کے پیچھے دلہن کی آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ گر رہے تھے۔اس کے دامن پر ٹکے ہوئے سلمی ستارے کی طرح چمکدار۔اس کے مہندی بھرے ہاتھ گود میں رکھے تھے جیسے کچھ مانگتے مانگتے تھک گئے ہوں۔

باہر باغ میں ہر طرف کچے آموں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔نیم کے پرانے درخت کی شاخوں میں لمبی رسیوں والا جھولا لگا ہوا تھا۔بچپن میں جھولا جھولتے ہوئے بیکراں کھلے آسمان کو دیکھتے ہوئے اس کو لگتا تھا کہ دنیا فانی نہیں۔

دبے قدموں وہ ساری دوپہر پرانے گھر کے برآمدے اور باغ میں پھرتے ہوئے گزار دیا کرتی تھی۔اس کو ننگے پاؤں پھرنے کی عادت تھی امی کتنی ناراض ہوتی تھیں۔

''دن بھر جوتوں کے بغیر، لوگ بھی کیا سوچتے ہوں گے، جوتی خریدنے کو پیسہ نہیں پاس، دوپٹہ کہاں ہے تمہارا، حلیہ دیکھا ہے اپنا، بال بکھرے ہوئے، پاؤں گندے، چڑیل لگ رہی ہو'' اور وہ گھبرا جاتی، سوچتی کہ حلیہ تو اس نے واقعی بہت خراب بنا رکھا تھا۔

امتحانوں کے بعد فارغ وقت کیا ملا تھا وہ تو بالکل ہی عقل سے پیدل ہو گئی تھی۔سارا سارا دن یا تو پرانے صوفے میں گھسی کوئی موٹی سی کتاب پڑھتی رہتی یا پھر یونہی اوٹ پٹانگ کچھ لکھتی رہتی تھی یا پھر بے چینی سے بھری ہوئی برآمدوں اور باغ میں چہل قدمی کرتی رہتی تھی۔اس کے کپڑے شکن دار رہتے تھے اور بال تو ہمیشہ ہی بکھرے رہتے تھے۔اکثر وہ بلاوجہ چھوٹی سی کسی بات پر غصے سے بھر جاتی تھی اور چیخ چلا کر لڑتی تھی پھر اپنے کمرے کا دروازہ زور سے بند کر کے بستر پر گر کر اونچا اونچا رونے لگتی تھی۔گھنٹوں روتی رہتی تھی، خود سے لڑتی تھی اپنے دل میں بھرے احساس جرم سے بحث کرتی رہتی تھی۔کسی کو سمجھا نہیں پاتی تھی کہ اسے کیا ہے۔وہ تو خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اسے کیا ہے؟

اگرچہ اسے اپنے گھر سے بہت لگاؤ تھا اسے اکثر احساس ہوتا تھا کہ وہ یہاں قید ہے۔یہ بات بھی نہیں تھی کہ اس کا دل باہر جانے کو چاہتا تھا۔باہر کی دنیا اس کو تھکا دیتی تھی۔یہ وہ دنیا تو نہیں تھی جس کی اس کو تلاش تھی اور مایوس ہو کر وہ واپس آ جاتی تھی۔اپنے کمرے میں چھپ جاتی تھی۔

اس کو لوگوں سے ملنا مشکل لگتا تھا۔ہاں کبھی ان کے ہمسائے میں وہ پروفیسر مس رفیقی رہا کرتی تھیں۔بڑی تازہ دم اور خوش باش نظر آتی تھیں اور تیز گلابی رنگ کی لپ سٹک لگایا کرتی تھیں۔جب سمیرہ سکول میں تھی ان کے پاس اکثر جایا کرتی تھی۔

ان کے گھر میں سب کچھ بہت ہی قرینے سے سجا رہتا تھا۔غسل خانے کی چھوٹی سے کھڑکی پر رنگین پردے تھے اور کھڑکی کی سل پر چینی کا چھوٹا سا کتا بیٹھا رہتا تھا۔مہمان کمرے میں بڑی سی شیشے کی الماری میں دنیا جہاں سے جمع کی ہوئی چھوٹی چھوٹی اشیا موجود تھیں۔ننھے منے جانور، طرح طرح کی گڑیاں، ننھے منے مکان جو اصلی لگتے تھے، رنگ برنگی گاڑیاں۔یہ سب اشیا مس رفیقی نے ملک ملک سے خریدی تھیں۔وہ کالج میں پڑھاتی تھیں اور اکیلی رہتی تھیں۔انہوں نے شادی نہیں کی تھی مگر ان کو بچے اچھے لگتے تھے اور سمیرہ سے تو ان کو بہت لگاؤ ہو گیا تھا۔

وہ اکثر ان کے پاس آ جاتی تھی۔مس رفیقی اسے چائے اور بسکٹ کھلاتی تھیں۔اور کبھی کبھی اپنی سب چھوٹی چھوٹی چیزوں میں سے کوئی ایک دو اسے تحفے میں دیا کرتی تھیں۔ایک دن سمیرہ نے ان سے پوچھا:

''آپ اکیلی کیوں رہتی ہیں، آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

اس کا خیال تھا کہ شاید مس رفیقی اس سوال پر ناراض ہو جائیں گی مگر وہ ہنس پڑیں اور بولیں ''بس ایسے شخص سے ملاقات ہی نہیں ہوئی جس کے ساتھ ساری عمر گزار دینے کو دل چاہے'' اور سمیرہ کو لگا کہ جواب بہت اہم تھا، مگر وہ سمجھ نہ سکی کیوں۔

بعد میں مس رفیقی اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کی دنیا سمیٹ کر دوسرے شہر چلی گئی تھیں۔سمیرہ نے ان کو دوبارہ کبھی نہ دیکھا۔

یہ کیسے ممکن ہے، اس نے سوچا کہ بعض دفعہ لوگ مرے بغیر ہی ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

اس کے جلد بعد ہی ابا چل بسے تھے۔اچانک ہی اور اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیسے روئے اور اگر روئے تو پھر آنسو کیسے روکے؟ یہاں تو عمر بھر کے آنسو ایک دکھ کے لیے بھی کافی نہیں تھے اور دکھ بے شمار تھے۔

جب گھر والوں نے کہا کہ اس کی شادی ہو جانی چاہیے رشتہ اچھا ہے، ایسے موقع بار بار نہیں ملتے تو اس نے ان کی بات مان لی۔اگرچہ وہ لڑکے سے ملی تھی اور وہ اس کو ذرا بھی پسند نہیں آیا تھا۔اس نے سوچا کاش کہ وہ مس رفیقی جیسی ہوتی جن کی اپنی ایک دنیا تھی، جن کو دیکھ کر لگتا تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کے سب دکھوں اور خوشیوں کو آسانی کے ساتھ اپنا رکھا ہو۔

''کیا دلہن تیار ہے؟ کہاں ہے دلہن''

آوازیں آئیں اور پھر دروازہ کھلا۔

''تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو''

نجانے کب کس خیال میں وہ یہاں اس کمرے میں چلی آئی تھی اور دیر سے یہیں بیٹھی تھی۔یہاں صرف پرانی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔پرانی کتابیں، پرانی تصویریں، وہ بدنما ڈیکوریشن پیس جو لوگ نجانے کیوں تحفے میں لے آتے تھے۔یہاں اس کے بچپن کے کھلونے، اس کی سکول کی کاپیاں تھیں اور پرانی تکلیف دہ یادیں تھیں جیسے ابا کی وہ سب چیزیں جو امی نے اس کے جانے کے بعد یہاں رکھ دی تھیں۔وہ سب کچھ جو نہ پھینکنا ممکن تھا نہ اپنانا۔۔۔یوں ہی جیسے اس کی زندگی تھی۔

تاجدارِالَم

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

اسلام آباد،

پاکستان۔

تاجدارِالَم!

جناب باراک حسین اوباما،

صدر ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔

صاحبِ عالم! آپ کے پیشِ نظر اس وقت دو وجوہات باعثِ پریشانی ہوں گی۔ اوّل تیسری دنیا بالخصوص پاکستان کے بے نام ونشاں قلم کار کا آپ سے براہِ راست مخاطب ہونا دوئم زیرِ نظر مکتوب میں درج آداب والقاب، پہلی وجوہ یہ عریضہ خود آشکار کردے گا البتہ دوسری کی تشریح اور وضاحت ہم پر لازم ہے۔ آپ جس زبان کے عشق میں بے وجہ گرفتار ہیں اور جسے آپ نے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا ہے اُس میں اکثر حفظِ مراتب سے قطع نظر مخاطب کو ڈئیر یا مسٹر تحریر کیا جاتا ہے۔

یہاں دشواری یہ آن پڑی ہے کہ آپ جناب نے جس منصبِ جلیلہ پر ہمیں فائز کر دیا ہے اُس پس منظر میں ڈیئر اور مسٹر کے الفاظ بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بن سکتے ہیں۔ اپنی ذات کی جانب سے ہمیں قطعی پریشانی نہ ہے کہ ایک زمانہ ہوا اُس چیز سے ہم بے نیاز ہو چکے ہیں جسے ہمارے بزرگوں نے عزتِ سادات کے نام سے موسوم کیا تھا مگر کوئی ہما شُما آپ کی شان میں کسی طرح کی گستاخی کا تصور کرے، یہ ہمیں ہرگز گوارا نہ ہے۔

آپ تو اُڑتی چڑیا کے پر گننے پر قادر ہیں۔ ہماری بابت بھی بخوبی جانتے ہوں گے کہ ہماری گھٹی میں اپنے آباء کی تہذیب، تمدن، رواداری بلکہ فرما نبرداری ابھی تلک پوری آب وتاب سے انگڑائیاں لے رہی ہے۔ جی ہاں! یہ وہی تہذیب ہے جس میں پہلے آپ، پہلے آپ کی تکرار میں ہمارے بزرگوں نے منزلِ مقصود پر پہنچانے والی سواری سے بچھڑنا منظور کر لیا مگر احترامِ انسانیت میں پہل سے گریز بہتر جانا۔

سرِ دست ہمارے لیے یہ جاننا نہایت اہم ہے کہ آپ جناب اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے تیر وتفنگ کے علاوہ کس چیز کا سہارا لیا کرتے ہیں؟ اگر جناب کو شعر وسخن سے شغف ہے تو خدا معلوم آپ کے پسندیدہ شاعر کون ہیں؟ مثلاً آپ شیلے کو پسند کرتے ہیں یا کیٹس کو، بائرن آپ کو بھاتا ہے یا شیکسپیئر مسرور کرتا ہے الغرض ہومر کے رزمیئے تو آپ کہیں نہ کہیں ضرور کوٹ کرتے ہوں گے۔ ہمیں جب جب اپنی بات کہنے میں دشواری کا سامنا ہوتا ہے تو چچا غالب ہماری مدد کو آن پہنچتے ہیں۔ دیکھئے! اس وقت بھی کس خوبصورتی سے اپنے ماضی کا دفاع کر رہے ہیں:

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدا ہی نہیں
ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

عالم پناہ! آپ کو حق ہے، چاہیں تو ہمارے بزرگوں کی وضع داری کو ابرو کی دائیں اور جبڑے کی بائیں جنبش سے داد وتحسین سے سرفراز کریں وگرنہ یہی عمل آپ مختلف زاویے سے فرمائیں گے تب بھی آپ کا پیغام ہم تک پہنچ جائے گا۔

عالیجاہ! آپ بخوبی جانتے ہیں کہ گذشتہ چھ دہائیوں سے مختلف مدارج اور مناصب سے سرفراز ہونے کے باوجود حرفِ شکایت ہماری زبان پر آنے کی جرأت کر سکا ہے نہ ہماری زبان اس کی تاب لانے کی ہمت رکھتی ہے۔ جناب والا کی جانب سے ہر ہر حسنِ سلوک کے بعد اگر ہم یا ہمارے اٹھارہ کروڑ لوگوں نے آپ سے کبھی کوئی مطالبہ کیا ہے تو صرف اتنا کہ بندہ پرور! وقت کے زیاں سے بچنے کے لیے حسنِ سلوک پر مامور اہلکاران کی تعداد بڑھا دی جائے تاکہ ہم یا ہمارے لوگوں کو خدمت کی بجا آوری میں تاخیر کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ یہاں آپ سے ہماری توقع قطعی بے جا نہ ہوگی کہ آپ لفظ ''خدمت'' کی تفصیل یا نوعیت دریافت کر کے خود بھی پشیماں نہ ہوں گے اور ہم کو بھی پشیمانی سے دوچار نہ کریں گے۔

آپ کو حق ہے بلکہ آپ ہی کو حق ہے (مدت ہوئی ہم اپنے جملہ وغیر جملہ حقوق سے رضا کارانہ طور پر دست بردار ہو چکے ہیں) کہ آپ ہم جیسے عاقبت نا اندیش سے یہ دریافت کریں کہ اس قدر کوتاہ قد اور کور ذہن کو آپ جناب کی سرکار میں شترِ بے مہار کی مانند در آنے کی جرأت کیونکر ہوئی؟

قصہ اصل میں کچھ یوں ہے کہ آپ نے ہماری جانب سے تحریر کردہ عریضہ بنام عفیفہ آئی۔ ایم۔ ایف کو جس قدر پذیرائی بخشی ہے اُس کے بعد کیلر یز کی تمام تر قلت کے باوجود ہمارے حوصلے جواں اور ہم جواں تر ہو گئے ہیں۔ ہمیں ہرگز ہرگز یہ اندازہ نہ تھا کہ آپ ہمارے قیافوں اور اندازوں کا اس قدر اثر لیں گے کہ گھڑی کی چوتھائی میں ہمارے اندیشوں کو یقین میں بدلتے ہوئے پاکستان کی نوزائیدہ حکومت کی درخواست پر آناً فاناً لبیک کہتے ہوئے وہ سب کچھ منظور اور قبول فرمالیں گے جو کچھ عرضداشت میں تحریر کیا گیا ہے اور جو نہیں بھی کیا گیا اُس پر بھی صاد فرمادیں گے۔ ہماری باچھیں تو مارے خوشی کے اس لیے بھی کھلی جا رہی ہیں کہ آپ کی ہدایت یا خواہش پر عزیزہ آئی۔ ایم۔ ایف نے درخواست میں درج کردہ قرض کی رقم میں از خود اضافہ بھی فرمادیا ہے۔ معاف کیجیے گا! قلم کی جنبش نے

امداد کو قرض تحریر کر دیا ہے جس کے لیے ہم سراسر شرمندہ ہیں۔
ملاحظہ فرمائیے! غلطی قلم نے کی اور گھوڑے ذہن نے دوڑانا شروع کر دیے۔ رہ، رہ کے ایک سوال ہمیں تنگ کیے جاتا ہے! آپ جناب کی فراخدلی کے طفیل ورلڈ بنک اور آئی۔ ایم۔ ایف ہم جیسے غریب اور مفلوک الحال ملک کو جس فیاضی اور فراوانی سے قرض فراہم کر رہے ہیں (معافی چاہتا ہوں قرض نہیں امداد) اُس کے مقابلہ میں غربت، مہنگائی، بے روزگاری اور بے اطمینانی کئی گناہ بڑھ گئی ہے۔ ہر نئی آنے والی حکومت آتی سہانے خواب دکھلا کر ہے اور مسند نشین ہوتے ہی سابقہ حکمرانوں کی کارگزاری بتلا کر ڈراؤنے خواب دکھلانے لگتی ہے جس کا مقصد نئے سرے سے قرض یعنی امداد لینا ہوتا ہے۔
میرے حضور! نئی جمہوری حکومت نے تازہ یہ تازہ خوشخبری یہ سنائی ہے کہ ہم مجبور ولاچار اٹھارہ کروڑ لوگوں پر ڈیڑھ دہائی پہلے جو قرض دو ہزار آٹھ سو ارب پاکستانی روپے واجب تھا وہ اب بڑھ کر چودہ ہزار آٹھ سو ارب پاکستانی روپے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس حساب سے ہر معصوم اور بے قصور پاکستانی شہری مبلغ اکیاسی ہزار روپے نصف جن کا چالیس ہزار پانچ سو پاکستانی روپے بنتا ہے کا مقروض ہے۔
یقیناً! یہ رقم آپ یا آپ کے ملک کے شہریوں کے لیے کوئی معنٰی نہیں رکھتی۔ آپ کے ہاں اوسط درجے کی حیثیت والا شخص بھی اس سے زیادہ رقم ماہانہ کما کر آسودہ حال رہتا ہے مگر عالیجاہ! میرے ملک کے اٹھارہ کروڑ لوگوں کی غالب اکثریت اتنی بڑی رقم کمانا تو کجا یکمشت دیکھنے اور شمار کرنے سے بھی قطعی نامانوس ہے۔ اب میرے ملک کے سادہ اور اَن پڑھ لوگوں کے ذہن میں یہ بات کسی طور نہیں سما رہی کہ آپ کی میرا مطلب ہے ورلڈ بنک اور آئی۔ ایم۔ ایف کی جانب سے ملنے والی رقم امداد ہے تو یہ قرض ہمارے سروں پر کیونکر چڑھ آیا؟
طُرفہ تماشا یہ ہے کہ قرض یا امداد کی ایک پائی بھی ملنے سے قبل بجلی، گیس، پٹرول کے ڈرون ہمارے سروں پر برسنا شروع ہو گئے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اِن بنیادی ضرورتوں کی گرانی کے بعد مہنگائی کا اگلا طوفان جو ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے اُسے سوچ کر ہی حال آ رہے ہیں۔ ہر خواندہ اور ناخواندہ پاکستانی سوتے، جاگتے میر تقی میر کی آواز میں آواز ملا کر دہائی دیتا نظر آتا ہے:

میؔر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا
موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

حضورِ والا! مشہور چینی کہاوت آپ کی نظر سے ضرور گزری ہوگی ''چھوٹے راز شور مچاتے ہیں اور بڑے راز خاموش ہو جاتے ہیں'' اس کے باوجود آپ سے التجا ہے کہ راز داری ہی میں سہی آپ ہمیں قرض اور امداد کا فرق بتلا دیجیے! ساتھ ہی اس امر کی وضاحت بھی کر دیجیے کہ آپ کی بھرپور سرپرستی، توجہ اور راہنمائی کے باوجود ورلڈ بنک اور آئی۔ ایم۔ ایف سے رجوع کرنے والے ممالک بالخصوص پاکستان اس قدر مفلوک الحال کیوں ہے؟ اس وقت ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم آپ کی خدمت میں CONFESSIONS OF AN ECONOMIC HITMAN کے منصف جان پرکنز اور راز افشائی کے بادشاہ ایڈورڈ جوزف سنوڈن کے حوالے سے وہ تمام اعداد و شمار پیش کریں جن سے ورلڈ بنک اور آئی۔ ایم۔ ایف کی خوشحالی اور تیسری دنیا کی بدحالی کی تصویر نمایاں ہوتی ہے مگر فسادِ خوفِ خلق خدا کے ڈر سے خاموش ہیں۔
بندہ پرور! ہماری گزارشات کے جواب میں اگر آپ ہم یا ہمارے ملک کے صاحبِ اختیار لوگوں کو ذمہ دار ٹھہرائیں گے تو یہاں یہ سوال ضرور سر اٹھائے گا کہ ان لوگوں کو ہماری قسمت کا ناخدا بنانے والی طاقت کون ہے؟ کون ہے جو روزِ اوّل سے خود ساختہ اشرافیہ کے سیاہ و سفید کارناموں سے چشم پوشی کیے ہوئے ہے؟ کون ہے جو ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے واپس لے رہا ہے؟ کون ہے جو ہمارے خون سے نچڑی ہوئی ناجائز دولت کو تحفظ فراہم کر رہا ہے؟ کون ہے جو جنگل کے بادشاہ شیر کی مانند ''پہلا حصہ اپنے حق کے مطابق، دوسرا جنگل کے بادشاہ کے طور پر، تیسرا سب سے زیادہ طاقتور ہونے کی وجہ سے اور چوتھا جو اُس کی طرف بڑھا وہ سلامت نہ رہے گا'' کے مطابق تقسیم کر رہا ہے؟
میرے بادشاہ! آپ بڑی سرکار ہیں۔ آپ کی ذمہ داریاں بھی بڑی ہیں تو کیا آپ کا دل بڑا نہیں ہونا چاہیے! بڑے دل والے ہمیشہ عدل و انصاف کے خوگر ہوا کرتے ہیں اگر ہم آپ سے عدل و انصاف کی توقع نہیں کریں گے تو کیا جنگل کے بادشاہ کے پاس جا کر انصاف مانگیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ انصاف آپ ہی کو کرنا ہے اور بروقت کرنا ہے اگر اس میں ذرا سی بھی کوتاہی یا تاخیر ہوئی تو میرے ملک کے اٹھارہ کروڑ مجبور و مقہور انسانوں کے ساتھ دنیا کے تمام محروم طبقات یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ آپ کے ہاں بھی جمہوریت کی تعریف آسکر وائلڈ کے فلسفے ''جمہوریت کے طلب گاروں پر اُن کا اپنا ڈنڈا اُن کی ننگی پیٹھوں پر برسانا چاہیئے'' کی روشنی میں کی جاتی ہے۔
خدانہ خواستہ! ہمارے خدشات درست ہوئے تو یہ انسانی تاریخ کی بڑی بلکہ بہت بڑی بدقسمتی ہوگی! ہمارا دل، یہ سوچ کر ہی بیٹھنے لگتا ہے کہ آج کی خود ساختہ مہذب اور تہذیب یافتہ سوسائٹی کو آنے والی نسلوں کے سامنے جس خفّت اور شرمساری کا سامنا ہوگا اُس کا ازالہ کس طور ممکن ہو سکے گا؟
جہاں تک ہماری ذات، ہمارے ملک اور ہمارے لوگوں کا سوال ہے تو اُن کی سوچ، جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہم سابقہ عریضے میں منظوم شکل میں کر چکے ہیں۔ اس بار بھی اُس کی پیروی کرنے پر مجبور ہیں:

یہ بازی زیست کی بازی ہے
یہ بازی تم ہی ہارو گے
ہر پیٹھ ہماری ننگی ہے
تم کتنے ڈنڈے مارو گے

''آسمان بولتا ہے''

غلام نبی اعوان (راولپنڈی)

تُو بولتا ہے تو سارا جہان بولتا ہے
زمین بولتی ہے آسمان بولتا ہے

رہائی ملتی ہے آواز کو اسیری سے
ہزار سال کے بعد آسمان بولتا ہے

دل و نگاہ کے عیسیٰ میں گوش بر آواز
سرِ صلیب کوئی ہم زبان بولتا ہے

جھگڑ رہے ہوا سے کواڑ کمروں کے
مکین جاگ رہے ہیں مکان بولتا ہے

عدو سے کرتا ہوں اب گفتگو اشاروں میں
میں اُس کی اور وہ میری زبان بولتا ہے

خموش بیٹھے ہیں دونوں اجاڑ کمرے میں
نہ میزبان نہ کچھ مہمان بولتا ہے

یہ کون گذرا ہے صحرا پہ منکشف ہو کر
قدم قدم پہ قدم کا نشان بولتا ہے

وہ ایسے بول رہا ہے وجود میں میرے
کہ جیسے مالکِ کون و مکان بولتا ہے

کوئی تو ہے جو کھڑا ہے صدا کے پہلو میں
میں بولتا ہوں تو یہ درمیان بولتا ہے

تمام شہر ہے قائل تری صداقت کا
یہ اور بات کہ اک بدگمان بولتا ہے

نعیم الدین نظر (میر پور خاص)

فکر بڑھتی رہی کسانوں میں
فصل غارت ہوئی لگانوں میں

جو سرِ عام جرم کرتے ہیں
کتنی عزت ہے اُن کی تھانوں میں

کتنا ارزاں ہے خون آدم کا
کیسی مستی ہے حکم رانوں میں

جن کی آنکھیں ہیں نیند سے بوجھل
ایسے رہبر ہیں کاروانوں میں

تجربے نے جنہیں تراشا ہے
ایسے ہیرے ہیں خان دانوں میں

رزق کی جستجو ہے پنچھی کو
دھوپ اتری ہے آشیانوں میں

چھت پہ کالی گھٹا کے سائے ہیں
گھپ اندھیرا ہوا مکانوں میں

سب نے غربت میں ساتھ چھوڑا نظر
پھول کھلتے نہیں چٹانوں میں

سیفی سرونجی (سرونج، بھارت)

خلوص بانٹتے پھرتے ہو روشنی کی طرح
کہ دشمنی نہیں آتی ہے دشمنی کی طرح

ہر ایک شخص کو سیراب کر دیا اس نے
ہے اسکی زندگی بہتی ہوئی ندی کی طرح

جھلک دکھا کے وہ روپوش ہوگئی مجھ سے
خوشی نہ آئی کبھی گھر میرے خوشی کی طرح

کسی نے حال نہ پوچھا تمام عمر مرا
میں اپنے شہر میں رہتا ہوں اجنبی کی طرح

ہمارے عہد کی تاریخ کیا لکھے کوئی
بھری ہے خون سے اکیسویں صدی کی طرح

اداسیوں نے عجب حال کر دیا میرا
مجھے ہنسی نہیں آتی کبھی ہنسی کی طرح

○

کرامت بخاری (لاہور)

مکاری، عیاری ہے دھوکہ دُنیا ساری ہے
مرنا ہے آسان یہاں جینے میں دشواری ہے
امن کے ایک پرندے کا سارا شہر شکاری ہے
غیروں نے برباد کیا اب اپنوں کی باری ہے
دشمنِ جاں کی جان ہمیں اپنی جان سے پیاری ہے
دل نے ہی اِس دنیا کی ساری بات سنواری ہے
یاد کے دھندلے منظر سے اک تصویر اُتاری ہے
نامعلوم مسافت میں ساری عُمر گزاری ہے

○

عارف شفیق (کراچی)

جس کو نفرت ہے اسے پیار بھی ہوسکتا ہے دل کا صحرا کبھی گلزار بھی ہو سکتا ہے
آج آیا ہے وہ ہر اک دیوار گرا کر ملنے کل وہی راہ کی دیوار بھی ہو سکتا ہے
آج جو مجھ میں سمایا ہے مری روح کی طرح کل مری ذات سے بیزار بھی ہوسکتا ہے
شہر میں سب سے بڑا جو ہے مخالف میرا کل وہی میرا طرفدار بھی ہو سکتا ہے
پارسائی کا نشہ جس پہ چڑھا رہتا ہے وہ بھی انساں ہے گنہگار بھی ہوسکتا ہے
پھول سے لفظ مرے خار بھی بن سکتے ہیں نرم لہجہ مرا تلوار بھی ہو سکتا ہے
میں جو ہر شخص کے کردار پہ شک کرتا ہوں میرا دشمن میرا کردار بھی ہو سکتا ہے
زعم ہے جس کو بصیرت پہ بہت ہی اپنی اندھی خواہش میں گرفتار بھی ہوسکتا ہے
میرے جیسا ہی جو بدنام بہت ہے عارف وہ کوئی صاحبِ کردار بھی ہو سکتا ہے

○

تصور اقبال (اٹک)

داستاں میری یوں مختصر ہو گئی اُن کے جاتے ہی دنیا اُدھر ہو گئی
زندگی یوں تو ہے میری اچھی بھلی تنگ دستی مگر ہم سفر ہو گئی
رات کاٹی ہے کیسے نہیں پوچھتے بس یہ کہتے ہیں دیکھو سحر ہو گئی
میرے قدموں کے سارے نشاں ہیں وہاں گرچہ سُونی وہ اب راہگزر ہو گئی
فرق کر لیتی ہے آج سچ جھوٹ میں قوم ساری مری دیدہ ور ہو گئی
آج پھر ایک عورت نے کی خودکشی بس یہی دیکھ کر آنکھ تر ہو گئی
وہ تو لاعلم تھے میرے حالات سے اُن کو اقبال کیسے خبر ہو گئی

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

سب کی خاطر دُعا کرے کوئی دل سے سجدہ ادا کرے کوئی
دُور سے آ رہی ہیں آوازیں کہتی ہیں کیا سُنا کرے کوئی
کب تلک خامشی کو سُنتا ہے سُن کے پھر کچھ کہا کرے کوئی
اس قدر چرچے بے وفائی کے اب کسی سے وفا کرے کوئی
گر طبیعت اِدھر نہیں آتی بھُولے سے ہی بھلا کرے کوئی
اب یہاں کون سا مسیحا ہے کس کے دکھ کی دَوا کرے کوئی
کس قدر آج کل ضرورت ہے ہر گھڑی ہی دعا کرے کوئی
جب کوئی در پہ نازلی آئے کچھ نہ کچھ تو دیا کرے کوئی

○

نوید سروش (میرپورخاص)

کیسے کیسے لوگ ملے انجان بہت تیرے شہر میں آ کر ہوں حیران بہت
جا کر تم بھی صحراؤں میں دیکھو تو چاک گریباں ملتے ہیں انسان بہت
اُن کی قدر و قیمت کوئی کیا جانے جن لوگوں کے مجھ پر ہیں احسان بہت
میری زیست کا محور ہیں وہ دوست مرے رکھتے ہیں جو ہر مشکل میں دھیان بہت
صحراؤں کی ویرانی تو سنتے تھے لیکن اب تو شہر بھی ہیں ویران بہت
تم جن کو سمجھے ہو اپنا یار سروشؔ پہنچاتے ہیں وہ تم کو نقصان بہت

○

ندیم ہاشمی (کراچی)

حالِ دل سن کے حال ہو جائے اس قدر تو کمال ہو جائے
پھر سرِ راہ دیکھ کر ہم کو حُسن محوِ سوال ہو جائے
موسموں کی بھی قدر ہوتی نہیں جب طبیعت نڈھال ہو جائے
مانگ بیٹھا ہوں یہ دُعا یارو! منصبِ دل بحال ہو جائے
یاد رکھیں سدا جہاں والے دوستی بے مثال ہو جائے!
وہ جو آئے اُداس بانہوں میں ہجر اپنا وصال ہو جائے!
ہاشمی جی یہی غنیمت ہے اُس کو جتنا خیال ہو جائے

○

شائستہ سحر (میرپورخاص)

مثالِ گل مہکتی جا رہی ہوں
نئے رنگوں میں رچتی جا رہی ہوں

یہ کیسی آگ سی تن میں لگی ہے
بہاروں میں سُلگتی جا رہی ہوں

مرے پیکر میں رنگِ نو ہیں سارے
میں تیرا عکس بنتی جا رہی ہوں

تری ہر کیفیت سے آشنا ہوں
ترے دل میں دھڑکتی جا رہی ہوں

پرندوں نے بدل ڈالے ٹھکانے
میں تیری سمت چلتی جا رہی ہوں

بظاہر ہُوں میں سب کے ساتھ لیکن
سحؔر خود ہی سے کٹتی جا رہی ہوں

○

اسد اعوان (سرگودھا)

وجودِ چشمِ براں کے قریب بیٹھ گئے
نفوسِ غنچہ دہاں کے قریب بیٹھ گئے

ہمیں یہ ڈر ہے کہیں راکھ بھی نہ کرڈالیں
جمالِ شعلہ رُخاں کے قریب بیٹھ گئے

یہ خواب ہے کہ حقیقت ہے آج محفل میں
ہم اپنے دشمنِ جاں کے قریب بیٹھ گئے

ہے صرف چار قدم پہ حرم مگر جا کر
وہ رند پیرِ مغاں کے قریب بیٹھ گئے

ترے قریب جو بیٹھے تو یوں لگا ہم کو
کہ جیسے دونوں جہاں کے قریب بیٹھ گئے

یقیں کی بستیاں تو مٹ چکی ہیں پہلے سے
سیار شہرِ گماں کے قریب بیٹھ گئے

کوئی تو ہم کو بتائے کہاں سے آئے ہیں
وہ کون ہیں جو فلاں کے قریب بیٹھ گئے

کچھ احتیاط تلفظ کے بولنے میں رہے
کہ آج اہلِ زباں کے قریب بیٹھ گئے

کوئی تو ہنس ادھر کا بھی رُخ کرے گا اسدؔ
سو ہم بھی آبِ رواں کے قریب بیٹھ گئے

○

جاوید خان جاوید (ٹنڈوآدم)

محبت میں خسارہ دیکھنا کیا
ہمارا اور تمہارا دیکھنا کیا

جب اپنے ہاتھ سے لکھی ہو قسمت
تو قسمت کا ستارہ دیکھنا کیا

ابھی تو اک جہاں باقی پڑا ہے
جو دیکھا وہ دوبارہ دیکھنا کیا

کرو عزمِ سفر منزل ملے گی
کہ رہبر کا اشارہ دیکھنا کیا

وہ جن کو عشق کا سودا ہوا ہے
انہیں آتش یا آرا دیکھنا کیا

تعصب، بھوک، بدامنی، سیاست
اسے کس کس نے مارا دیکھنا کیا

وہ جن کو رزق کے لالے پڑے ہیں
انہیں گیند اور غبارہ دیکھنا کیا

میں اپنے آپ سے لڑتا رہا ہوں
میں جیتا ہوں کہ ہارا دیکھنا کیا

○

وِشال کھلر

(لدھیانہ، بھارت)

مری اب نیند کا ثانی نہیں ہے — کہ کوئی بھی مرا بانی نہیں ہے
چلا بخشی ہمیں نے خنجروں کو — کہ یوں ہی تو یہ سُلطانی نہیں ہے
خموشی مار ڈالے گی اُسے بھی — مری ہی دُشمنِ جانی نہیں ہے
یہ قصّہ مختصر رکھنا خدارا — یہاں کی رات بے معنی نہیں ہے
وہاں یہ تھا کہ سب کو چپ لگی تھی — یہاں یہ ہے بیابانی نہیں ہے
کہاں کی روشنی، کیسا سنورنا — یہاں تو شاخ پر پانی نہیں ہے
وہاں تو روشنی ہی دُشمناں تھی — یہاں لیکن وہ ویرانی نہیں ہے
یہاں یہ روز کا قصّہ ہے جاناں — نگہ باں ہیں نگہبانی نہیں ہے
انا کے باب میں لکھ دو عبارت — یہاں شے کوئی لافانی نہیں ہے
اسے کیا ساحلوں کی بات کہیے — کہ وہ تو آگ ہے پانی نہیں ہے
کسی کو چاند کا پیکر سمجھنا — مجھے یہ بات بھی آنی نہیں ہے
اسے اب ڈھونڈ کر لائیں کہاں سے — کہ جس کا کوئی بھی ثانی نہیں ہے
ادھوری داستاں کس کو سنائیں — بیاباں ہے بیابانی نہیں ہے
اسے تو بھول ہی جانا ہے بہتر — وہ جس کی آنکھ میں پانی نہیں ہے
عجب یہ دَود ہے دورِ محبت — مزاجوں میں ثناخوانی نہیں ہے
کہانی اور ہی کچھ کہہ رہی ہے — کہ راجا ہے مگر رانی نہیں ہے
ہمیں ہے مشکلوں کا کام دل سے — یہ اچھّا ہے کہ آسانی نہیں ہے
چراغوں کے ارادوں کو بدل دیں — ہواؤں میں وہ طغیانی نہیں ہے
ابھی مت چاہتوں کے راز کہنا — ہمہ تن گوش ربّانی نہیں ہے
ابھی تو اور بڑھنا ہے خسارہ — ابھی یہ زخم درمانی نہیں ہے
مقدّس روپ اس کا خوب لیکن — یہی اک ظلِّ سبحانی نہیں ہے
بجق ہے جان سے جانا ہمارا — جنوں میں کچھ تن آسانی نہیں ہے
دیارِ فن ہے کہ فردوس گویا — کوئی شے میری پہچانی نہیں ہے

○

ہواکے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط......۱۹

تیسرا سال

میں نے تیسرا سال جولائی ۱۹۶۵ء میں شروع کیا۔ ہمارے بیچ کے لڑکے جب کبھی جمع ہوتے ہیں تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ میڈیکل کالج میں ہمارا سب سے خوشگوار سال تھا۔ میں کالج شروع ہونے کا خاص طور سے انتظار کر رہا تھا کیونکہ سال دوم میں میری یونیورسٹی میں پوزیشن آئی تھی اس لئے مجھے یقین تھا کہ کلاس کے لڑکے اور نئے شعبہ جات کے پروفیسر میرا خوش دلی سے استقبال کرینگے۔

اس سال سب سے قابل ذکر چیز یہ تھی کہ اس سال سے ہماری کلینکل کلاسیں شروع ہوئی تھیں۔ یعنی پہلے دو سال ہم نے صرف کلاسوں میں گزارے تھے اور بنیادی علوم ایک تھیوری کی طرح پڑھے تھے۔ ہم جب وارڈز کی طرف جاتے تو کلینکل کلاسوں کے لڑکوں کو مریضوں کو جانچتے ہوئے اور انکے لئے معمولی قسم کے علاج تجویز کرتے دیکھتے تو ہمارا دل للچاتا کہ کب ہم بھی اسی طرح سفید کوٹ پہنے اور گلے میں ''آلہ'' لٹکائے مریضوں کو دیکھیں گے۔ اب وہ دور آ گیا تھا۔

اس سال میڈیسن، سرجری کے علاوہ پیتھالوجی کے مضامین پڑھنے تھے۔ مگر چونکہ یہ مضامین انتہائی دقیق تھے اس لئے ان مضامین کو مزید تین سال تک جاری رہنا تھا اور انکا امتحان فائنل یعنی پانچویں سال کے آخیر میں ہونا تھا۔ اس سال جن مضامین کو پڑھنا اور انکا امتحان بھی دینا تھا وہ ہائجین، پبلک ہیلتھ، جرائم اور قانون سے وابستہ ڈاکٹری (جس میں پوسٹ مارٹم شامل تھا) اور علم نفسیات (phsychiatry) تھے۔

پروفیسر صالح میمن

صالح میمن صاحب ہمارے شعبہ طب کے صدر نشین تھے۔ میرا پہلا واسطہ صالح صاحب سے تیسرے سال کی ابتدا میں پڑا۔ اس کے بعد آج تک میں اپنے دل میں انکے لئے ایسی عزت پاتا ہوں کہ اسکا بیان مشکل ہے۔ وہ میر پور خاص سے دور تھر کے ریگستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''مٹھی'' کے تھے جہاں بجلی یا سڑکیں تو بڑی بات ہے شاید میٹھا پانی بھی میسر نہیں تھا۔ مگر انہوں نے اپنی ذہانت، محنت اور لگن سے یہ پوزیشن حاصل کی تھی۔ تقسیم ہند سے ایک سال پہلے انہوں نے میر پور خاص کے ہائی سکول سے امتیازی نمبروں سے میٹرک کیا تھا اور پھر کراچی سے ڈاکٹری پاس کر کے انگلینڈ گئے تھے جہاں انہوں نے انگلینڈ کے تینوں رائل کالجوں سے پوسٹ گریجویٹ کی اعلی اسناد لی تھیں۔ سندھ میں انہیں طبابت کے لحاظ سے مسیحا مانا جاتا تھا۔

وارڈز میں جا کر اصلی مریضوں کو دیکھنا اور انکی تشخیص کرنے سے پہلے ہمیں اسکے لئے تیار کرنا اور کچھ بنیادی اصول سکھانے ضروری تھے۔ یہ ذمہ داری صالح صاحب کی تھی اور ہمیں اس کے لئے آٹھ ہفتوں کا کریش کورس کرنا تھا۔ یہ کورس صالح صاحب نے اس قدر خوبصورتی سے پڑھایا کہ آج بھی ہماری کلاس کا ہر لڑکا اسے یاد کرتا ہے۔ میں چونکہ اس شعبہ میں خاص دلچسپی لیتا تھا اس لئے جلد ہی میں نے انکی کلاس میں ممتاز حیثیت حاصل کر لی اور صالح صاحب کا منظور نظر ہو گیا۔

ہمیں کئی گروپس میں تقسیم کیا گیا تھا۔ میرے گروپ کی پوسٹنگ بھی صالح صاحب کے وارڈ میں تھی۔ میڈیسن وارڈ نہایت صاف ستھرا تھا۔ موزیک کا فرش اور مریضوں کے بستروں کے درمیان شیشوں کے پارٹیشن اور مرکز میں نرسنگ اٹیشن۔ یہ سب دل لبھانے والے تھے۔ ہمیں اس میں داخل ہوتے ہوئے ایک خاص فخر اور ذمہ داری کا احساس ہوا۔ سب سے پہلا کام مریض کی ہسٹری لینا ہوتا ہے۔ اگرچہ بہت سے ڈاکٹر صاحبان ہسٹری لینے کو ایک ناخوشگوار بار سمجھتے ہیں مگر مجھے ہسٹری لینے میں بہت لطف آتا تھا کیونکہ مجھے لوگوں سے باتیں کرنے کا شوق ہے اور اسکے علاوہ طرح طرح کے لوگوں سے ملنے اور انکے حالاتِ زندگی جاننے کا بھی اشتیاق ہے۔ مجھے اپنے وارڈ میں پہلا دن اور پہلا مریض اچھی طرح یاد ہے۔ وہ لطیف آباد کا ایک تانگے والا تھا جو معدے میں زخم کی وجہ سے داخل ہوا تھا۔ ہسٹری میں اسکے سماجی حالات بھی شامل تھے جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ کس قدر غربت میں گزارا کر رہا ہے اور ہم جس قسم کی غذا اسے تجویز کرینگے وہ اس کے لئے کسقدر دشوار ہوگی۔

طب قانونی

طب قانونی جسے میڈیکل اصطلاح میں medical jurisprudence کہتے ہیں ایک بیحد دلچسپ مضمون تھا۔ اسے پڑھتے ہوئے ایسا لگتا تھا کہ ہم کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہے ہوں۔ اس سال ہمارے اس مضمون کے پروفیسر ریٹائر ہو گئے تھے مگر ہمارے کالج میں ایک ایسے پروفیسر تھے جو ''ہر فن مولا'' مشہور تھے۔ یہ تھے سرجن علی محمد انصاری۔ جب کسی بھی مضمون کا پروفیسر غائب ہوتا تھا تو انصاری صاحب اسکی جگہ لے لیتے تھے۔ ویسے وہ آرتھوپیڈک کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ہمیں یہ مضمون پڑھایا۔ اسکی کتاب ہندوستان کے شہرت یافتہ پروفیسر ''مودی'' کی تھی۔ کتاب کیا

کہانیوں کا مجموعہ تھی۔ کہیں کھیت میں سر کٹی لاش ملی ہے تو اسکی شناخت کا مسئلہ تو کہیں کوڑے کے ڈھیر میں صرف ایک کٹی انگلی ملی تو یہ معلوم کرنا کہ کس ہاتھ کی انگلی ہے اور مرنے والے کی عمر کیا تھی۔ سب سے دلچسپ مضمون وہ تھا کہ گاؤوں میں لاچار عورتیں ظالم شوہروں کو کس طرح ٹھکانیں لگاتی تھیں۔ اس سلسلے میں یہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ دھتورا اور سنکھیا سب سے زیادہ مقبول تھا۔ سنکھیا سے مرنے والے پر جو علامات ہوتی تھیں وہ ہیضہ سے بہت ملتی تھیں اور چونکہ ہیضہ ہندوستان کے گاؤوں میں بہت عام ہے اس لئے موت پر کسی کو کوئی شبہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں جب انگریزوں نے جرائم کی تحقیق سائنسی بنیادوں پر کی تو یہ حیرت انگیز دریافت ہوئی کہ سنکھیا (arsenic) ایک ایسا عنصر ہے کہ یہ مقتول کے مرنے کے تیس چالیس سال بعد بھی اس کے باقیات میں موجود رہتا ہے اسکی سائنسی طریقے سے دریافت کی جاسکتی ہے اور اسطرح قتل کا سراغ لگ جاتا ہے۔

پہلا پوسٹ مارٹم

اسی سال میں نے پہلا پوسٹ مارٹم دیکھا۔ پوسٹ مارٹم کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ دن میں کیا جائے اور جتنی جلدی ممکن ہو کیا جائے۔ اس لئے یہ قانون تھا کہ اگر کوئی پوسٹ مارٹم ہو تو ہمیں کوئی بھی کلاس چھوڑ کر پوسٹ مارٹم میں شامل ہونا ضروری تھا۔ ایک دن جب ہم مختلف کلاسوں میں تھے اعلان ہوا کہ سب بسوں کے اڈے پر پہنچیں۔ ہمیں حیدرآباد کے سول ہسپتال لیجایا گیا۔ وہاں پوسٹ مارٹم لیب میں سول سرجن موجود تھے۔ ہم نے اناٹومی میں ڈسکشن کئے تھے۔ مگر یہ دوسرا معاملہ تھا۔ ایک تو یہ کہ لاش تازہ تھی دوسرے یہ حنوط شدہ نہ تھی تیسرے یہ ایک جوان آدمی تھا جو کلہاڑیوں کے وار سے ہلاک ہوا تھا۔ اسکی تفصیل میں جائے بغیر اتنا لکھنا کافی ہے کہ میرے لئے یہ دو گھنٹے گذارنے مشکل ہوگئے اور میرا دل بہت خراب ہوا۔

باقی مضامین

سرجری کے صدر شعبہ مرزا صاحب تھے چھوٹے، موٹے اور گول مٹول۔ سرجن بہت اچھے تھے مگر غصے کے تیز اور اپنے مزاج کی وجہ سے لڑکوں میں غیر مقبول۔ پیتھالوجی کے صدر سلیم خان تھے جن کی وجہ شہرت یہ تھی کہ وہ امریکہ کی مشہور عالم یونیورسٹی جان ہاپکنز کے تعلیم یافتہ تھے۔ مگر بہت خراب ٹیچر تھے۔ حقیقت میں ہمارے کالج کی نئی فارغ التحصیل ڈاکٹر عذرا شیخ جو ہم سے عمر میں بھی صرف دو سال بڑی تھیں اور نئی نئی ڈیمانسٹریٹر لگی تھیں ان سے کہیں زیادہ اچھا پڑھاتی تھیں۔ ہائجین اور پبلک ہیلتھ ہمیں بیگ صاحب پڑھاتے تھے انہیں لڑکے سنجیدہ نہیں لیتے تھے اور انکے پیریڈ میں مستقل شور، سیٹیاں اور ڈیسک بجانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

تیراکی کے مقابلے

لیاقت میڈیکل کالج کے کیمپس کا میں پہلے تذکرہ کر چکا ہوں۔ یہ انتہائی جدید اور متاثر کن تھا۔ کراچی اور حیدرآباد کے تمام تر تعلیمی اداروں میں اسے یہ انفرادی حیثیت حاصل تھی کہ اس کا جمنازیم بہت ہی اعلی درجہ کے تھا اور اس میں اولمپک سائز کا سوئمنگ پول تھا۔ یہ سوئمنگ پول ہفتے میں ایک دن لڑکیوں کے لئے بھی مخصوص ہوتا تھا۔ سال میں ایک دفعہ تیراکی کے مقابلے ہوتے تھے اور اس تقریب کو SWIMMING GALA کہتے تھے۔ اس کا بہت ہی اہتمام ہوتا تھا اور اس پر کثیر رقم خرچ کی جاتی تھی۔ انہی دنوں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ایک تیراک بروجن داس نے انگلش چینل تیر کر ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس کے اعزاز میں جیتنے والے کو بروجن داس ٹرافی اور ''لیاقت کا بروجن'' کا خطاب دیا جاتا تھا۔ ایک عجب رونق کا سماں ہوتا تھا اور مقابلوں کے بعد ایک بہت ہی فارمل ڈنر ہوتا تھا۔ اس سال ہمارے پرنسپل کرنل نجیب کا حکم تھا کہ تمام لڑکے ڈنر جیکٹس میں ہوں۔ ڈنر کے دوران اونچے اونچے شہتیروں پر لگے لاؤڈ اسپیکروں سے انگریزی موسیقی کی دھنیں رنگ بکھیر رہی تھیں۔ اس زمانے میں انگریزی فلم come september کی ایک دھن بہت مقبول تھی۔ یہ دھن بجنی شروع ہوئی تو اچانک تالاب کے کنارے لگے فرش پر ہماری کلاس کی ایک لڑکی ادیبہ راحت اور لڑکے الپ ارسلان نے ''ٹوسٹ'' ڈانس شروع کردیا۔ پورا جمنازیم تالیوں سے گانج اٹھا۔

یہ سب یادیں اب جب ایک خواب کی طرح مجھ پر یلغار کرتی ہیں تو مجھے انگریز شاعر ٹامس مور کی نظم جسکا نادر کاکوروی نے ترجمہ کیا ہے

اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے
بیتی ہوئی دلچسپیاں گذرے ہوئے دن عیش کے
بنتے ہیں شمع زندگی اور ڈالتے ہیں روشنی۔۔۔ میرے دل صد چاک پر

یاد آتی ہے اور یہ یادیں مجھے اداس کردیتی ہیں۔

پکنک

ہمارا کالج ہر سال پکنک پر جاتا تھا۔ کئی بسیں لڑکوں لڑکیوں سے بھر جاتی تھیں۔ بسیں مخلوط تھیں صرف یہ تھا کہ لڑکیوں کی سیٹیں مخصوص تھیں مگر درمیان میں کوئی پارٹیشن نہیں تھا۔ یونین کا social events کا عملہ پہلے ہی جاکر خیمے لگا دیتا تھا اور کھانے کے لئے دیگیں چڑھ جاتی تھیں۔ ہمارے کالج سے کوئی چالیس میل دور کئی جھیلیں تھیں۔ ان میں کلری بہت مشہور اور دلفریب تھی۔ اس سے ذرا آگے ہالیجی تھی۔ یہیں سندھ کی مشہور رومانوی داستان ''مومل اور رانو'' کا مزار بھی تھا۔ اس دفعہ یونین نے کلری کا نیلم پوائنٹ چنا۔ ہماری بس میں ہماری کلاس کی لڑکیاں تھیں۔ جیسے ہی بسیں شہری حدود سے باہر نکلیں ہم لڑکوں نے کورس میں گانے گانے شروع کردئے۔ اس زمانے میں ایک گانا

بڑے سنگدل ہو بڑے ناسمجھ ہو
تمھیں پیار کرنا سکھانا پڑے گا

بہت مشہور تھا۔ ہم نے لڑکیوں کی طرف دیکھ دیکھ کر یہی گانا کئی دفعہ گایا۔ لڑکیاں

بھی ہمیں مستقل کنکھیوں سے دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد انہوں نے بھی کورس میں مشہور پاکستانی فلمی گیت گانے شروع کردئے۔ انکی سربراہی روشن آرا تالپور کررہی تھی۔ روشن ویسے بھی تمام لڑکیوں کی سردار تھی۔ پھر تو وہ طوفان بد تمیزی مچا کہ آج تک یاد ہے۔ پہلے تو ہمارے درمیان گانوں کا خوب خوب مقابلہ ہوا پھر نوک جھونک اور اس کے بعد ہم نے مشہور رومانی دوگانے گائے۔ اس بس میں باقی کلاسوں کے لڑکے ہم سے خوب جلتے رہے کہ ہماری کلاس میں لڑکیوں اور لڑکوں میں اتنا اتفاق ہے۔

جھیل پر پہنچ کر کرائے پر کشتیاں لی گئیں اور دیر تک کشتی رانی کی گئی یہ بادبان کشتیاں تھیں جنہیں سندھی ملاح چلا رہے تھے۔ سہ پہر کی چائے کے ساتھ سموسے کھائے گئے پھر ایک مختصر سا talent show ہوا جس میں فیکلٹی کے بھی کچھ لوگوں نے حصہ لیا۔ میں نے مہدی حسن کا ایک گانا گانے کی کوشش کی مگر میرا گلا خراب تھا اس لئے لڑکوں نے خوب ہوٹنگ کی اور ایک لڑکی نے چپکے سے میرے کان میں شرارت سے کہا ''اب تم گانا چھوڑ ہی دو تو اچھا ہے'' میں نے اسے ہنسی میں اڑا دیا۔

رشید ڈوبتے ڈوبتے بچا

بدقسمتی سے پکنک پر کسی نہ کسی کا ڈوب جانا پاکستان میں ایک عام بات ہے۔ برسات کے موسم میں کراچی میں کلفٹن یا ہاکس بے پر کئی نوجوان ڈوب جاتے ہیں۔ میرے ایک کلاس فیلو حسن عارف کو تیرنا نہیں آتا تھا مگر وہ جھیل کے سرد اور شفاف پانی سے لطف اٹھانے کے لئے کنارے ہی پر پانی میں اتر گیا۔ ہم سب کنارے پر کھڑے تھے چند ہی منٹ میں کائی لگے پتھر سے اسکا پاؤں پھسلا اور وہ پانی میں غوطے کھانے لگا باقی لڑکے تو مدد کے لئے چیخنے لگے مگر میرا دوست رشید غوری بہت جذباتی تھا۔ اسے تھوڑا بہت تیرنا آتا تھا اس نے بغیر سوچے سمجھے عارف کو بچانے کے لئے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ عارف رشید سے لپٹ گیا اور اب وہ دونوں ڈوبنے لگے اور اسکا یقین تھا کہ وہ دونوں ڈوب جاتے کہ ہماری چیخ پکار سن کر ایک مچھیرا ایک لمبا بانس لیکر آگیا اور ان دونوں نے اس بانس کو پکڑا اور باہر آئے مگر پھر بھی انکے پیٹ سے پانی نکالنا پڑا اور وہ دیر تک کھانستے رہے۔ رشید کہتا تھا کہ میں مرنے کے قریب تھا اور میری نظروں کے سامنے میری زندگی گذر رہی تھی۔ اس کے مطابق اس نے مقدر کے لکھے کو قبول کر لیا تھا اور ہاتھ پیر ڈال دئے تھے۔

پبلک ہیلتھ اور پاگل خانے کا ٹور

سال کے درمیان میں ایک اور ٹور ہوا جو بہت ہی دلچسپ اور تفریح کا سامان لئے تھا۔ ہمارا پبلک ہیلتھ ٹور پہلے تو حیدرآباد کے پانی صاف کرنے کے پلانٹ کا تھا۔ یہ جگہ جام شورو اور حیدرآباد کے درمیان تھی اور واپڈا کے زیر انتظام تھی۔ وہاں ہم نے بڑی بڑی مشینیں اور پانی کے کئی تالاب دیکھے اور پانی کی ترسیل کا پورا انتظام دیکھا۔ اسکے علاوہ پانی میں ہر قسم کی آلائشیں جانچنے کے طریقے کا بھی معائینہ کیا۔ اس میں مختلف جراثیم کو پانی سے علیحدہ کرنے کا طریقہ بھی دیکھا۔ اسی پلانٹ پر ہماری ملاقات اردو کے مشہور شاعر محسن بھوپالی سے بھی ہوئی۔ اس زمانے میں وہ واپڈا میں ملازم تھے اور جام شورو کے پاس واپڈا کالونی میں رہتے تھے۔ مگر یہ صرف پیشہ ورانہ ملاقات تھی۔

پھر ہماری بسیں ہمیں ٹنڈو جام لے کر گئیں۔ یہاں پاکستان کی مشہور زرعی یونیورسٹی ہے۔ یہ علاقہ بیحد سرسبز ہے۔ دور تک لہلہاتے کھیت ہیں اور جگہ جگہ پیڑوں کے جھنڈ ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں جہاں کسانوں کی جھونپڑیاں ہیں۔ ہم نے ایک گاؤں میں تھوڑا عرصے قیام کیا جہاں کسانوں نے ہماری تواضع چھاچ (نمکین لسی) سے کی۔ ہماری منزل village health center تھا۔ اسکا معائینہ کرنے کے بعد ہم تمام طلبہ وطالبات نے کھیتوں کے بیچ چادریں بچھا کر کھانا جو قیمہ اور پراٹھوں پر مشتمل تھا کھایا اور پکی ہوئی چائے پی۔ اسی کے ساتھ تفریح طبع کے لئے ایک مختصر موسیقی کی محفل بھی ہوئی۔ اس میں بھی لڑکیوں نے حصہ لیا۔ جام شورو واپسی مغرب کے بعد ہوئی۔

دوسرے دن ہمیں ''گدو مینٹل ہاسپٹل'' جانا تھا۔ مجھے پنجاب کا تو معلوم نہیں مگر جنوبی پاکستان میں ''گدو بندر'' کا نام سب ہی اس لحاظ سے جانتے ہیں کہ وہاں ملک کا سب سے بڑا مینٹل ہاسپٹل تھا اسے عرف عام میں پاگل خانا کہتے ہیں۔ اسے تقسیم ہند سے پہلے ایک نیک دل ہندو سیٹھ سر دیارام گدومل نے بنوایا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ یہاں انتہائی خطرناک پاگل رہتے ہیں اس لئے ہمیں اپنی حفاظت کا خاص خیال رکھنا پڑیگا۔ یہ ٹور شعبہ نفسیات کی طرف سے تھا۔ اس ہسپتال کے اطراف بہت اونچی دیواریں ہیں اور لوہے کا نہایت مضبوط پھاٹک ہے۔ ہم اندر پہنچے۔ واقعی عجب عالم تھا۔ اس ٹور کا نقطہ عروج یہ تھا کہ ہمیں ''بجلی کے جھٹکے'' لگانے کا طریق علاج دکھایا گیا۔ یہ انتہائی مشکل نظارہ تھا اور ہمیں اس پاگل پر بہت ترس آیا جسے بجلی کے جھٹکے لگائے گئے تھے۔ اب بھی یہ طریقہ امریکہ اور دوسرے ممالک میں رائج ہے مگر مریض کو اس سے پہلے مکمل بیہوش کیا جاتا ہے۔ گدو میں مریض کو بیہوش نہیں کیا گیا تھا اس لئے یہ ہم سب کے لئے بڑا دہشت ناک تجربہ تھا۔

ریڈیو پاکستان

اِدھر میں میڈیکل کالج میں ایک بہت خوشگوار زندگی گزار رہا تھا اُدھر میرپور خاص میں ہمارا کنبہ پھر ایک بار مالی مشکلات میں پھنس گیا تھا۔ ابّا ریٹائرمنٹ کے بعد ایک مقامی کمپنی میں کلرک کے طور پر کام کررہے تھے اور سلطان بھائی جان حسب سابق ہمارے تمام کنبے کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ ان دونوں کی تنخواہوں سے عزت سے گذارا ہورہا تھا کہ ابّا کی آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے انکی ملازمت چھوٹ گئی انکی آنکھوں میں موتیا اتر رہا تھا۔ یہ وقت ہمارے لئے بیحد آزمائش کا تھا۔ اسکے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں بھی کوئی ملازمت تلاش کروں اور گھر والوں کی مدد کروں۔ مگر میں صرف شام کی نوکری کرسکتا تھا۔

اس اثنا میں ریڈیو پاکستان حیدرآباد میں خبروں کے شعبہ میں ضرورت کا اشتہار شائع ہوا۔ مقامی خبروں کو پڑھنے اور اردو میں خبریں لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت تھی۔ اس وقت وہاں اس شعبے کے انچارج زاہد یاسین تھے۔ میں نے انٹرویو دیا۔ انہوں نے کہا صحافتی انگریزی زبان میں ٹیلی پرنٹر پر آنے والی خبروں کو بہت ہی محدود وقت میں ترجمہ کرنے کا مقابلہ ہوگا اور اوّل آنے والے کو ملازمت کا موقعہ دیا جائیگا۔ خوش قسمتی سے میں اس میں کامیاب ہوا۔ ہمارا کالج دو بجے ختم ہو جاتا تھا اور ہم لڑکے ڈھائی بجے ڈائننگ روم میں کھانے کے لئے پہنچتے تھے۔ مگر مجھے حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن پونے پانچ بجے پہنچنا ہوتا تھا۔ میں کبھی کبھی کھانا کھائے بغیر جامشورو سے بس پکڑتا تھا اور شہر میں مارکیٹ کے اڈے پر پہنچتا تھا۔ وہاں سے پیدل ریڈیو اسٹیشن جاتا تھا اور وقت پر خبروں کی ترتیب و تدوین شروع کرتا تھا۔ یہیں میری جہانگیر آزر سے ملاقات ہوئی۔ وہ وہاں مقامی خبریں اور کبھی کبھی موسم کا حال پڑھا کرتا تھا۔ زاہد یاسین صاحب ایک بہت اچھے انسان تھے اور انہوں نے مجھے بہت سراہا اور اخلاقی سہارا دیا۔ میں اپنی تنخواہ میں سے صرف بیس روپئے اپنے پاس رکھ کر باقی رقم اماں کو دیدیا کرتا تھا۔ یہ نوکری میں نے دو سال یعنی فائنل ایر کے شروع ہونے تک کی اور اس نے ہمارے کنبے کے مالی حالات کو بہت سہارا دیا۔ مجھے اس بات کی آج بھی خوشی ہے کہ اس وقت ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے جو خبریں نشر ہوتی تھیں وہ میری زبان اور تحریر ہوتی تھی۔

کالج میگزین

جب ہم تیسرے سال میں تھے کرنل نجیب نے ایک اور غیر معمولی قدم اٹھایا کہ بجائے یونین کے انتخابات ہوں جولڑکے پوزیشن ہولڈر تھے انہیں یونین کے عہدے تفویض کر دئے۔ ہمارے کالج میں میگزین سکریٹری تیسرے سال کا طالب علم ہوتا تھا۔ میں چونکہ پوزیشن ہولڈر تھا اس لئے مجھے میگزین کا سکرٹری اور چیف ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا۔ خوش قسمتی سے پروفیسر صالح میمن اس کے فیکلٹی ایکس آفیشیو تھے۔ اس طرح مجھے انکے ساتھ کام کرنے کا مزید موقعہ ملا۔ گزشتہ تین سالوں سے میگزین سیکرٹری کی کاہلی اور نااہلی کی وجہ سے لیاقت کا میگزین نہیں نکلا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں نے اپنے دوستوں کی مدد سے جس میں میرا نائب مدیر حسن عارف شامل تھا ایک شاندار میگزین نکالا۔ اس میں صالح صاحب نے اڈمنسٹریشن سے فنڈس کے حصول میں میری بہت مدد کی باقی رقم ہم نے کراچی کی بڑی بڑی دواؤں کی کمپنیوں سے اشتہار لیکر پوری کی۔ اس سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ نجمہ شیخ (جی ہاں وہی نجمہ شیخ) نے ایک دن راہداری میں مجھے روک کر بڑی ادائے دلبری سے پوچھ کہ میں نے ایک بہت اچھا مضمون ''نیند'' کی فزیالوجی پر لکھا ہے تم اسے شائع کروگے۔ میں تو اب اس سے بات کرتے بھی ڈرتا تھا۔ بہر حال میں نے کہا اگر معیاری ہوا تو ضرور شائع کرونگا۔ اس نے پوچھا وہ کب مجھے یہ مضمون دے میں نے رکھائی سے کہا تم اسے اسسٹنٹ ایڈیٹر حسن عارف کو دیدینا۔ بہر حال اسکا مضمون رسالے میں شائع ہوا۔

الوداعی پارٹی

سال کے آخیر میں اپنے اساتذہ کو الوداع کہنے اور سال کے مکمل ہونے کی خوشی میں ہم نے کالج کی حسب روائت ایک شاندار پارٹی دی جس میں ڈنر اور موسیقی کا پروگرام بھی شامل تھا۔ اس شام ایک گروپ فوٹو بھی ہونی تھی۔ ہمیشہ کی طرح لڑکوں نے شاندار سوٹ پہنے تھے اور لڑکیاں بھی زرق برق لباس میں تھیں۔ اس دفعہ لڑکیوں میں ایک خاص تبدیلی یہ تھی کہ وہ ثابت کرنا چاہ رہی تھیں کہ اب وہ میچور ہوگئی ہیں اور ہر قسم کا لباس پہن سکتی ہیں۔ ایک لڑکی غرارے میں تھی اور کئی لڑکیاں ساڑھیاں زیب تن کئے تھیں۔ خاص بات یہ تھی اس دن نجمہ شیخ بھی ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی میں تھی اور اس نے ناک میں پہلی دفعہ ایک لشکارے مارتی جگنی پہنی تھی۔ سچ بات یہ ہے کہ اسے دیکھ کر چند لمحوں کو میرے دل کی دھڑکن بے قائدہ ہوئی مگر میں نے جلد ہی خود پر قابو پالیا۔ میرے اور داؤد کے لئے یہ فوٹو اس لئے یادگار رہیگی کہ ہم دونوں اس تصویر میں نہیں ہیں۔ ہوا یہ کہ ہماری کلاس میں دانتوں کی ڈاکٹری کے ایک لڑکے حاتم خان جتوئی نے اسی دن پتھالوجی کے لیکچر میں ڈاکٹر عذرا شیخ سے ایک بہت بدتمیز سوال کیا جس پر وہ ناراض ہوکر کلاس چھوڑ کر چلی گئیں۔ شام کو انہوں نے اپنی باقی خواتین فیکلٹی ممبران کے ساتھ پارٹی میں آنے سے انکار کر دیا۔ اس پر بڑی کھلبلی مچی اور تمام لڑکوں نے مجھے اور داؤد کو نمائندہ بنا کر انکے پاس بھیجا کہ انہیں منا کر لائیں اس میں اس قدر دیر لگ گئی کہ جب ہم آئے تو فوٹو کھنچ چکا تھا۔

بہر حال پارٹی بہت اچھی رہی۔ جب پارٹی ختم ہوگئی تو ہم چند لڑکے جنہوں نے سارا انتظام کیا تھا تھک کر وہیں پتھالوجی کے آڈیٹوریم میں گپیں لگانے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ لڑکیاں جن میں نسرین، روشن اور نجمہ شیخ شامل تھیں آگئیں اور ہمارے ساتھ گھل مل کر بیٹھ گئیں۔ کسی نے کہا کیوں نہ لڑکیوں سے گانا سنا جائے۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ کچھ لڑکیاں گاتی ہیں ہم نے انہیں کورس میں تو گاتے سنا تھا مگر اکیلے گاتے نہیں سنا تھا۔ اس پر پہلے روشن نے قمر جلالوی کی غزل

مجھے یاد ہے ابھی تک تیرے جور کا فسانہ

سنائی۔ وہ واقعی بہت اچھا گاتی تھی۔ پھر نجمہ شیخ نے جگر کی غزل

لگا کر تم سے دل خون تمنا کون دیکھے گا

سنائی اسکے بعد تمام لوگ نسرین کے پیچھے پڑ گئے۔ وہ نہیں گاتی تھی مگر سب کے اصرار پر اس نے پنجابی لوک گیت

لٹھے دی چادر۔۔۔اتّے رنگ سلیٹی ماہیا

سنایا۔ اسطرح یہ شام برسوں یاد آنے کے لئے ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوگئی۔

☆

''ابھی کچھ وقت پہلے''

''جو ہے۔۔۔معدوم ہوتا ہے۔''

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

مکانوں کی چھتوں سے
برف رخصت ہوتی جاتی ہے۔
مگر جاتی کہاں ہے۔؟
کہاں سے آئی تھی۔؟
لائی گئی تھی۔؟ آپ آئی تھی۔؟
آسمانوں سے اتر کر
صورتِ برسات برسی تھی
کہ برسائی گئی تھی۔؟

ابھی کچھ وقت پہلے تک
مکانوں کی چھتوں پر ، چوٹیوں
اونچائیوں ، نیچائیوں پر
مکانوں
پیش لانوں
پائیں باغوں ،پارکوں

سائڈ واکوں
راستوں اور شاہراہوں میں
ابھی کچھ وقت پہلے تک
وہ تھی موجود
حقیقت میں وہ تھی
اور مادے کی ٹھوس صورت میں
اپنے ہونے کی گواہی تھی

گواہی دیتی تھی وہ اپنے ہونے کی مگر اب خود
خلاؤں میں ' نہ ہونے کے ' کہیں
گم ہوتی جاتی ہے۔
حقیقت میں اگر وہ تھی کہاں تھی۔؟
حقیقت میں اگر وہ ہے کہاں ہے۔؟

کہا۔۔کس نے کہا
گوتم سدھارتھ نے
''جو ہے
معدوم ہوتا ہے۔۔!!''

مجھے تجھ سے محبت ہے

ایوب خاور

(لاہور)

[1]

مرے دشمن
میں جینا چاہتا ہوں
تیرے ہونٹوں میں مگر یہ تازہ کلیوں کا مہکتا
شبنمی جادو کچھ ایسا ہے کہ جس نے مجھ کو اپنے لمس کی
گرہوں میں کس کر باندھ رکھا ہے
گُلِ رخ سار کا آتش صفت رنگِ تکلّم
اور نزاکت کی سنہری ڈوریوں میں جو تلاطم خیزیاں ہیں، میرے
سینے کی کسی محراب کے اندر دھڑکتے دِل کی سطحِ غم نما کی سمت لپکی
آرہی ہیں، آتی جاتی سانس کی لہریں تک اس آتش نمائی میں
سلگ کر ٹوٹی جاتی ہیں
نظر کے زاویوں میں
کوئی گہری بات کرنے اور پھر اُس کو پرکھنے کے لیے ہاتھوں کی
پوروں میں کوئی معلوم حدّت منتقل کرنے پھر اُس حدّت کی
شدّت خاص کر دل کی رگوں میں جذب کر دینے میں جو تجھ کو
مہارت ہے قیامت ہے

[2]

مِرے دُشمن
میں تجھ سے اور ترے لشکر سے بچ کر کس طرف نکلوں!
کہیں پر تیری پلکیں خیمہ زن ہیں
اور کہیں زلفوں کے سائے ہیں
گُلِ رخ سار کی آتش صفت رعنائی
اپنے تیر و ترکش سے مزین ہے
کہیں ہونٹوں کی شمعیں ہیں
کہیں آنکھیں ہیں
بے حد خوب صورت اور گہری، اِک طلسمِ خاص
میں ڈوبی ہوئی آنکھیں
یہ آنکھیں ایک ریشم کی طرح
میری اُنا کی سخت جاں دیوار کو اندر سے باہر سے لپٹتی جارہی ہیں
اور مجھے لگتا ہے ذرّہ ذرّہ کر کے یہ حصارِ ذات اب مسمار ہونے
سے کسی صورت بچایا جا نہیں سکتا

مِرے دُشمن
بہت گہرے اندھیرے میں کوئی سالارِ لشکر
جس طرح اپنے پیادوں سے بچھڑتا ہے، اچانک خود کو اُس سالار
کی صورت اکیلا اور شکستہ دیکھ کر میں اپنے تیر و ترکش و خنجر گنوا بیٹھا
ہوں اب تُو ہی بتا مجھ کو، میں تجھ سے اور ترے لشکر سے بچ کر کس
طرف نکلوں!

[3]

چل اب ہتھیار پھینک
اپنے لشکر سے بھی کہہ
وہ اپنی زرہیں کھول دے
اور تیغ و خنجر، تیر و ترکش اک طرف رکھ دے
مَیں اِک ہارے ہوئے لشکر کی جانب سے
اُنا کی کرچیاں تھامے ترے خیمے میں آیا ہوں
مِرے دُشمن
غرورِ فتح سے چمکا ہوا ماتھا اُٹھا
میں اس بھرے دربار میں
اپنی شکستِ فاش کو تسلیم کرتا ہوں
○

اے میرے حافظے

یوگیندر بہل تشنہ

(یو۔ایس۔اے)

سوچتا ہوں کس طرح وضاحت کروں
بیاں کیسے ذہن کی کیفیت کروں!

زادِ راہ ، رختِ سفر مٹ گئے
اچانک ہی یہ الفاظ غائب ہوئے
سلامت ہے ابھی قوتِ گُفت وشنید
ذہن پر بھی نہیں کوئی صدمہ شدید
کیسے یہ مفقود مرے ذہن میں ہوئے
اے مرے حافظے، اے میرے حافظے

مانا ضعیفی تُم پر ہے نازل ہوئی
مگر چلا چلی میں تو ابھی دیر تھی
چولی دامن کا ہے ساتھ تیرا میرا
نہیں اچھا یوں دامن چھڑانا تیرا
بے رخی کیسی پھر یہ میرے حافظے
اے میرے حافظے، اے میرے حافظے

گاہے ہوتے ہو روپوش تم بن کہے
کہیں صحرا نوردی کو تو نہیں چلدیئے
کسی تعطیل پر ہو کہ ہو فرلو☆ پہ تم
کہ ژرفِ خندق میں ہو، وجود اپنا لئے
بتاؤ تفصیل سے تم میرے حافظے
اے میرے حافظے، اے میرے حافظے

آنن فانن غائب ہوئے تم دونوں ہی
جب نظم میں تمہاری ضرورت پڑی
نہیں مفلوج میرا ذہن بھی ابھی
ماؤف ہونے کا دورہ پڑا نہ کبھی
پھر یہ کیونکر ہوا، اور کیسے ہوا
یہ ہنگامہ بپا آخر کیوں کر ہوا
اے میرے حافظے، اے میرے حافظے

ذہنِ تشنہ سے تم کہاں اُڑ گئے
وقتِ ضرورت تم دغا کر گئے
لوٹ آؤ ، ذہنِ تشنہ پہ تُم دوستو
بنامِ شاعری خود کو حاضر کرو
ساتھ اپنے لے آنا راہ زنی کو بھی
تاکید کرنا اُسے چھوڑ دے رہزنی
فی الفور نظم میں ڈھالوں گا اُسے
راہ بر سے ملفوف کردوں گا اُسے

O

☆ FURLOUGH بغیر عرضی کی چھٹی

میراثِ درد

جاوید زیدی

(نیویارک)

کبھی مجازؔ
کبھی فیضؔ
اور کبھی ہیں فرازؔ
صلیب ودار ورسن کی فضا بدلتی نہیں
وہی ہے وحشتِ غم اور وہی ہے دشتِ جنوں
غریبِ شہر کی میراثِ درد بھی ہے وہی
قفس میں فیضؔ نے طرزِ فغاں جو کی ایجاد
فرازؔ کے یہاں طرزِ بیان ٹھہری ہے
وہ سوئزیاناؔ ہو
ساحرؔ کا لُدھیانہ ہو کوئی گلشن ہو کہ ویرانہ ہو
وہ بزمِ شعر وادب ہو کہ بزمِ رقص وسرور
وہ دارفورؔ کے منظر ہوں یا فلسطیںؔ کے
وہ بوزنیہ کا قصّہ ہو یا کہ ہو کشمیرؔ
عجب خطیب ہیں
یہ درد وغم کے منظر بھی
دلوں میں گویا ہیں تصویر کی طرح خاموش!

○

(۱۴رستمبر۲۰۰۵ء احمد فراز کے آخری دورۂ ہیوسٹن کے موقعہ پر کہی گئی)

گوشوارہ

ظریف احسن

(کراچی)

زندگی
اور بعد کے گوشواروں میں
سود وزیاں کے حساب سے
کوئی مُبرّا نہیں
اول تا آخر
از آدم تا ایندم
یہ ایک حقیقت ہے
اس کردار کو نبھانے کے لیے
پاکیزہ جذبوں سے، کڑیوں کو
کڑیوں سے جوڑا جاتا ہے
اچھے عمل کے پہاڑے یاد کیے جاتے ہیں
ذہن نشیں کیے جاتے ہیں
اپنی زباں اور اپنے جملے
زمانوں ومکانوں کے اپنے لہجے
لکھے، پڑھے اور بولے جاتے ہیں
ظریفؔ احسن کو زیست میں
انسانیت کی یہی بھلائی عزیز ہے
یہی روّیے عزیز ہیں
سو، اپنے گوشوارے میں
یہی حرف وہند سے
آخر تک جھلملاتے ہی رہیں گے

○

''رشتے خون کے''

شگفتہ نازلی
(لاہور)

کون کہتا ہے کہ رشتے خون کے۔۔۔
ہوتے ہیں انمٹ، اٹوٹ اور پائیدار۔۔۔
یہ تو کوئی قصۂ پارینہ ہے۔۔۔
اب تو لگتا ہے کہ خون پانی سے بھی پتلا ہوا۔۔۔
دُھول ہے بے اعتباری کی جدھر بھی دیکھئے۔۔۔
بے یقینی وائرس بن کے ہے پھیلی چارسُو۔۔۔
اور ناطے بے مہری سی دُھند میں لپٹے ہوئے۔۔۔
گویا اپنوں پہ گماں غیروں کا ہو۔۔۔
چہرے اوڑھے سرد مہری کی ردا۔۔۔
اور شناسائی کے ہیں، سب دائرے سمٹے ہوئے۔۔۔
رشتۂ اخلاص کچھ ٹوٹا ہے یوں۔۔۔
ہوں مروت کے دیئے سارے بجھے۔۔۔
اور دھواں بیگانگی کا دُور تک پھیلا ہوا۔۔۔
جو کوئی ہے خوں کے رشتوں کا ڈسا۔۔۔
ہے اگر جی دار، پانی مانگتا۔۔۔
کیوں کہ اب پانی ہے گاڑھا خون سے۔۔۔
رشتۂ خوں یوں نہ تھا بے آبرو۔۔۔
بے یقینی کا بھی یہ عالم نہ تھا۔۔۔
اور کبھی بے اعتباری کی فضا ایسی نہ تھی۔۔۔!

○

معتبر، نامعتبر ہونے کو ہے

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

کون کتنا در بہ در ہونے کو ہے
فیصلہ ، المختصر ہونے کو ہے

چل پڑی ہے اِک ہوائے انقلاب
دیکھیے ! بس رُخ کدھر ہونے کو ہے

سُن رہے ہیں وقت کی سرگوشیاں
معتبر ، نا معتبر ہونے کو ہے

کوئی تو تدبیر کر مسند نشیں!
کچھ نہ کچھ تو بے خبر ہونے کو ہے

چھٹ رہی ہیں رات کی تاریکیاں
کہہ رہے ہیں سب، سحر ہونے کو ہے

کیوں فضائیں ہو گئیں کیف آفریں
کس پری رُو کا گزر ہونے کو ہے

دے رہا ہے کوئی یہ اچھی خبر!
اب دعاؤں میں اثر ہونے کو ہے

○

بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ

علامہ اعجاز فرخ

(حیدرآباد، دکن)

کسی بھی شاعر کی قدر و قیمت کے تعین کے لیے یہ بات بہت اہم ہے کہ اس کی شاعری کا کتنا حصہ عالمی ادب کے سرمایہ میں اضافہ کا باعث ہے۔ اس کے پیش نظر اردو کے کئی شعراء صف اول میں شمار کیے جاسکتے ہیں، لیکن یہ نہیں طے کیا جاسکتا کہ ان میں بڑا شاعر کون ہے۔ اس ضمن میں صرف تخیل کی بلندی ہی واحد معیار نہیں، بلکہ خیال کا تعمق، اس کی گیرائی، خیال کو محسوس بنا دینے کی صلاحیت، موضوع کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ جذبہ کی جس آنچ میں شاعر تپ رہا ہے، اس کی تپش کو دوسرے تک پہنچانے کی قدرت، لفظ کو معنی کے نئے پیراہن عطا کرنے کی اہلیت، مانوس خیال کی تہہ میں جدت اور انوکھے خیال کو مانوس کردینے کی استطاعت سبھی کچھ شامل ہیں۔ شاعری نہ صرف صحیفہ اخلاق ہے نہ سیاست کی آماجگاہ، لیکن اگر شاعری انسانیت کے رازہائے سربستہ کو منکشف کرتی ہے اور زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے یا کائنات کے اسرار کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے قاری کو نہ صرف حرف آگہی عطا کرے، بلکہ اپنی وجدانی کیفیت کے زیراثر جہان نو کی سیر کروائے، تب اس سے اخلاق، اقدار اور سیاست کے سرچشمے فیض حاصل کرسکتے ہیں اور کرتے بھی رہے ہیں۔ مرثیے کے کسی شاعر کو محض اس لئے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی اساس مذہبی اقدار پر ہے۔ اسی طرح اگر کسی کی فکر اشتراکیت اساس ہے تو اس سے وہ بڑا شاعر یا ادیب نہیں بن جاتا۔ اگر چہ کہ ہر نظریہ حیات کی ادب میں گنجائش ہے، لیکن بقول غالب:

''ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہئے''

فیض بلاشبہ ہمارے عہد کے بڑے شاعر ہیں۔ کمیت کے اعتبار سے کم کم، بلاغت، اثر آفرینی، قبولیت، رسائی وابلاغ اور تہہ داریوں کے باوصف کون ذی شعور اور حساس دل ایسا ہوگا، جہاں فیض نہ بستے ہوں۔ ایک سادہ سے جملہ میں یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ فیض کو جانتے سب ہیں، لیکن فیض شناسی کا مدار و قرار نہ صرف اس کے فہم پر منحصر ہے بلکہ یہ بھی کہ قاری کے اپنے ماحول، اطراف واکناف، تجربات وکیفیات کے پس منظر میں فیض کا کونسا شعر کیا معنی پیدا کرتا ہے، کتنا اثر پذیر ہے اور قاری کے خیال میں اس کی بازگشت کی کیا صورت ہے۔

فیض کی شاعری میں تناسب حسن اور حسن تناسب نے کتنا زندگی کا حوصلہ بخشا ہے، یا کتنی آزادیاں مہیا کی ہیں، کن تحریکوں کا آغاز کیا اور کن تحریکوں میں نئی روح پھونکی، ان تمام پر نقادانِ سخن نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ لیکن بلا جھجک یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فیض کی شاعری میں اسالیب کی جدت اور ادبی اجتہاد کی صورت گری موجود ہے۔ ان اسالیب نے فیض کے مداحوں، نقادوں اور سخن فہموں کو متوجہ کیا جس کے نتیجے میں جو مقالے اور بیش قیمت مضامین جمع ہوئے، وہ فن سے فنکار اور فنکار سے فن تک رسائی کا خوبصورت وسیلہ ثابت ہوئے۔

برصغیر میں یہ کیفیت اکثر دکھائی دے جاتی ہے کہ ذوق اور پیشے میں ہم آہنگی کم کم پائی جاتی ہے۔ کچھ یہی حال ڈاکٹر تقی عابدی کا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ جسمانی امراض کے طبیب ہیں، لیکن ادب ان کی زندگی ہے، ادب ان کی صحت مندی کا راز بھی ہے اور صحت مند ادب سے انہیں بے پناہ محبت بھی ہے۔ ان کے وسیع مطالعہ کا حاصل یہ ہوا کہ وہ تحقیق کی طرف مائل ہوئے۔ کہتے ہیں کہ چاہ خود راہ پیدا کردیتی ہے۔ ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ قدیم کتب کی خریداری میں ضرور صرف ہوا، لیکن ان کی شبانہ روز محنتوں کا حاصل یہ نکلا کہ جو کام صدیوں میں نہ ہو سکا وہ چند برسوں کی قیمتی ساعتوں نے مکمل کرلیا۔ چنانچہ تیس برس کے مختصر عرصہ میں پینتیس کتابیں، ۷۲ شہید، جوش مودت، گلشن رویا، اقبال کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشا، رموز شاعری، اظہار حق، مجتہد نظم مرزا دبیر، طالع مہر، سلکِ سلامِ دبیر، تجزیہ یادگار انیس، ابواب المصائب، ذکر دربارن، عروسِ سخن، مصحف فارسی دبیر، مثنویات دبیر، کائنات نجم، روپ کنور کماری، دربارِ رسالت، فکر مطمئنہ، خوشۂ انجم، دردریائے نجف، تاثیر ماتم، نجمی مایا، روشن انقلاب، مصحف تغزل، ھوالنجم، تعشق لکھنوی، ادبی معجزہ، غالب دیوان، نعت ومنقبت، چوں مرگ آید، رعبایات دبیر، سبد سخن، کلیات غالب فارسی (دوجلد)، کلیات غالب فارسی (ایران ایڈیشن) فیض فہمی، اس کے علاوہ چار اور کتابیں زیر تالیف ہیں، جس میں تجزیہ شکوہ جواب شکوہ، فانی لافانی، تجزیہ رباعیات فراق، دوشہکار نظمیں اور اقبال کے چار مصرعے شامل ہیں۔ خود ان کے خیال میں یہ ''رو میں رخش عمر'' ہے منزل تو ابھی بہت دُور ہے''۔

فیض پر بہت لکھا گیا، بہت کچھ لکھا گیا۔ وہ تمام بھی جو فیض کا حق تھا، وہ بھی جو کم قامتوں نے فیض پر لکھ کر خود کو بلند قامت کرنے کی کوشش ناکام کی۔ کچھ یوں بھی ہوا کہ مختلف مقالوں سے کتر بیونت کر کے نئے عنوانات تراشے گئے، لیکن فیض کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک ایسی مستند دستاویز کی تیاری جو شائقین ادب، مداحان فیض کے ساتھ ساتھ محققین کے لیے بھی سودمند ثابت ہو، ایک سنگ گراں بار سے کم نہ تھی۔ کم حوصلہ تو شاید ''بوجھ کس ناتواں سے اٹھتا ہے'' کے مصداق اس بھاری پتھر کو چوم کر ہٹ گئے۔ اردو دنیا کے وہ نامور اہل قلم جن پر اردو کو بجا طور پر ناز ہے، انھوں نے فیض کو دریافت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ چنانچہ ڈاکٹر تقی عابدی نے فیض پر ایک صد بیس صاحبان علم وفن کے وہ مقالے جمع کئے، جو نہ صرف مستند کتابیاتی حوالوں کے ساتھ تھے، بلکہ فیض فہمی کے باب میں ایک عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

جب سب کچھ جمع کیا جا چکا اور ترتیب کا مرحلہ درپیش ہوا تو ڈاکٹر تقی عابدی کی باریک بینی نے کائنات فیض میں ان بیالیس جزیروں کو دریافت کیا جن پر ابھی کسی کی نظر ہی نہیں گئی تھی۔ اس تلاش نے ڈاکٹر تقی عابدی کو ایک نئی جولانی کے ساتھ آمادہ سفر کیا۔ غیر مانوس جزیرے، اجنبی زمینیں، تلاش مسلسل، ایسے میں آبلہ پائی تو مقدر ہو ہی جاتی ہے، لیکن ہزار ہزار آبلہ پائی کے باوجود ڈاکٹر تقی عابدی نے یہ مہم سر کی اور تنہا سر کی۔ ان جزیروں سے جو دفینے برآمد ہوئے، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

فیضؔ کا زندگی نامہ، جس میں فیضؔ کی تاریخ پیدائش ۱۳؍فروری ۱۹۱۱ء سے ان کی زندگی کے اہم کوائف موجود ہیں۔ فیضؔ مشاہیر کی نظر میں بیاسی پھولوں کے گلدستہ کی صورت میں موجود ہے۔ ان بیالیس موضوعات پر ڈاکٹر تقی عابدی نے جس غیر جانبدارانہ انداز میں خامہ فرسائی کی ہے، اس سے ''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں'' پوری طرح صادق آتا ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کا لہجہ کبھی تند نہیں پایا گیا۔ وہ اکثر و بیشتر شیریں سخن اور شیریں کلام ہیں، لیکن اگر کہیں کوئی بات انہیں حقیقت کے خلاف نظر آجائے تو اسے دلائل کے ساتھ رد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

ڈاکٹر تقی عابدی کے مضامین میں وہ اہم انٹرویو بھی شامل ہے جس میں اٹھائیس اشخاص نے فیض سے چار سو پچاس سوالات کیے۔ اس انٹرویو کے نتیجے میں فیضؔ کی پوری زندگی، شخصیت اور فن یوں شفاف اور واضح دکھائی دیتے ہیں کہ انہیں نہ صرف نقوشِ فیض کہا جاسکتا ہے، بلکہ اس کے ہر نقش پر سیر حاصل مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر تقی عابدی موضوعات کے انتخاب میں بھی ایک نازک فنکار ہیں، انہیں اندازہ تو یقیناً رہتا ہے کہ کونسا موضوع ان سے کتنے حساب جاں کا طلبگار ہے۔ لیکن چوں کہ اچھوتا پن ان کی طبیعت کا خاصہ ہے، اس لیے ان کا دل طوفاں شکن نہ صرف اسے قبول کرتا ہے، بلکہ اپنی پوری سعی اور خلوص کے ساتھ اسے تکمیل کے مرحلے تک پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھنا چاہتا۔ فیضؔ کی دولت تنہائی، فیضؔ مصور نقوش خد و خال حسن، فیضؔ اور اختر شیرانی کی مشترکہ قدریں، فیضؔ اور بادہ وساغر یا دِیارِ مہربان، فیضؔ اور مصطفےٰ زیدی (رشتہ جو موتیوں سے ڈھکا رہا)، فیضؔ بنام افتخار عارف (مفید، مختصر اور مستند دستاویز)، فیضؔ کا مرثیہ امام، اے بسا آرزو کہ خاک شدہ اور جو میرا تمہارا رشتہ ہے، یہ وہ نازک موضوعات ہیں، جن پر ایک ذراسی لغزش قلم ساری محنتوں پر پانی پھیر سکتی ہے، لیکن ڈاکٹر تقی عابدی نے ان منزلوں کو سر کرنے میں اپنی پور متاع قلم صرف کی ہے۔

جناب زاہد علی خاں مدیر سیاست کی نظر انتخاب نے ڈاکٹر تقی عابدی کی اس تحقیق اور جانفشانی کو ادب دوستوں تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر صاحبانِ نظر اور اہلِ ذوق یہ محسوس کریں گے:

بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ

''منظر شہر کے''

(فوٹو جرنلزم کے معماد چاچا ایف ای چودھری کی یاد میں)

یونس صابر

(پشاور)

فون پر لاہور سے آئی خبر
نامور عکّاس ایف ای چودھری
مارچ پندرہ تھا جب اُن کا برتھ ڈے
چودھری صاحب اُسی دن چل بسے

روم، لندن اور استنبول سا
ہو چلا ہے نقشہ اب لاہور کا
تھا جہاں آباد گھر کا پاسباں
وہ پرانا شہر لیکن اب کہاں
قابلِ تحسین ہیں جو آپ نے
کر لئے محفوظ منظر شہر کے
تنگ کوچے گلیاں اور بازار بھی
پارک منٹو، باغ شالیمار بھی

مال ہو، بیڈن یا وارث روڈ ہو
جانا ہو بھاٹی یا لوہاری تلک
میں کہ ہوں اردو کا پیدل آدمی
اسلئے کچھ فرق تو پڑتا نہیں
اک پشوری نے کنولؔ فیروز کے
سنگ انجوائے کیا، بھولا نہیں
ماڈرن شیزان میں برگر اُڑائے
گول گپّے دونوں نے جی بھر کے کھائے
حلوہ پُوڑی اور نہاری یاد ہے
دہلی دروازے سے واپس اپنے گھر
لائی جو تانگہ سواری یاد ہے

''حضورِ یار میں''

انور سدید

(لاہور)

ڈاکٹر تاثیر جن کا اصل نام محمد دین تھا اردو کے ممتاز نقاد، شاعر اور ماہرِ تعلیم تھے۔ ۲۸ر فروری ۱۹۰۲ء کو متحدہ پنجاب کے شہر انبالہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد اگرچہ معمولی زمیندار تھے لیکن علم و ادب کے دلدادہ تھے، میاں عطاء الدین کو معاشرتی بہبود کے کاموں میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے اس علاقے میں قدر کی نگہہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں طاعون کی وبا پھیلی تو میاں صاحب اور ان کے خاندان کے کئی افراد لقمۂ اجل بن گئے اور محمد دین کم سنی میں ہی یتیم ہو گئے۔ ان کے خالو میاں نظام الدین اس یتیم کو پرورش و پرداخت کے لیے لاہور لے آئے۔ اور ان کی تربیت بارود خانے میں اپنی حویلی میں کی جہاں علامہ اقبال بھی اکثر آیا کرتے تھے۔ محمد دین نے ابتدا سے لے کر یونیورسٹی تک تعلیم کے تمام مراحل لاہور میں طے کئے۔ انگریزی میں ایم۔ اے، ایف۔ سی کالج سے کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ ان کے ذوق کی تربیت بارود خانے کے ادبی ماحول میں ہوئی اور وہ ادبی دنیا میں ایم۔ ڈی تاثیر کے نام سے معروف ہو گئے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد کی حیثیت میں ان کا تقرر ہو گیا تھا لیکن علامہ اقبال ان کی علمی استعداد اور فکری نکتہ وری سے شناسا تھے چنانچہ ان کے مشورے پر وہ برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی میں چلے گئے جہاں انہوں نے ''مشرق۔۔ انگریزی ادب کے آئینے میں'' کے عنوان پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اس دور کا کیمبرج دنیا کے مختلف سیاسی نظریات کا مرکز بنا ہوا تھا۔ تاثیر کو ہندوستان کی تحریک آزادی سے دلچسپی تھی۔ تاہم انہوں نے نازی ازم اور مارکسزم کا مطالعہ بھی کیا۔ یہیں ان کی ملاقات سجاد ظہیر سے ہوئی جو لندن میں موجود ہندوستانی طلبہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر رہے تھے اور ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا حلقہ بھی قائم کر لیا تھا۔ اس انجمن کو ہندوستان میں فروغ دینے کے لیے جو آئین بنایا گیا اس کو آخری شکل دینے والوں میں ڈاکٹر تاثیر بھی شامل تھے۔ سجاد ظہیر کے دیگر معاونین میں ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر ملک راج آنند اور سین گپتا کے نام اہم ہیں۔ سجاد ظہیر نے اپنی تالیف ''روشنائی'' میں لکھا ہے:

''تاثیر سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور اس کا ہم دونوں کو افسوس ہوا کہ اس سے پہلے ہمیں ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ حالانکہ وہ شاید ایک سال سے انگلستان میں تھے۔ تاثیر کی ذہانت اور بذلہ سنجی کا انسان پر فوراً اثر پڑتا تھا۔۔۔ مجھے کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا کہ مارکسزم سے تاثیر کی رغبت ذہنی اور تفریحی زیادہ ہے اور علمی کم۔ کبھی کبھی بحث کے دوران وہ ایسی باتیں بھی کر دیتے تھے جس سے موقعہ پرستی کی بو آتی تھی۔ اس وقت یہ باتیں مذاق میں ٹل جاتی تھیں۔ ان کا کیریکٹر اس وقت بھی کچھ ایسا تھا کہ ان سے پرخلوص اور گہری دوستی کرنی مشکل معلوم ہوتی تھی لیکن ان سے ملنے، ان سے گفتگو کرنے اور ان کی باتیں سننے سے کبھی جی نہیں تھکتا تھا''

(روشنائی۔ ص ۴۳۔ کراچی ۱۹۸۶ء)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سجاد ظہیر ترقی پسند مصنفین کے اساسی دور میں تاثیر سے متاثر تھے لیکن انہیں مارکسزم کی پختہ لپیٹ میں نہ لے سکے اور تاثیر ۱۹۳۶ء میں ہندوستان واپس آ کر ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر کے پرنسپل مقرر ہوئے اور سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے کے لیے پنجاب آئے تو بھی انہوں نے محمود الظفر اور فیض احمد فیض کو تو اپنا ہمنوا بنا لیا لیکن ڈاکٹر تاثیر نے اپنی انفرادیت اپنے مزاج کے مطابق قائم رکھی۔ ۱۹۴۰ء میں انہیں سری پرتاپ کالج سری نگر (کشمیر) کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اس دوران انہوں نے علامہ اقبال کے مشورے سے ایک جرمن خاتون کرسٹل سے جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، شادی کر لی۔ نکاح کی رسم ڈاکٹر اقبال نے ادا کی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ڈاکٹر تاثیر نے مختلف حکومتی عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ اس دور میں ان کا ادبی ذوق مسلسل مائل بہ ارتقاء رہا اور اس کے نقوش رسائل اور اخبارات میں ثبت ہوتے رہے۔

ایم۔ ڈی تاثیر کی باقاعدہ ادبی نمود رسالہ ''نیرنگِ خیال'' سے ہوئی تھی جو حکیم یوسف حسن نے لاہور سے ۱۹۲۲ء میں جاری کیا تھا۔ عملی طور پر اس کے مدیر تاثیر صاحب ہی تھے۔ انہوں نے اس پرچے کی ادبی مزاج سازی کی۔ چنانچہ اس کا شمار ''ادبی دنیا''، ''نگار''، ''ہمایوں''، ''ساقی''، ''مخزن'' اور ہزار داستان جیسے ممتاز رسائل میں ہونے لگا۔ سیاسی زاویے سے ڈاکٹر تاثیر تحریکِ پاکستان کے حامی اور معاون تھے۔ انہوں نے ''پاکستان مبارک'' کے نام سے مضامین کا ایک سلسلہ انگریزی اخبار ''پاکستان ٹائمز'' میں لکھا انہوں نے انگریزی میں اظہارِ خیال کے لیے اپنا قلمی نام ''ڈاکٹر حجازی'' اختیار کیا اور اردو مضامین کے لیے ''قدوسی نظامی ایم۔ اے'' کا نام استعمال کیا۔ آزادی کے بعد ڈاکٹر صاحب کو وزارتِ امورِ کشمیر میں ڈائریکٹر آف پبلسٹی کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ انہوں نے اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے انجام دیئے کہ ہندوستان کے وزیر داخلہ ولبھ بھائی پٹیل ان کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے تیکھے انداز نے پبلسٹی کے جو روپ نکھارے ان سے پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کو دنیا کے نقشے پر ابھارنے میں اہم کردار ادا کیا اور پٹیل نے حسرت سے کہا کہ ''ہمیں پبلسٹی کے لیے ڈاکٹر تاثیر جیسے ذہین آدمی کی ضرورت ہے''۔ ڈاکٹر صاحب کو ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل کا عہدہ پیش کیا گیا تو انہوں نے اسے قبول

کرنے میں تاخیر نہ کی اور سابقہ سرکاری ملازمت ترک کر دی۔ تاہم انہوں نے اپنے قلم سے پاکستان کے مخالفین کا منہ بند کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ڈاکٹر حجازی اور قدوسی نظامی کی قلمی توپوں کے دہانے کھلے رہے۔ ۱۹۴۹ء میں ایک قلمی معرکہ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت کے مابین اخبار ''مغربی پاکستان'' اور ''امروز'' کے صفحات پر لڑا گیا جس کی صدائے بازگشت دیر تک سنی جاتی رہی اور اب تاریخ کا حصہ بن گئی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر نے بائیں بازو کے ان ادیبوں کو ہدف بنا رکھا تھا جو نظریاتی مملکت پاکستان کو قبول کرنے کی بجائے سرخ سویرے کے انتظار میں تھے اور میاں افتخار الدین کے ترقی پسند اخبار ''امروز'' میں ملازمت کرتے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر نے رازیؔ کا نقاب اوڑھ کر انہیں للکارا:

عجیب بات وہ جنّا کا یار کہتا ہے
کہ شعر وہ ہے جو فتّو لوہار کہتا ہے
کریں گے وہ جو نہ کوئی شریف کرتا ہو
کہیں گے وہ جو میاں افتخار کہتا ہے
فضول آپ کی تردید ہے کہ یہ باتیں
ہر ایک سرخا سرِ راہ گزار کہتا ہے

چراغ حسن حسرت اور ان کے معاونین نے بھی جواب میں فی البدیہہ نظمیں کہیں لیکن جب حسرت صاحب کے کیمپ سے ''اشارہ کافی ہے'' کے عنوان سے نظم چھپی تو اس میں ڈاکٹر تاثیر کی صاحبزادی کا نام بھی اس شعر میں استعمال کیا گیا تھا۔

ہم انتظارِ سحر میں ہیں لیکن ان کے لیے
شبِ سیاہ میں سلما ستارہ کافی ہے

اب بات حد سے نکل رہی تھی۔ چنانچہ تاثیر صاحب نے خاموشی اختیار کر لی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولانا عبدالمجید سالک نے معرکہ آرائی بند کرا دی تھی۔ متذکرہ متنازعہ نظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے لکھی تھی جو ان دنوں میاں افتخار الدین کی ملازمت میں ''امروز'' کے کارکن تھے۔

ڈاکٹر تاثیر کو نظم اور نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے موسیقی، مصوّری اور دیگر فنونِ لطیفہ پر معلومات افزا مضامین لکھے۔ ان کا ایک اہم موضوع اقبالیات تھا۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''آتش کدہ'' کے نام سے اور مضامین کی کتاب ''نثرِ تاثیر'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ ڈاکٹر ریاض قدیر نے ڈاکٹر تاثیر کے فکر و فن پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار حسبِ ذیل ہیں:

حضورِ یار میں آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں
مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملاتِ من و تو، نکل ہی آتے ہیں
متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

اور اب ڈاکٹر تاثیر کا نعتیہ رنگ دیکھیے:

یہی تھا مدعا تکمیلِ دیں، ختم رسالت کا
کہ اب آغاز ہے نشو و نمائے آدمیت کا
شبِ معراج پردہ اٹھ گیا روئے حقیقت کا
رہا باقی نہ کوئی تفرقہ غیب و شہادت کا
تجھے دار و رسن، رنج و محن، کچھ بھی نہیں حاصل
تو پھر تاثیر کس برتے پہ دعوئ ہے محبت کا

ڈاکٹر تاثیر اپنی وضع کے منفرد دانشور تھے۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۵۰ء کو اچانک فوت ہو گئے تو ادبی دنیا پر سناٹا طاری ہو گیا۔

''سونے کی سِل''

نہ جاں دے دو نہ دل دے دو بس اپنی ایک مِل دے دو
زیاں جو کر چکے ہو قوم کا، تم اس کا بل دے دو

بھلا ہو جائے گا طوفاں زدوں کا اس عنایت سے
جہاں سے پانی آتا ہے وہاں سونے کی سِل دے دو

تمہاری ناخدائی سے یہ کشتی ڈوب جائے گی
خدارا چھوڑ دو پیچھا کنارہ مستقل دے دو

بہت تذلیل تو کر لی ہماری زندگی کی
اجازت موت کی اب ہم کو بن کے رحمدل دے دو

خلوصِ دل سے اے لوگو سنو پیغام جالبؔ کا
مرے برباد بنجر کھیتوں کو آب و گِل دے دو

○

ڈھونڈوگےہمیں ملکوں ملکوں

نیلو فر عباسی

اللہ کا احسان، تمہارا شکریہ۔

ہماری رفاقت کے ۳۹ سال مکمل ہوئی اس طرح سے تم نے مجھے خوشیاں، راحت اور سکون کی وہ گھڑیاں دیں جن کی وجہ سے میں اپنی زندگی میں چند لفظ جملے لکھ سکا۔اللہ تعالیٰ کے کرم کے بعد تم نے مجھے اچھے دن اور خوشیوں کی گھڑیاں دیں۔میں ہر سال دعا کرتا ہوں اے رب جلیل میری بیوی نیلوفر کوصحت و قد خوش حال توانازندگی عطا کراور مین اس کے ساتھ ہوں اس لیے مجھے بھی نیلوفر تم میرے ہر قدم کی ساتھی تھیں ہو اور رہو گی۔میری خواہش ہے ہر لمحہ تمہارے ساتھ گزاروں۔دعائیں اتنی جتنے آسمان میں ستارے باغوں میں درختوں کے پتے گلشن میں گلاب کی پتیاں۔

قمر علی عباسی

یکم جنوری ۲۰۱۳ء

نیلوفرعباسی (نیویارک)

امروہہ کے محلّہ نیازیاں کے ایک گھر میں یعقوب علی عباسی اور کنیز فاطمہ رہتے تھے۔اس گھر پر افسردگی کے بادل چھائے رہتے کیونکہ ان کے یہاں تین بیٹے پیدا ہوئے اور جیسے ہی وہ گھٹنوں چلنے کے قابل ہوتے کمزور ہونے لگتے بیمار ہوجاتے اور اُسی جہاں لوٹ جاتے جہاں سے آئے تھے۔

۱۳/جون ۱۹۳۸ء کو اس گھرانے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی کیونکہ اداسیوں کے بادل کو چیر کر ایک چاند چہرہ ان کے گھر اُتر آیا۔گول مٹول گلابی رنگت روشن روشن اس لیےاس کا نام نانا نے ''قمر'' رکھا۔

تندرست توانا قمر نے جب ہی گھٹنوں چلنا شروع کیا بیمار ہوگیا ماں باپ کا دل وسوسوں اور خوف سے لرز گیا۔کہیں یہ چاند گہنا نہ جائے۔جس کسی نے جو دوا علاج بتایا جس درگاہ کا ذکر کیا وہاں وہاں یہ اپنے دل کے ٹکڑے کو لے کر جا پہنچے۔

یعقوب علی عباسی کی سوچ تھی کہ جو مانگنا ہے اللہ تعالیٰ سے مانگو اس طرح مزاروں درگاہوں پر جانے کے وہ قائل نہیں تھے لیکن اپنی دکھی بیوی کی خواہش کا احترام کرنا بھی ضروری سمجھتے تھے۔کسی نے رُڑکی کے قریب کلیئر شریف کے جلالی بزرگ صابر صاحب کی درگاہ کا بتایا۔کہا وہاں مانگی منتیں ضرور پوری ہوتی ہیں۔صابر صاحب کے مزار پر قمر کو لٹا کر ماں نے گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ اپنے پیارے حبیب اور تقویٰ گذار بندوں کے صدقے اُن بزرگوں کے صدقے کہ جنہیں تو نے پسند کیا اور بلند درجات پر فائز کیا میرے بیٹے کو زندگی دے اس کو دین اور دنیا دے اس کی عمر میں برکت دے۔کامیابی دے لوگ اور یہ لوگوں سے محبت کرے، ماں کی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول کی اور قمر کی صحت بتدریج بہتر ہونے لگی اور پھر وہ ایک تندرست توانا بھاگتے دوڑتے ہوشیار بچے میں تبدیل ہوگیا۔

اسکول پہنچا تو پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیلوں اور شرارتوں میں آگے آگے، اسکول کے سب سے شرارتی بچے کا ایوارڈ ملا، روزنامہ جنگ کے بچوں کے صفحے میں مضامین لکھنے شروع کیے تو کئی تحریروں پر انعامات حاصل کیے۔ کالج یونیورسٹی پہنچا تو ہر تقریری مقابلے کی ٹرافی اس کی منتظر ہوتی۔لوگ اُس کی تحریروں تقریروں کے دیوانے تھے۔سندھ یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم۔اے کرلیا تو صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے کہا ''میاں تم چلے گئے تو ہماری یونیورسٹی کے لیے ٹرافیاں کون جیتے گا؟''

اردو ادب سے لگاؤ تو تھا ہی ڈاکٹر صاحب کا اشارہ پاتے ہی اردو ڈیپارٹمنٹ میں ماسٹرز کے لیے داخلہ لے لیا اور پھر ڈھیروں انعامات ٹرافیاں اور ایک اور ماسٹرز کی ڈگری حاصل کر کے قمر جواب قمر علی عباسی تھے عملی دنیا میں داخل ہوگئے۔

قمر علی عباسی نیشنل کالج کراچی میں اکنامکس کے لیکچرر ہوگئے اُن کا وصفِ خطابت یہاں بہت کام آیا۔انہوں نے شاگردوں کے دل جیت لیے۔ عباسی کو دل جیتنے میں مہارت حاصل تھی۔جس سے ایک بار ملاقات ہوتی وہ انہی کا ہوجاتا۔ایک ایسی ہی ملاقات CSO (دفتر اعداد وشمار) کے ڈائریکٹر جنرل سے ہوئی اور اُنہوں نے عباسی کی علمیت اور صلاحیتوں کے پیش نظر اُنہیں ایک اعلیٰ عہدے کی پیش کش کی، عباسی اب سی ایس او کے افسر تھے مگر ایک کمرے میں بیٹھ کر ''تین پانچ'' کرنا اُس کی سرشت میں نہیں تھا۔وہ تو کھلی فضا، نیلے آسمان پر اُڑتے بادلوں، سبز گھاس کے میدانوں، رنگ برنگے پھولوں، پرندوں اور ننھے منھے بچوں کے شیدائی تھے، لوگوں میں گھرے رہنا اُنہیں اچھا لگتا۔اس لیے پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے ریڈیو پاکستان کو چُن لیا۔وہاں دانشور، شاعر، ادیب اور فنکار تھے مستقبل کے پروگرام ترتیب دیتے ولولوں سے لبریز پروڈیوسرز دمکتے چہروں والے آرٹسٹ جو ہر وقت نِت نئی جہتوں کی تلاش میں رہتے اور یہی عباسی کو پسند تھا ہر دم چاق وچوبند رہنا اور ہر کام کو پوری لگن اور جوش

سے سرانجام دینا۔

قمر علی عباسی ایک بچے کی طرح تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانا، مطمئن رہنا کسی سے دشمنی عداوت نہ رکھنا، سب سے بڑی بات منافق نہیں تھے۔ اس لیے اُنہوں نے سب سے پہلے بچوں کے لیے قلم اٹھایا اُن کے لیے نہ صرف ''کائیں کائیں میاؤں میاؤں'' لکھی بلکہ ایسی کتابیں بھی تحریر اور شائع کیں جن سے بچے پاکستان کے لیے اپنے بزرگوں کی جدوجہد اور قربانیوں سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ بچوں کے لیے عباسی نے کوئی پچیس کتابیں اور ناول لکھے جن پر اُنہیں پانچ بار رائٹر گلڈ ایوارڈ ملا۔ اُن کے شہرہ آفاق ناول ''بہادر علی'' کو یونیسکو نے دنیا بھر کی زبانوں میں شائع کیا اور اُس پر اُنہیں متعدد ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پی ٹی وی نے ڈرامائی تشکیل پیش کی۔

جیت، کامیابی، ایوارڈز ماں باپ کی دعاؤں اور اللہ کے کرم سے قمر علی عباسی کا مقدر رہے۔ وہ ہمیشہ وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے نظر آئے۔

عباسی ۱۹۸۱ء میں بچوں کے ادیب کی حیثیت سے پسندیدگی کے مدارج طے کر چکے تھے تو براڈ کاسٹنگ کا ایک کورس کرنے بی بی سی لندن جانا ہوا۔ وہاں اُنہوں نے تین مہینے تک نہ صرف اپنے اعزاز میں ہونے والی تقریبات کو اپنی باتوں، تقریروں اور تحریروں سے گرمایا بلکہ وہاں کے شب و روز اور زندگی کا بغور مطالعہ بھی کیا اور جب پاکستان واپسی ہوئی تو لندن میں گزارے وقت کو ''لندن لندن'' کی شکل دے دی اور اس طرح اُن کا یہ پہلا سفرنامہ منظر عام پر آیا۔ اس سفرنامے نے مقبولیت کے وہ ریکارڈ قائم کیے کہ فوراً اگلے سفرنامے کی فرمائش ہونے لگی۔ پبلشر بزنس مین بھی ہوتا ہے۔ وہ گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ عباسی کے سفرنامے ہاٹ کیک ثابت ہوئے ایک کے بعد دوسرا، تیسرا اور پھر انہوں نے مڑ کر نہیں دیکھا دفتری ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھانے کے ساتھ اپنے تخلیقی ہنر کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس میں تیزی کا رجحان آتا گیا۔ مروجہ قسم کے سفرناموں کی بھیڑ میں ایک نئے لب و لہجے کے ساتھ تحریر کی دلچسپی اور لطیف مزاح کی چاشنی پڑھنے والوں کو میسر آئی۔

''لندن لندن'' میں لکھتے ہیں ''لندن جانے سے نو سال پہلے شادی کی اور ایک سال پہلے حج کی سعادت حاصل کی۔ جب لندن پہنچے تو بے تکلف دوستوں نے پوچھا۔۔۔ اب کیا کرنے آئے ہو؟''

قمر علی عباسی کا پہلا سفرنامہ ''لندن لندن'' اسّی کی دہائی کے وسط میں منظر عام پر آیا اور جب سے اب تک اُن کے تیس سفرنامے چھپے اور بے حد مقبول ہوئے۔ قبولیت اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے کوئی قبول اور شہرت حاصل کرنے کے لیے ارادتاً شعوری طور پر بنا سنوار کر کئی کئی بار تحریر میں قطع و برید کر کے فائنل کرتا ہے۔ کوئی قلم اُٹھاتا ہے اور کاغذ پر لفظوں کے موتی چنتا چلا جاتا ہے۔ اُس کی تحریر کی چاشنی، روانی، خوبصورتی قدرت کا عطا کردہ تحفہ ہوتی ہے اور قمر علی عباسی کو اللہ تعالیٰ نے یہ خوبیاں، تحفے دل کھول کر عطا کیے تھے۔ ہنسی ہنسی میں ایسی گہری بات کہہ جاتا کہ عقل حیران ہو جائے۔ قلم اٹھاتے اور جب قلم رکھتے تو کاغذ اُن کی خوبصورت دلچسپ معلوماتی تحریر سے سج جاتے۔

متعدد ایوارڈز کے علاوہ قمر علی عباسی کو نواز شریف جب پہلی بار وزیر اعظم بنے تو APNS ایوارڈ ملا یقیناً بغیر کسی سفارش یا بیکنگ کے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ بہترین کالم نگار ٹھہرائے گئے۔ اُس وقت وہ اخبار جنگ میں ''دل دریا'' کے عنوان سے کالم لکھتے۔ سفرناموں کے ساتھ قمر علی عباسی کا رجحان کالم نگاری کی طرف بھی ہو گیا اور وہ کرنٹ افیئرز سے لے کر سوشل مسائل تک قلم اٹھانے لگے۔ اُن کی تقریر اور تحریر دونوں میں جادو تھا۔ اُن کے چاہنے والے جس طرح کی ای۔میلز کرتے اُس سے اُن کی پسندیدگی کا اندازہ ہوتا۔ اُن کے چاہنے والوں میں یوتھ کی بڑی تعداد ہے۔ ۲۰۰۲ء میں صدارتی ایوارڈ ادبی خدمات پر حاصل کیا۔

قمر علی عباسی ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ اور ذمہ دار ترین عہدے کنٹرولر، اسٹیشن ڈائریکٹر کراچی پر فائز ہوئے تو نہ صرف پروگراموں کو بلکہ بلڈنگ کو بھی چار چاند لگا دیئے۔ تاریخ میں پہلی بار کے ایم سی سے اسنارکل منگوا کر پوری بلڈنگ دھوئی گئی۔ پان کھا کر دیواروں پر تھوکنے پر سخت پابندی لگائی۔ اسٹاف کو صبح وقت پر آنے پر پابند کیا۔ اس کے علاوہ پروگرام اسپانسرز کروا کر ریڈیو پاکستان کو منفعت بخش پیکجز فراہم کیے۔ ذاتی حیثیت میں عباسی کو بہت سی ''آفرز'' ہوئیں۔ ذاتی کمرشل پروگرام پروڈیوس کرنے کی۔ ریڈیو پاکستان کراچی کے ٹرانسپورٹ کے زیر انتظام پندرہ بیس گاڑیاں تھیں۔ پٹرول کے حساب میں ہیر پھیر، دسیوں اسپتال اور میڈیکل اسٹورز اُن کے انڈر تھے۔ مہینے بھر کی ''اوپر کی آمدنی'' ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں پہنچ سکتی تھی مگر وہ قمر علی عباسی کیا جو ان دنیاوی حرص و طمع کے جال میں پھنسے۔ اُن کا ایمان تھا اللہ تعالیٰ سیدھے راستے سے مجھے اتنا نواز رہا ہے مجھے کیا ضرورت ہے ان سب تین پانچ کی۔ انہوں نے جو چھوٹے یا بڑے اصول زندگی کے بنائے اُن پر کاربند رہے۔ کبھی پان، چھالیہ، سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگایا شراب تو بہت دور کی بات ہے۔ ایک بار میں نے پوچھا آپ کے حلقے کے بیشتر لوگ ڈرنک کرتے ہیں آپ کا کبھی دل چاہا؟ بولے کبھی نہیں، چاہتا تو مجھے کون روک سکتا تھا مگر میں ایسی چیز کیوں استعمال کروں جو جائے تو پیٹ میں اور چڑھ جائے دماغ پر''

ریڈیو پاکستان میں نہایت سخت ایڈمنسٹریشن کے باوجود عباسی نے کچھ ایسے اُصول اپنائے تھے کہ جو قابل تحسین تھے۔ کسی بھی کارکن پروڈیوسر کا انتقال ہو جائے تو وہ سب سے پہلے اُس کے گھر دس ہزار روپے کیش پہنچواتے تھے۔ نہ جانے گھر میں کیا حالات ہوں؟ کسی ایمپلائی کی بیوہ پنشن یا میڈیکل بل کے سلسلے میں آئیں تو اُنہیں اکاؤنٹس سیکشن میں انتظار کرنے کے بجائے نہایت احترام سے اپنے پی۔اے کے کمرے میں بٹھاتے اور وہیں مطلوبہ کاغذات اور چیک منگوا کر دیتے۔ کسی کے میڈیکل کے بلز کبھی نہیں روکتے۔

ریڈیو پاکستان کراچی مثالی اسٹیشن قرار دیا گیا۔

قمر علی عباسی کو زندگی میں ہمیشہ کامیابی، وقار اور شان عطا ہوئی۔ جو اُن کے رب کا تحفہ اُن کے لیے اس کی وجہ اُن کا یقین تھا۔ علامہ اقبال کے اس شعر کو انہوں نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا:

وہ ایک سجدہ جسے تو سمجھتا ہے گراں
دیتا ہے ہزار سجدوں سے رہائی

۱۹۹۹ء میں جب قمر علی عباسی ریڈیو پاکستان کی مدتِ ملازمت پوری کر کے جنگ انفولائن کے ایڈیٹر تھے تو کچھ ایسے حالات ہوئے کہ مستقل طور پر نقل مکانی کر کے امریکہ آ گئے۔

نیویارک امریکہ میں قدر دانوں اور اہلِ علم و دانش نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا، سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اتنی محبتیں دیں کہ سمیٹنی مشکل تھیں۔ ہر تقریب کی صدارت پر ان کو متمکن کیا گیا یہاں تک کہ اہل نیویارک قمر علی عباسی کو صدر علی عباسی کہنے لگے مگر اُن کا وہی انداز اپنے علم اپنی تحریر، تقریر کے خزانے کا منہ ہر ایک کے لیے وا کیے ہوئے۔ جوشِ خطابت ایسا کہ تقریبات میں لوگ دم سادھے سنتے رہتے۔ یادداشت ایسی غضب کی ہزاروں سال کی تاریخ کو کوزے میں بند کر دیتے لیکن اپنی کسی صلاحیت پر کوئی غرور کوئی احساس نخوت نہیں کہتے سب کچھ اللہ کی دین ہے، سچ ہے اللہ نے اُنہیں سب کچھ دیا۔

۳۰/اپریل ۲۰۱۳ء منگل کا دن ہمیشہ علی الصبح اُٹھنے کے عادی قمر علی عباسی اُس دن بھی اپنے صبح کے معمولات انجام دے کر ٹی۔ وی پر پاکستان میں مئی میں ہونے والے الیکشن کی خصوصی ٹرانسمیشن دیکھ رہے تھے، تبصرے کر رہے تھے، پھر کمپیوٹر پر اخبارات پڑھنے لگے۔ کوئی سوا گیارہ بجے اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے چلنے میں کمزوری محسوس ہوئی تو بیٹی ماریہ اور بہو ارج نے پکڑ لیا۔ بیڈ تک آہستہ آہستہ ان کے سہارے سے پہنچے اور پھر بے سدھ لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ہم لوگوں نے گھبرا کر ۹۱۱ کو کال کیا۔ ایمرجنسی کی یہ سروس منٹوں میں پہنچتی ہے اور جب تک مطلوبہ جگہ پہنچ نہ جائے فون پر ہدایات دیتی رہتی ہے اُن کے بتائے طریقے سے بیٹی ماریہ اُنہیں CPR دیتی رہی۔ پانچ منٹ کے اندر ۹۱۱ کا عملہ پہنچ کر فرسٹ ایڈ دینے لگا اور پھر فوری اسپتال منتقل کر دیا۔ وہ ہر چیز سے بے نیاز، بے خبر تھے لیکن اللہ کے احسان سے دل کی دھڑکن نارمل ہو گئی تھی اُنہیں کارڈیک اریسٹ ہوا تھا۔

امریکہ میں کچھ برس قبل Hypothermalogy پروسیس متعارف ہوا ہے اس میں مریض کو چوبیس گھنٹے کے لیے Cool کر دیا جاتا ہے اور پھر بارہ گھنٹے کے لیے Warm کیا جاتا ہے اور پھر اگلے چوبیس گھنٹے میں اُمید کی جاتی ہے کہ وہ آنکھیں کھولے اور رسپانس کرے۔

اس تمام عرصے میں ہمارے بچے ثوبیہ، وجاہت، ماریہ، بہو ارج، داماد ذکاالرحمٰن اور انسب اُن کے گرد دعائیں کر رہے تھے قرآنی آیات پڑھ رہے تھے اُن کے کان کے قریب سورۂ رحمٰن کی ریکارڈنگ پلے کر رہے تھے۔ اسپتال کے آئی سی یو یونٹ کا تمام اسٹاف نہایت اچھا اور Co-operative تھا کسی بات کو منع نہیں کرتے۔ دوست احباب فون پر خیریت معلوم کر رہے تھے۔ آنے کو کہہ رہے تھے دعائیں کر رہے تھے، ہم سب انتظار اُمید ناامیدی، خوف و فکر کے جس احساس میں جکڑے ہوئے تھے وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ہر دم ہر موضوع پر بے تکان بولتے وجود کو آنکھیں بند کیے اس خاموشی کی حالت میں بغیر کسی جنبش کے دیکھتے میرا دماغ شل ہو گیا تھا۔ ایک ٹک قمر عباسی کو دیکھ رہی تھی اور اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا رہی تھی۔ ایک بار صرف ایک بار آنکھ کھول دیں اور پھر میرے رب نے ہماری التجائیں قبول کیں اور اُنہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ حیران حیران۔۔ میں کہاں ہوں؟ یہ سوال تھا آنکھوں میں۔۔۔ میں نے اُن کا ہاتھ تھاما۔۔ پورے جسم پر ہاتھوں پر سوجن تھی۔۔۔ ''آپ کی طبیعت ذرا خراب ہو گئی تھی اسپتال لائے ہیں۔۔۔ میں نیلوفر ہوں۔۔۔ مجھے پہچان رہے ہیں نا؟ پہچانتے ہیں تو میرا ہاتھ دبائیں''۔۔ انہوں نے ہاتھ دبایا۔۔۔ ''اور زور سے'' میں نے کہا۔۔۔ ہاتھ پر دباؤ بڑھا، مجھے سکون ہو گیا رسپانس کر رہے ہیں۔ بچوں کو پہچانا دھیمے سے مسکرائے، ہمارے دل خوشی سے بھر گئے آنکھیں شکرانے کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ ڈاکٹر آئے اُن کے ہاتھ پاؤں کو جنبش دے کر دیکھا۔ اللہ کا احسان تھا کوئی جسم کا حصہ متاثر نہیں ہوا تھا، بلڈ رپورٹس بتا رہی تھیں کہ تمام اعضا نارمل کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹرز کہہ رہے تھے معجزہ ہوا ہے۔

یہ پانچ مئی کی بات ہے، چھ مئی کو میری بیٹی ثوبیہ کی شادی کی سالگرہ تھی وہ اور اُس کا شوہر ذکا پھول لے کر اسپتال آئے ''ابو دیکھئے ہر سال آپ بوکے دیتے تھے ہمیں آج ہم آپ کے لیے گلاب لائے ہیں''۔ وہ بہت خوش ہو گئے۔ اُٹھنے کی کوشش کی۔۔۔ ڈاکٹرز نے کہا ذرا آہستہ ایک آدھ دن میں آپ بیٹھنے لگیں گے پھر وہ کرسی پر بیٹھنے لگے۔ سرگوشی میں الفاظ ادا کرنے لگے پھر باقاعدہ جملے بولنے لگے۔ آئی سی یو سے وارڈ میں آ گئے۔۔۔ روزانہ بلڈ ٹیسٹ، ایکسریز ہوتے اور یہ نوید ملتی کہ سب اچھا ہے۔ وہ فائٹر تھے ہار ماننے والے نہیں زندگی سے محبت کرنے والے لیکن موت کے فرشتے کو یہ سب اچھا نہیں لگا۔۔۔ وہ تاک میں تھا جمعرات ۳۰/مئی کو جب صبح ڈاکٹرز نے کہا اب مسٹر عباسی فٹ ہیں آج تو واک بھی خوب کیا اور Swallow Test بھی کلیئر کر لیا ہے۔ بس اب اسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے کل پرسوں تک، عزرائیل مسکرایا۔۔۔ ''ڈسچارج تو ہو جائیں گے مگر صرف اسپتال سے ہی نہیں۔۔۔''

ہم لوگوں نے اُن کے پاس اسپتال جانے کی وزٹ سائیکل ایسی بنائی تھی کہ کسی وقت بھی وہ تنہا نہیں ہوتے صبح دفتر جانے سے پہلے داماد ذکا ان کے پاس جاتا۔ بچوں کو سکول چھوڑتے ہوئے وجاہت خیر خیریت معلوم کرتا، پھر دونوں بیٹیاں ثوبیہ ماریہ اور بہو ارج اُن کے پاس آتے شام کو پوتے نواسا نواسی اُن سے ملنے آتے اور میں اس تمام عرصے میں کوشش کرتی کہ اُن ہی کے پاس رہوں۔

جمعرات کو رات دس بجے میں نے ان کے سر میں ہلکے ہلکے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کل بام لاؤں گی اُس کی سر پر مالش کروں گی تو اچھی نیند آئے گی۔اب آپ سو جائیں۔۔۔اُنہوں نے مجھے دیکھا پھر گردن گھما کر سائیڈ میں بیٹھے بیٹے وجاہت کو دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اُس کے چہرے پر پھیرا اور پھر اچانک چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔وجاہت نے جلدی سے نرس کو بلایا اور پھر ایمرجنسی ڈکلیئر ہوگئی ڈاکٹر نرسیں اُن کے گرد جمع ہوگئے۔اُن کی نبضیں ڈوب رہی تھیں اُن کو سی پی آر دے کر دل کی دھڑکن بحال کرنے کی کوشش ہونے لگی۔اس کارروائی میں نو منٹ لگے۔اور ایک بار پھر موت کو شکست ہوگئی اُن کی اپنی سانسیں اور دھڑکنیں لوٹ آئیں مگر فوری طور پر اُن کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا۔ہم لوگ وہاں رات تین بجے تک تھے۔کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر حسین خواجہ نے کہا اب آپ لوگ گھر جایئے اور جتنی دعائیں آپ لوگ کر سکتے ہیں اور جن سے کہہ سکتے ہیں کہہ دیں۔۔۔میں بھی دعا کروں گا۔

ڈاکٹر حسین خواجہ نے نہ تو دوا میں کوئی کسر چھوڑی نہ دعا میں،ہم نے پاکستان فون کیا۔جس جس سے کہہ سکتے تھے کہا۔۔اُن کے محبت کرنے والوں نے خلوص دل سے دعائیں کیں۔۔۔اور صبح ہوتے ہی میں اور ماریہ آئی سی یو میں اُن کے پاس تھے۔وہ پارہ صفت شخص جو ایک ساتھ دس کام نمٹاتا تھا جس کی روشن آنکھیں ہر لمحے کسی نہ کسی نئی دنیا کی تلاش ہوتی تھیں۔۔۔جو اپنی معلومات کا خزانہ ہر دم بانٹنے میں مصروف رہتا تھا۔۔۔خاموش آنکھیں بند کیے ۔۔۔دنیا سے بے خبر لیٹا تھا۔۔۔صبح ایک ٹیسٹ دماغ کا ہوا تھا ایک بجے نیوروسرجن آئے گا پھر معلوم ہوگا کہ صورتحال کیا ہے۔پونے ایک بجے کے قریب وجاہت اور اِرج اسکول سے بچوں کو لینے چلے گئے تو اپنے ابو کے پاس ثوبیہ اور ذکاء آ گئے ماریہ صبح کی آئی تھی اُسے گھر بھیج دیا،مجھ سے کہا امی آپ تھوڑی دیر Waiting Area میں جا کر آرام کر لیں مجھے گئے پندرہ بیس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ثوبیہ گھبرائی ہوئی آئی آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔۔۔میں پریشان ہو کر بھاگی۔۔۔زندگی ایک بار پھر موت سے نبرد آزما تھی۔۔۔قمر علی عباسی کا بلڈ پریشر ڈاؤن ہو رہا تھا۔۔۔دل کی دھڑکنیں مدھم ہو رہی تھیں مگر وہ ہار ماننے پر تیار نہیں تھے۔۔۔چاروں طرف ڈاکٹرز نرسیں کوششوں میں لگے تھے۔۔۔کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر حسین خواجہ ہر وہ تدبیر کر رہے تھے جو کسی انسان کے بس میں ہوتی ہیں۔۔۔ڈاکٹر پروین خورشید اپنا وارڈ چھوڑ کر ہم لوگوں کو تسلی دینے میں مصروف تھیں۔قمر علی عباسی کے بس بچے بہو داماد گرینڈ چلڈرن وہاں موجود تھے۔دعائیں کر رہے تھے،آئی سی یو کا عملہ حیرت انگیز طور پر مہربان اور کوآپریٹو تھا۔ڈاکٹر خواجہ نے ایک انجکشن لگایا اور دل کی دھڑکن اوپر ہوگئی اسّی (۸۰) پر آ گئی۔بہتے آنسوؤں کے بیچ امید نا اُمیدی کے اُن لمحوں میں آئی سی یو کی ڈائریکٹر نرسنگ شیرن مجھے اپنے کمرے میں لے گئی اور بولی ''تم بھی اس بات پر یقین رکھتی ہونا کہ۔۔۔اللہ کی چیز۔۔۔اللہ کے ہاں واپس جانی ہوتی ہے۔۔۔وہ وقت آ گیا ہے۔۔۔اپنا دل مضبوط کرو۔۔۔اپنے آپ کو تیار کرو ۔۔۔جاؤ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اُسے رخصت کرو''۔''مگر اُن کے دل کی دھڑکن تو نارمل ہو رہی ہے بار بار''میں نے اُمید بھری نظروں سے شیرن کو دیکھا۔''وہ سب انجکشن کی وجہ سے ہے۔۔۔اُس کا اپنا دل ساتھ چھوڑ رہا ہے۔۔۔جاؤ۔۔۔تم اُس کے پاس جاؤ'' یہ کہہ کر شیرن مجھے پکڑ کر ڈاکٹروں نرسوں کو ہٹا کر وہاں لے گئی اور قمر کا وہ ہاتھ جس میں ابھی زندگی کی حرارت تھی میرے ہاتھ میں دے دیا۔۔۔وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ

''تیرا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے''

مگر آج یہ چراغ مدھم ہو رہے تھے،بجھ رہے تھے۔۔۔میں نے اُن کے دل پر ہاتھ رکھا۔۔۔وہ دل جو اُمنگوں،جذبوں اور زندگی سے بھرپور تھا جس کی ہر ہر دھڑکن میں ہزار جذبے پوشیدہ تھے وہ دھیما ہوتا جا رہا تھا۔۔۔زندگی کی طرف لوٹنا چاہ رہا تھا مگر بے بس ہو رہا تھا۔۔۔فائٹر کمزور پڑتا جا رہا تھا۔۔۔موت سے کون لڑ سکا ہے! موت سے کون جیتا ہے۔۔۔کوئی بھی نہیں اور پھر میرے سامنے میرے دیکھتے دیکھتے مانیٹر پر میرے ہر قدم کے ساتھی میرے قمر علی عباسی کے دل کی دھڑکن ستر سے پچاس،پچاس سے تیس۔۔۔بیس۔۔۔دس اور پھر صفر ہوگئی۔۔۔وہ دل ہمیشہ کے لیے دھڑکنا بند ہوگیا۔۔۔جو میرے لیے اپنے بچوں،اپنے دوستوں،ساتھیوں،عزیز و اقارب کے لیے بڑی محبت،بڑی گرم جوشی،بڑے خلوص سے دھڑکتا تھا

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

شہر کیا۔۔۔میری زندگی۔۔۔روز و شب سب ویران ہوگئے۔بے رنگ،بے لطف،بے معنی ہوگئے۔۔۔میں تو آپ کے ہر قدم کی ساتھی تھی۔۔۔ہر سفر پر ساتھ جانے کو تیار تھی۔۔۔اس سفر میں کیوں مجھے پیچھے چھوڑ گئے؟

''BIG APPLE''

نیویارک امریکہ کا گنجان آباد شہر مانا جاتا ہے۔یہاں کی آبادی اسّی لاکھ اور بولی جانی والی زبانوں کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے۔نیویارک میں ہر ملک کی تہذیب،تمدن اور ثقافت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔اسی باعث نیویارک کو عرفِ عام میں ''BIG APPLE'' بھی کہا جاتا ہے۔ماہرین لسانیات کے مطابق نیویارک کی مذکورہ بالا انفرادیت کے حوالے سے دنیا کا دوسرا کوئی شہر اس کی ہمسری کا دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔

❍

ایک صدی کا قصہ
پران کرشن سکند

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

پران! پورانام پران کرشن سکند ولد کیول کرشن سکند ساکن ہوشیار پور پنجاب۔12 فروری 1920 کو ہوشیار پور ضلع کے ایک چھوٹے سے گاوں میں پران کا جنم ہوا۔باپ پیشے سے سول انجینئر تھا مگر وہ سرکاری نوکری کرنے کی بجائے ٹھیکداری کیا کرتا تھا۔وہ زیادہ تر سرکاری ٹھیکے لیا کرتا تھا۔اُسکا کام سڑکیں بنانا ہوتا تھا۔ وہ بہت کم گھر میں دکھائی دیتا تھا۔پران کی ماں کا نام رامیشوری تھا۔ان کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔پران اپنا زیادہ تر وقت اپنی ماں کے ساتھ ہی گزارا کرتا تھا۔وہ ہر کام میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ایک بار اُسکی تائی نے اُسکی ماں کو اس بات کے لئے ڈانٹا کہ وہ ایک اچھے بھلے لڑکے کی زندگی غارت کیوں کرنا چاہتی ہے۔کیول کرشن کا خاندان کافی آسودہ حال تھا۔گھر میں کسی چیز کی کوئی کمی نہ تھی۔بچوں کو جو چاہے وہ مل جاتا تھا تاہم پران کو اس بات کا ہمیشہ ملال رہا کہ وہ اپنے باپ کیساتھ زیادہ وقت گزار نہ سکا۔

کیول کرشن سکند کو کام کے سلسلے میں شہر شہر گھومنا پڑتا تھا اسلئے پران کی تعلیم ایک جگہ پوری نہ ہوسکی۔۔ڈیرہ دون، کپورتھلہ، میرٹھ اور اُناؤ(اُتر پردیش) میں اُس نے پہلی سے لے کے نویں کلاس کی تعلیم پوری کی۔میٹرک اُس نے رضاہائی اسکول رامپور سے پاس کیا۔اُسکے بعد وہ دلی کی اے۔داس اینڈ کمپنی میں ایک ہلپر کے طور پر بھرتی ہوا۔وہ ایک پیشہ ور فوٹوگرافر بننا چاہتا تھا۔اسی کام کے سلسلے میں اُسے شملہ جانا پڑا۔وہاں اُسے ایک ناٹک میں کام کرنے کے لئے آمادہ کیا گیا۔پہلی بار اُس نے اس ڈرامے میں سیتا کا کردار نبھایا۔اسی ڈرامے میں مدن پوری نے بھی کام کیا۔اُس نے اس ناٹک میں رام کا کردار ادا کیا۔

دلسکھ ایم پنچولی فلمی دنیا کی ایک قدآور شخصیت تھی۔پنچولی صاحب جانے مانے فلمساز ،اورڈسٹری بیوٹر تھے۔لاہور میں اُنکے اپنے کئی سینما ہال تھے۔دلسکھ پنچولی کا دفتر لاہور کی ہیرامنڈی میں تھا۔وہ پہلے فلمساز تھے جنھوں نے پہلی پنجابی فلم بنائی۔وہ جس پنجابی فلم کو بنانے کی تیاری کررہے تھے اُس کا نام ''یملا جٹ'' تھا۔اسکے رائٹر ولی محمد ولی تھے۔ولی محمد لاہور کی ایک پان کی دکان سے روز سگریٹ اور پان خریدتے تھے۔پران کو داس اینڈ کمپنی نے لاہور میں فوٹوگرافی کی ایک دکان کھول کردی تھی اور اُسے وہاں بٹھا دیا تھا۔وہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ اُسی دکان پر پان کھانے جاتا تھا جہاں پر ولی محمد سگریٹ خریدتے تھے۔ایک دن ولی محمد ولی سگریٹ خریدنے جارہا تھا کہ اُسکی نظر اس خوبرو نوجوان پر پڑی جسنے اسی دکان سے پان خریدا اور پھر اسنے بڑے ہی سٹائلش انداز سے اس پان کو چبانا شروع کیا۔ولی محمد ولی کو اُسکا یہ انداز اتنا بھا گیا کہ وہ اس نوجواں کے پاس چلا گیا اور اُسکے سراپا کا ایک بھرپور جائزہ لے کر اُسے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک فلمی رائٹر ہے اور لاہور کے بہت بڑے سینما مالک، ڈسٹری بیوٹر اور فلمساز پنچولی کے ساتھ کام کرتا ہے۔وہ ایک پنجابی فلم بنا رہے ہیں جس کا نام ''یملا جٹ'' ہے۔اُسمیں ایک کردار ہے جسمیں اُنہیں اُس جیسے ہی نوجواں کی ضرورت ہے۔کیا وہ اس فلم میں کام کرنا پسند کرے گا۔پران کی عمر اُسوقت محض اُنیس سال تھی۔اُس نے یہ فلم کرنے سے صاف انکار کردیا ولی محمد نے ہمت نہیں ہاری۔اسکے انکار کے باوجود وہ اُسے اصرار کرتا رہا کہ وہ کل اسٹوڈیو میں آکر اُس سے مل لے۔اُس نے ایک کاغذ کے پرزے پر اپنے آفس کا پتہ لکھ کر یہ ٹکڑا اُسکے ہاتھ میں تھما دیا اور اُسے اگلے روز دفتر میں آنے کے لئے کہا۔پران ہاں کہہ کے وہاں سے چلا گیا۔اپنی فوٹوگرافی کی دکان پر پہونچ کر وہ ولی محمد کو بھول گیا۔دوسرے دن ولی صاحب انتظار کرتا رہا مگر وہ نوجواں نہیں آیا۔ کچھ روز اور گزر گئے۔اسی ہفتے کے سنیچر کے روز پران اپنے دوستوں کے ساتھ پلازہ سینما میں میٹنی شو دیکھنے گیا تھا۔اتفاق دیکھئے کہ ولی صاحب بھی وہی فلم دیکھنے آئے تھے۔وہ وہاں ولی صاحب سے ٹکرایا۔ولی صاحب اُسے دیکھ کر آپے سے باہر ہوگیا اور اُس نے اُسے بے نقطہ سنا ڈالی۔ پران نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ ولی صاحب نے اُسے پنجابی میں بھرپور گالیاں دیں۔جب اُسکے من کی بھڑاس نکل گئی تو اُس نے پران سے کہا کہ اُس نے اُسکی خاطر پنچولی صاحب کو کسی اور ایکٹر کو سائن کرنے سے منع کردیا۔پران نے اُس سے معافی مانگی اور اگلے دن آفس میں آنے کا وعدہ کیا۔ولی صاحب نے اس بار اُس پر اعتبار نہ کیا اور اُسکا پتہ لکھ کر وہ اگلے روز اُسے گھر سے اُٹھا کر آفس میں لے آیا۔وہاں پر اُسکے فوٹوگراف لئے گئے اور تڑ پڑ اُسے فلم ''یملا جٹ'' کے لئے سائن کیا گیا۔اس فلم کے ڈائرکٹر موتی گڈوانی تھے۔اس فلم میں پران کا ویلن کا رول تھا۔اس فلم میں اُس کیساتھ بے بی نورجہاں تھی جس نے ایک بچی کا رول ادا کیا تھا۔ساتھ میں درگا کھوٹے تھی۔اس فلم میں پران کی تنخواہ پچاس روپے ماہانہ طے کی گئی۔پران نے اپنی طرف سے یہ شرط رکھی کہ جس دن اُسکی شوٹنگ نہ ہو اُس دن اُسے اپنی فوٹوگرافی کی دکان پر بیٹھنے سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔فلم کی شوٹنگ پورے شدومد سے شروع ہوگئی۔پران چونکہ پنجاب سے زیادہ تر باہر ہی رہا تھا اسلئے وہ اپنی مادری زبان پنجابی سے بے بہرہ ہی رہا۔اس فلم کی شوٹنگ کے دوران ایک مرتبہ یہ فیصلہ بھی ہوا کہ پران پنجابی صیح ڈھنگ سے بول نہیں پارہا ہے اسلئے اُسے فلم سے باہر کردیا جائے۔ یہ ولی محمد ولی تھا جس نے پران کا بچاؤ کیا۔اُس نے فلمساز کو سمجھایا کہ وہ جلد بازی سے کام نہ لیں اور اس لڑکے کو تھوڑا بہت وقت دیں۔پنچولی صاحب نے اُسکی بات مان لی۔یہ فلم 1940 میں ریلیز ہوئی۔اس فلم نے پورے ملک میں دھوم مچائی۔اس فلم کی بے پناہ کامیابی کے بعد جب ایک

اخبار میں اُسکا انٹرویو چھپا تو اُس نے اپنی بہنوں سے کہا کہ وہ اس اخبار کو چھپا کے رکھیں اور اسے والد صاحب تک پہونچنے نہ دیں کیونکہ وہ اُنہیں کسی بھی قیمت پر فلموں میں کام کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ یاد رہے کہ اُن دنوں فلموں میں کام کرنے والوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ بعد میں جب یہ خبر اُنکے والد تک پہونچ گئی تو اُنہوں نے پران کے فلموں میں کام کرنے پر کوئی اعتراض نہیں جتایا۔ اُسکے بعد پران نے دو اور پنجابی فلموں میں چھوٹے چھوٹے رول ادا کیئے جن کا نام ''چودھری'' اور ''خزانچی'' تھا۔

پنچولی صاحب ہندی فلموں میں بھی قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے۔ شوکت حسن رضوی پنچولی صاحب کے پسندیدہ ایڈیٹر تھے۔ وہ اُسکے کام سے اتنے خوش تھے کہ اُنہوں نے اُسے ہندی فلم ''خاندان'' کے ڈائرکٹر کے طور پر سائن کیا۔ پران پنچولی فلمز کی ہی دریافت تھا اسلیئے ''خاندان'' میں بھی اُسے ہی دہرایا گیا۔ اس بار اُسے ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔ نورجہاں جس نے پہلی فلم میں چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر کام کیا تھا اس فلم میں اُسے ہیروئن کے رول کے لئے منتخب کیا گیا۔ اُسوقت نورجہاں کی عمر پندرہ برس سے کم ہی تھی۔ پران کافی قد آور تھا جب کہ نورجہاں ابھی چھوٹی تھی اسلیئے کلوز اپ میں اُسے اینٹوں پر کھڑا کیا جاتا تھا۔ یہ فلم 1942 میں ریلیز ہو کے خوب چلی۔ اس فلم کے گانے بیحد مقبول ہوئے۔ یہ گانے نورجہاں کے گائے ہوئے تھے۔ اس فلم کے بعد پران نے کوئی بھی فلم بطور ہیرو سائن نہیں کی کیونکہ اُسے ہیروئنوں کے پیچھے بھاگنا اور درختوں کے گرد گھومنا پسند نہ تھا۔ پران نے ڈائرکٹر موتی گڈوانی کے ساتھ دو اور فلمیں بنائیں جن کا نام ''کیسے کہوں'' جو کہ 1945 میں ریلیز ہوئی۔ اسی سال پران نے شکلا آہلووالیہ نام کی ایک لڑکی سے بیاہ رچا لیا۔ 1946 میں پران کی اگلی فلم ''خاموش نگاہیں'' ریلیز ہوئی۔

1942 سے لے کے 1946 تک پران نے لاہور میں رہ کر 22 فلمیں کیں جن میں سے اٹھارہ ریلیز ہوئیں اور دو بعد میں ریلیز ہوئیں۔ اس بیچ پران کا بیٹا ایک سال کا ہوا گیا اور اُسکی بیوی اور بہنیں بچے کا جنم دن منانے اندور چلی گئیں تھیں۔ پران کی بیوی نے پران کو بھی اس تقریب میں شامل ہونے کے لئے آمادہ کیا اور اسطرح پران بھی اندور پہونچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس تقریب کو دھوم دھام سے منا پاتے، ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ لاکھوں انسانی جانیں تلف ہوئیں اور آخر میں ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔ پران لاہور واپس نہ جا سکا۔ وہ اندور چھوڑ کے بمبئی چلا گیا۔ وہ اس شہر سے مانوس نہ تھا پھر بھی اُسے پورا یقین تھا کہ یہاں کے فلمساز اُسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے پر یہ سب اُسکی خام خیالی ثابت ہوئی۔ اُس نے کئی مہینوں تک یہاں کی سڑکوں کی خاک چھانی۔ وہ یہاں کے اسٹوڈیوز کا طواف کرتا رہا مگر کہیں کوئی کام نہ ملا۔ دل برداشتہ ہو کر وہ میرین ڈرائیو کے ڈالمر ہوٹل میں آٹھ مہینے تک کام کرتا رہا۔ ایک دن سعادت حسن منٹو سے اُسکی ملاقات ہوئی۔ منٹو اور ایکٹر شیام کی مدد سے اُسے بمبئی ٹاکیز کی فلم ''ضدی'' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس فلم کو شاہد لطیف ڈائرکٹ کر رہے تھے۔ فلم کے ہیرو دیو آنند تھے۔ اس فلم میں اُسے ایک ویلن کا رول کرنے کے لئے کہا گیا۔ اُس نے بخوشی یہ پیشکش قبول کی۔ اس فلم نے دیو آنند کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ وہ راتوں رات اسٹار بن گیا۔ پران کو بھی اس فلم سے فائدہ ہوا۔ اسی سال اُسکی ایک اور فلم ''بڑی بہن'' ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں پران نے سگریٹ کے چھلے اُڑا کر ناظرین سے خوب داد وصول کی۔ ''ضدی'' اور ''بڑی بہن'' کی کامیابی کے ساتھ ہی پران کی مقبولیت کا گراف بھی بڑھنے لگا مگر کسی نے اُسے سائن نہیں کیا۔ ولی محمد ولی جو کہ پران کو فلموں میں لے آیا تھا وہ بھی لاہور چھوڑ کر بمبئی چلا آیا تھا اور یہیں پر بس گیا تھا۔۔ ولی محمد نے فیمس مہالکشمی اسٹوڈیو میں اپنا پروڈکشن آفس کھولا تھا اور پہلی فلم بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے اس فلم کے لئے پران کو سائن کیا۔ پران نے اپنے محسن کی ہر طرح سے مدد کی۔ یہ فلم سائن ہوتے ہی اُس نے ایک مہینے کے اندر تین اور فلمیں سائن کیں۔ پہلی فلم ایس۔ ایم۔ یوسف کی ''گرہستی'' تھی جو کہ 1948 میں ریلیز ہوئی اور اس فلم نے ڈائمنڈ جوبلی منائی۔ اس میں اُسکی ہیروئن شارداتھی۔ اس فلم کا گانا '' تیرے ناز اُٹھانے کو جی چاہتا ہے'' اُس زمانے میں بیحد مقبول ہوا۔ اُسکے بعد 1949 میں پربھات فلمز کی ''اپرادھی'' ریلیز ہوئی۔ اسکے بعد ولی محمد کی فلم آئی۔ اس فلم کا نام ''پتلی'' تھا جو کہ 1949 میں فلم ''اپرادھی'' کے ساتھ ہی ریلیز ہوئی۔

1950 میں پران کی فلم ''شیش محل'' ریلیز ہوئی جس میں اُس نے اپنے مکالموں کی ادائیگی کو ایک نیا اسلوب دیا۔ سینما شائقین نے اس نئے انداز کو بیحد پسند کیا۔ پران اب ایک جانا پہچانا نام بن گیا تھا۔ وہ اپنی ہر نئی فلم کے ساتھ ایک نئے انداز میں پیش ہوتا تھا۔ وہ ہمہ جہت فن کار تھا۔ وہ ہر کردار میں اپنے آپ کو اسطرح ڈھال لیتا تھا کہ وہ کردار یادگار بن کر رہ جاتا تھا۔ بطور ویلن پران کی سب سے بڑی ہٹ فلم بی۔ آر۔ چوپڑہ کی ''افسانہ'' تھی جو 1952 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم میں اُس نے اشوک کمار کے مدمقابل کام کیا تھا۔ اشوک کمار کا اُس زمانے میں طوطی بولتی تھا۔ اس فلم کے بعد دونوں ایک دوسرے کے بیحد قریب آ گئے۔ دونوں نے ایک ساتھ ستائیس فلمیں کیں۔ یہ دوستی اشوک کمار کے مرنے تک قائم رہی۔ اُدھر لاہور میں اُسکی دو فلمیں ''بت تراش'' 1951 میں اور 'خانہ بدوش'' 1952 میں ریلیز ہوئیں۔ دونوں نے ٹھیک ٹھاک بزنس کیا۔

سنے بلٹیز کو دئے گئے ایک انٹرویو میں پران نے کہا کہ وہ ایک فلم کر نے جا رہا تھا جسمیں اُسکا معاوضہ پانچ سو روپے طے کر کے رکھا گیا تھا۔ پران نے فلمساز سے کہا کہ وہ یہ فلم اتنے کم پیسے میں نہیں کر پائے گا۔ فلمساز نے اُسے سمجھایا کہ اس فلم کے ہیرو کا معاوضہ بھی پانچ سو روپے ہی طے ہوا ہے۔ تھوڑی بہت کھینچا تانی کے بعد فلمساز نے اُسکا معاوضہ پانچ سو سے بڑھا کر چھ سو روپے

کر دیا پر شرط رکھی کہ وہ یہ بات اپنے تک ہی رکھے۔ کسی سے اس بارے میں کوئی ذکر نہ کرے۔ پہلی بار اُس نے اس رقم سے ایک چھوٹی سی گاڑی خریدی اور اپنی بیوی کے پاس یہ کار لے کر گیا اور اُس سے کہا کہ بہت جلد اُنکے اچھے دن آنے والے ہیں۔ ایک دن جب وہ کسی پرڈیوسر کے آفس میں بیٹھا تھا کہ اُسکی بیوی کا فون آیا کہ اس گاڑی کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ گاڑی میں بیٹھے پران کے پریوار میں سے کسی کو بھی کوئی چوٹ نہیں پہونچی تھی۔ پران کو ٹیلفون لینے کے لئے چار منزل سیڑھیاں چڑھنی پڑی تھیں۔ اُسے گاڑی کھونے کا افسوس نہ تھا بلکہ چار مالا کی سیڑھیاں چڑھنے سے وہ برہم تھا۔ رات کو جب وہ گھر پہونچا تو بیوی نے اُسکی خوب خبر لی۔ پران نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا کہ وہ اُسکے لئے دوسری گاڑی بہت جلد خرید لے گا۔

1951 میں اے۔ وی۔ ایم فلمز کی ''بہار'' میں اُس نے کرن دیوان اور وجینتی مالا کے ساتھ کام کیا۔ یہ ساؤتھ کی پہلی فلم تھی جو اُس نے سائن کی تھی۔ وجینتی مالا نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ جب ''بہار'' بن رہی تھی تو اُسوقت اُسکی عمر پندرہ سولہ سال کے قریب تھی۔ یہ فلم تامل میں پہلے بن چکی تھی اور اب اُسے ہندی میں بنایا جارہا تھا۔ سارے ٹیکنیشن وہی تھے سوائے کلاکاروں کے۔ مجھے یاد ہے جب پران کے ساتھ میرا پہلا شاٹ ہونے والا تھا تو جونہی وہ میری طرف بڑھا اور اُس نے مجھے گرسنہ نگاہوں سے گھورنا شروع کیا تو میری سٹی گم ہوگئی اور میں سارے ڈائیلاگ بھول گئی اور پتے کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔ اس فلم کے ساتھ ہی اُس نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ جب وہ اس فلم کے پریمیر پر جائیں گے تو ایک بڑی گاڑی میں بیٹھ کر جائیں گے۔ اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ وہ ایک بڑی گاڑی خرید کر لایا اور ''بہار'' کے پریمیر میں اپنی بیوی کے ساتھ چلا گیا۔ یہ پہلی اور آخری فلم تھی جسمیں اُسکی بیوی اُسکے ساتھ کسی فلمی فنکشن میں نظر آئی تھی۔

1958 میں فلم ''عدالت'' ریلیز ہوئی جسمیں پران کے کام کو بیحد سراہا گیا۔ پران نے اپنے دور کے تین ٹاپ کے اداکاروں کے ساتھ کام کیا۔ دلیپ کمار، دیو آنند اور راجکپور۔ وہ پچاس، ساٹھ اور ستر کی دہائی میں سب سے بڑا ویلن مانا جاتا تھا۔ فلم میں پران کا ہونا فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ دلیپ کمار کے ساتھ اُس نے 1955 میں دو فلمیں کیں۔ ''آزاد'' اور ''دیو داس''۔ 1958 میں ''مدھومتی'' اور 1966 میں ''دل دیا درد لیا''۔ 1967 میں ''رام اور شیام'' اور 1968 میں ''آدمی''۔ پران اور دلیپ صاحب کی خوب گھٹتی تھی۔ وہ جب بھی ملتے تھے تو اپنی مادری زبان پنجابی میں گفتگو کرتے تھے۔ دونوں اُردو ادب کے بیحد دلدادہ تھے اسلئے فلموں سے ہٹ کر اکثر شعر و ادب پر باتیں ہوتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ دلیپ کمار کے ساتھ یکے بعد دیگرے فلمیں کرنے کے بعد مدراس میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ پران دلیپ کمار کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا ہے۔ پران صاحب اور دلیپ صاحب باندرہ کے پالی ہل میں ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے تھے اسلئے گاہے بگاہے ایک دوسرے سے ملنا ہوتا ہی تھا۔ پران دلیپ کمار اور راجکپور کے بیحد قریب تھا۔ جب دلیپ کمار کی شادی سائرہ بانو سے ہو رہی تھی تو وہ کشمیر میں ''کشمیر کی کلی'' کی شوٹنگ کر رہا تھا۔ اُدھر بمبئی سے دلیپ کمار کے فون پر فون آرہے تھے کہ اُسے اس شادی میں کسی بھی قیمت پر شامل ہونا ہوگا۔ اُس وقت کشمیر کا موسم بیحد خراب تھا۔ پران نے ٹھان رکھی تھی وہ اپنے دوست کی شادی میں ضرور شامل ہوجائے گا۔ جیسے تیسے وہ بمبئی پہونچ گیا۔ راجکپور وہاں پر پہلے سے ہی موجود تھا۔ سب نے مل کر خوب ناچ گانا کیا اور اُسکے بعد جب پیانے چھلکے تو یہ لوگ پی کے اتنی مستی میں آگئے کہ سیدھے دلیپ کمار کے بیڈروم پر ہلہ بولنے لگے۔ دلیپ کمار اپنی پہلی سہاگ رات منا رہا تھا۔ یہ لوگ تب تک وہاں سے نہیں ہٹے جب تک دلیپ کمار کو باہر آکر انہیں ہلو نہ کہنا پڑا۔ اُنکی آخری ملاقات دو برس قبل دلیپ صاحب کی سالگرہ پر ہوئی تھی جب پران دلیپ صاحب کو جنم دن کی مبارکباد دینے اُنکے بنگلے پر چلا آیا تھا۔

دیو آنند کے ساتھ ''ضدی'' کے بعد اُس نے تین فلمیں کیں ۔1955 کی ''منیم جی'' 1958 کی ''امر دیپ'' اور 1961 کی ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے''۔ اسی طرح راج کپور کے ساتھ 1953 کی ''آہ'' 1956 کی ''چوری چوری'' 1956 کی ''جاگتے رہو'' 1960 کی ''چھلیا'' اور ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے اور 1963 کی ''دل ہی تو ہے'' اور جوائے مکھر جی کے ساتھ 1963 ''پھر وہی دل لایا ہوں''۔

پران نے پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں کئی فلمیں بطور ہیرو کے کیں جسمیں ''1954 کی ''پلپلی صاحب'' اور 1956 کی ''ہلاکو'' قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں فلمیں بیحد کامیاب رہیں۔ ''ہلاکو'' کے گانوں نے اُس زمانے میں خوب دھوم مچائی۔ اس فلم کے موسیقار شنکر جے کشن تھے۔ یہ گانے آج بھی بیحد مقبول ہیں۔ پران نے ہر طرح کی فلموں میں کام کیا۔ وہ چاہے ''سند باد داسیلر'' ہو یا ''سند باد کی لڑکی''، ہو۔ بطور ویلن پران نے ایسی دہشت قائم کی تھی کہ کوئی بھی پریوار اپنے بچے کا نام پران نہیں رکھتا تھا۔ اگر کسی محفل میں پران شریک ہوتا تھا تو لوگ اپنی بہو بیٹیوں کو اُس کی نظروں سے چھپا کر رکھتے تھے۔ اگر کوئی اُنہیں چائے پر بلاتا تھا تو گھر کی عورتوں کو گھر سے باہر بھیج دیا جاتا تھا۔ ایک بار دلی میں کسی دوست نے اُسے گھر پر ایک کپ چائے پینے کے لئے بلا لیا۔ پتہ چلا کہ اُس نے اپنی بہن کو گھر سے باہر بھیج دیا تھا۔ بعد میں اُس دوست نے اُسے فون کر کے بتادیا کہ اُسکی بہن اُس سے اس بات کو لے کر لڑ پڑی کہ اُس نے ایسے برے آدمی کو اپنے گھر پر کیوں بلا لیا۔ برے آدمی کے کردار میں اُس نے جو شہرت حاصل کی تھی وہ اچھے بھلے ہیروں کو بھی نہیں ملی تھی۔

پران جیسا فلم کے پردے پر دکھتا تھا اصل زندگی میں وہ اُسکے بالکل اُلٹ تھا۔ وہ اپنے پریوار سے بے انتہا پیار کرتا تھا۔ گھر آکر وہ ایکدم گھر گرہستی والا انسان بن جاتا تھا۔ اُسکی بیٹی پنکی کا کہنا ہے کہ وہ کبھی بھی فلموں کی باتیں گھر پر کیا

نہیں کرتے تھے۔ اُنکا باپ کتنا بڑا ایکٹر ہے یہ ہمیں بڑا ہونے کے بعد معلوم پڑا۔ پران جب شام کو گھر آتا تھا تو وہ اپنی اسکاچ کی بوتل کھول دیتا تھا۔ دو تین پیگ چڑھانے کے بعد وہ اقبال، اصغر گونڈوی، غالب، میر تقی میر، نظیر اکبرآبادی کے شعر سنانے لگتا تھا۔ فیض احمد فیض کا سارکلام اُسے ازبر تھا۔ اسی طرح علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کا ایک ایک شعر اُسے یاد تھا۔ وہ اُردو شاعری کا بیحد دلدادہ تھا۔

1954 میں اُس نے بمل رائے کی ہدایت میں بننے والی فلم ''براج بہو'' میں کام کیا۔ اسی طرح 1957 میں ناصر حسین کی ہدایت میں بننے والی پہلی فلم ''تم سا نہیں دیکھا'' میں اُس نے شمی کپور کے ساتھ کام کیا۔ یہ تینوں فلمیں بیحد کامیاب رہیں۔ وہ پچاس کی دہائی کے جانے مانے ڈائرکٹر نانو بھائی بھٹ، کالیداس، رویندر دوے، آئی ایس جوہر اور بمل رائے کے من پسند اداکاروں میں سے ایک تھا جو اُسے اپنی ہر فلم میں کاسٹ کرتے تھے۔ اسی طرح ساٹھ کی دہائی میں وہ اے بھیم سنگھ، شکتی سامنت، بھپی سونی، ناصر حسین اور کے امر ناتھ کا پسندیدہ کلاکار رہا۔ اُس نے نئے ڈائرکٹروں اور پرڈیوسروں کے ساتھ بھی کام کیا اور سب سے زیادہ معاوضہ پانے والوں میں وہ ایک تھا جسے فلمساز خوشی خوشی منہ مانگا معاوضہ ادا کرتے تھے۔ اُس نے کرن دیوان سے لے کے سلمان خان تک سبھی چھوٹے بڑے ستارے کے ساتھ کام کیا۔ امیتابھ بچن آج جس مقام پر کھڑا ہے وہاں تک پہونچانے والا پران ہی ہے۔ ہوا یوں کہ جب پرکاش مہرہ '' زنجیر'' بنانے کی تیاری کر رہا تھا تو وہ ہیرو کے لئے دیو آنند کو لینا چاہتا تھا۔ دیو آنند عدیم الفرصت ہونے کے سبب یہ فلم کر نہ سکا۔ پرکاش مہرہ نے راجکمار سے رجوع کیا۔ اُس نے بھی یہ فلم کرنے سے انکار کیا۔ اُس نے دھرمیندر اور شترو گھن سنہا کو یہ فلم کرنے کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر وہاں بھی اُسے کوئی کامیابی نہیں ملی۔ تبھی پران نے امیتابھ بچن کا نام سجھایا۔ بعد میں سلیم جاوید نے بھی امیتابھ بچن کے نام کی سفارش کی۔ پرکاش مہرہ اس فلم کی فلمبندی کے دوران اس تذبذب کا شکار رہا کہ آیا فلمی شائقین امیتابھ بچن کو قبول کریں گے یا نہیں یہ پران تھا جو پرکاش مہرہ کو بار بار یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُسکی فلم خوب چلے گی۔ فلم جب ریلیز ہوئی تو اس فلم نے باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔ پران کی پیش گوئی بالکل سچ ثابت ہوئی تھی۔ امیتابھ بچن راتوں رات اسٹار بن گیا۔

پران نے سونے کا دل پایا تھا۔ وہ کسی کو بھی تکلیف میں دیکھتا تھا تو فوراً اُسکی مدد کے لئے آگے بڑھتا تھا۔ فلموں کا بدنام زماں ویلن ذاتی زندگی میں نہایت ہی نیک اور شریف انسان تھا۔ اپنی ساٹھ سالہ فلمی زندگی میں اُسکا نام ایک بار بھی کسی اسکینڈل میں نہیں آیا۔ اُسکا کردار آئینے کی طرح صاف و شفاف رہا۔ بقول وحیدہ رحمان، پران جس سیٹ پر ہوتا تھا، اُس سیٹ پر کام کرنے والی ہر عورت کی عزت محفوظ ہوتی تھی۔ وہ فٹ بال کا بڑا شوقین تھا۔ اُس نے اپنی ایک ٹیم بنا رکھی تھی جس کا سارا خرچہ وہ اُٹھاتا تھا۔ ہندوستانی کرکٹ کے مایہ ناز کھلاڑی کپل دیو کو جب کرکٹ بورڑ نے ٹریننگ کے لئے مالی کمی کے سبب باہر بھیجنے سے معذوری ظاہر کی تو پران نے سارا خرچہ خود اُٹھانے کا ذمہ لیا۔ بعد میں کرکٹ بورڑ نے کپل دیو کو اپنے مالی تعاون سے باہر بھیج دیا۔

پران کی امیج فلم ''اُپکار'' سے ایک دم بدل گئی۔ اس فلم میں اُس نے ایک لنگڑے فقیر ملنگ چاچا کا مثبت رول ادا کیا تھا۔ اس فلم کو بے پناہ کامیابی ملی۔ پران کا یہ نیا روپ لوگوں کو اتنا پسند آیا کہ وہ اُسے ملنگ چاچا کہہ کر بلانے لگے۔ پران نے ایک انٹرویو میں کہا کہ دلی میں کامیڈین اُوم پرکاش کی بیٹی کی شادی تھی جسمیں انڈسٹری کے بیشتر اداکار شریک ہوئے تھے۔ لوگ اپنے من پسند کلاکاروں کو دیکھ کر پاگل ہو رہے تھے۔ وہ اُنکے کپڑے نوچ رہے تھے۔ اتنے میں وہ آ گیا۔ جونہی مہمانوں نے اُسے دیکھا تو وہ یہ کہہ کر ایک طرف ہٹ گئے 'ملنگ چاچا آ رہا ہے۔ اسے راستہ دے دو۔''

پران ایک ہمہ جہت فنکار تھا۔ کام کے تئیں اُسکی لگن کا اندازہ اس ایک واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب وہ منوج کمار کی فلم ''اُپکار'' میں کام کر رہا تھا تو ایک دن دوپہر کے وقت منوج کمار نے پران کو ایک کونے میں اکیلا بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ کافی مضمحل اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ منوج کمار نے جب اُس سے اُسکی طبعیت کے بارے میں پوچھا تو اُسکی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور وہ رندھی ہوئی آواز میں منوج کمار سے بولا کہ کل رات اُسکی بہن کا انتقال ہوا ہے جو کہ کلکتہ میں رہتی تھی۔ وہ اسلئے نہ جا سکا کہ اُسکے جانے سے دو پرڈیوسروں کا لاکھوں کا نقصان ہو جاتا۔ ایسے تھے پران۔ پران نے 350 فلموں میں کام کیا۔ ان ساری فلموں میں اُسے سب سے زیادہ فلم ''ہلاکو'' پسند تھی جس میں حالانکہ اُسکا منفی رول تھا پھر بھی وہ کردار اُسے بیحد پسند تھا۔ اسکے علاوہ پران کو فلم ''مدھومتی'' ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' ''دل دیا درد لیا'' ''اُپکار'' ''شہید'' ''زنجیر'' اور ''وکٹوریہ نمبر 203'' میں اپنے کردار بے حد پسند تھے۔ پران کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ فلم کی کاسٹ میں اُسکا نام سب کلاکاروں کے آخر میں آتا تھا۔ اور پران یا سب سے بڑھکر پران۔ دوسری فلم جو پران کو بیحد پسند تھی وہ تھی فلم ''دل دیا درد لیا''۔ اس فلم میں اُس نے کھل کر قہقہے لگائے تھے۔ حالانکہ یہ قہقہے ہذیانی کیفیت میں اُس نے لگائے تھے پھر بھی یہ واحد فلم تھی جسمیں اُس نے کھل کر قہقہے لگائے تھے۔ اس کام میں دلیپ کمار نے اُسکی خوب مدد کی۔ اسی طرح فلم ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' میں پران نے ایک ڈاکو کا رول ادا کیا تھا۔ وہ ڈاکو اتنا خونخوار لگتا تھا کہ لوگ اُسکی انٹری کے ساتھ ڈر کے مارے سیٹوں سے اُچھل پڑتے تھے۔ اس فلم کی کامیابی کا سہرا پران کے سر جاتا ہے۔

پران نے اپنے چھوٹے بیٹے سنیل سکند کو آگے بڑھانے کے لئے ایک فلم بھی پرڈیوس کی تھی جس کا نام ''فرشتے'' تھا۔ افسوس کہ یہ فلم حسب توقع نہ چلی۔

پران کو 2001 میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔اُسے پانچ فلم فیرایوارڈ ملے۔1972 میں جب اُسے فلم ''بے ایمان'' میں کانسٹبل رام سنگھ کا کردار ادا کرنے کے لئے فلم فیرایوارڈ دیا گیا تو اُس نے یہ ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔انکار کی وجہ یہ تھی کہ اُس سال کا بہترین موسیقار کا ایوارڈ ''پاکیزہ'' کے سنگیت کار غلام محمد کو ملنے کی بجائے شنکر جے کشن کے حق میں چلا گیا تھا وہ بھی اُسی فلم ''بے ایمان'' کے لئے جس کے لئے پران کو اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ یہ تھا پران کا کردار۔ بے باک، بے لاگ اور ہر قسم کے تعصب سے پاک۔ پران بھر پور زندگی جیا۔تین سال قبل اُسکا جنم دن بڑے دھوم دھام سے منایا گیا جسمیں دلیپ کمار، سائرہ بانو۔شمی کپور، راج کپور کی بیوہ کرشنا کپور اور بیٹے رندھیر کپور نے شرکت کی۔2013 یعنی اسی سال اُسے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

پچھلے ایک سال سے پران صاحب فراش تھا۔ وہ کبھی لیلا وتی اسپتال میں ہوتا تو کبھی گھر میں۔آخر ایک سال کی طویل علالت کے بعد 12 جولائی 2013 کو اُس نے اس دنیا کو الوداع کہا۔وہ اپنے پیچھے دو بیٹے اروند، سنیل، بیٹی پنکی اور اپنی بیوہ کو چھوڑ کر گئے ہیں۔پران کی وفات پر ہندوستان کے وزیر اعظم من موہن سنگھ نے دکھ کا اظہار کیا اور سوگوار خاندان سے تعزیت کی۔پران کی موت کی خبر سن کر پوری فلم انڈسٹری سوگ میں ڈوب گئی۔

پران نے ساڑھے تین سو کے قریب فلموں میں کام کیا جن کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔پران نے جو بھی فلم کی اُسمیں اپنے کردار کو اپنی ادائیگی سے یادگار بنا دیا۔وہ ہر فلم میں ایک نئے گٹ اپ کے ساتھ دکھائی دیتا تھا۔ایک بار ایک صحافی نے اُس سے پوچھا کہ وہ اپنے میک اپ اور کاسٹیوم پر اتنی زیادہ توجہ کیوں دیتا ہے تو پران نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اپنے میک اپ اور کاسٹیوم پر دھیان نہ دے تو وہ الگ کیسے لگے گا۔لوگ ایک ہی طرح کے پران کو دیکھ کر اوب نہیں جائیں گے۔اُس نے اُسے فلم ''ہلاکو'' کو واقع سنایا۔ جب مینا کماری کو بتایا گیا کہ پران اس فلم میں ہیرو کا رول ادا کر رہا ہے تو وہ حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔وہ پران کی ہیروئن بننے سے ہچکچا رہی تھی تبھی پران ہلاکو کے گیٹ اپ کے ساتھ سیٹ پر آ گیا تو مینا کماری بس اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ واقعی ہلاکو لگ رہا تھا۔

پران کے جانے سے فلمی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے پر کرنا بہت مشکل ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنے بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بقیہ --- بادشاہ کا قد

نہیں میرے تمام درباریوں سے بھی قد میں بلند ہیں''

بادشاہ سوچ میں پڑ گیا۔

شہزادی نے اس سے بیٹھنے کی درخواست کی اور مہمانوں کی طرف متوجہ ہوئی ''اتنی کم مہلت میں آپ سب کا اپنا کام چھوڑ کر یہاں حاضر ہونے کا شکریہ''۔ پھر چند لمحے خاموش رہ کر اس نے کہا ''پوشاکیں آپ کو ہماری طرف سے تحفہ ہیں گھر پہنے پہنے جائیے''

''پوشاک کے علاوہ؟'' ایک بونے نے مسخرے پن سے کہا۔

شہزادی سیم تن اس کی بات سمجھ گئی جھینپ کر بولی ''سواری کے لیے سب کو ایک یابو دیا جاتا ہے یہ ہے علاوہ''

بادشاہ سرخ مخمل کی آرام دہ کرسی میں بیٹھا سوچ رہا تھا شہزادی کے وہ دو مختصر جملے: 'وہ تو آپ ہمیشہ سے ہیں اور صرف مجھ سے نہیں میرے تمام درباریوں سے بھی۔۔۔' اسے ستا رہے تھے اچانک اُسے خیال آیا ''پھر تو میں اپنے درباریوں میں بھی، سب سے نہ سہی، بہت سوں سے۔۔۔'' ''مگر یہ تبدیلی مجھ میں کب سے آئی تھی جس نے میرے دماغ کو ایک شکنجے میں جکڑ رکھا تھا؟'' اُس کے دماغ نے جواب دیا ''جس دن جنت مکاں، بادشاہ دوراں والد محترم کا انتقال ہوا تھا؟''

''نہیں۔ یا شاید تھوڑی بہت''

''جس دن جنت نشاں ملکہ عالیہ نے میرا سر اپنے سینے سے لگا کر کہا تھا ''شہزادے اب آپ کے سیر تماشے، شکار، ناچ گانے سے دل لگانے کے دن ختم ہوئے''۔ اس کا چہرہ ایک دم چمک اٹھا۔ پردے کے ہٹ جانے پر جس طرح اسٹیج روشنی میں نہا جاتا ہے اور وہاں اتنی بات کہہ کر تاج میرے سر پر اپنے ہاتھوں سے رکھا تھا۔ اس لمحے مجھے لگا تھا وہ تاج نہیں چکی کا پاٹ تھا اور اس کے بوجھ تلے میں تھوڑا سا، بس تھوڑا سا زمین میں دھنس گیا تھا۔

شہزادی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا ''کیا سوچ رہے ہیں؟''

بادشاہ نے اٹھتے ہوئے کہا ''دن بہت چڑھ گیا ہے، رعیت میری جان کو رو رہی ہوگی۔ جاؤں جا کر ان کی سنوں''۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

ڈیئر گلزار جاوید، سلام مسنون۔

میں یورپ میں دو ماہ قیام کے بعد لاہور پہنچا تو آپ کا خوبصورت اور دلآویز رسالہ ''چہارسُو'' ملا۔ پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آپ نے میرے بارے میں رسالے کے قریب نصف صفحات شامل کیے ہیں جنہیں پڑھ کر میں بلا خوف وتردید کہہ سکتا ہوں کہ ''چہارسُو'' اس وقت پاکستان اور ہندوستان میں شائع ہونے والے اردو رسائل میں سب سے زیادہ معیاری اور سب سے زیادہ اعلیٰ جریدہ ہے۔ مضامین اور شاعری میں کوئی چیز بھرتی کی نہیں بلکہ آپ چھان پھٹک کرنے کے بعد شاملِ اشاعت کرتے ہیں۔ ''چہارسُو'' کا لے آؤٹ دیدہ زیب ہوتا ہے جس کے باعث یہ دنیا بھر میں اردو ادب کی علامت بن چکا ہے۔ میں نے بیرون ملک اس کا کافی ذکر سنا ہے۔

آج کل لوٹ کھسوٹ، چھینا جھپٹی اور نفسا نفسی کے دَور میں باقاعدگی سے اردو رسالہ نکالنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ میں آپ کی محنت، لگن اور کمٹ منٹ کا اعتراف کرتا ہوں۔ ''چہارسُو'' واحد جریدہ ہے جو میں باقاعدگی سے پڑھتا ہوں کیونکہ اس میں مجھے قابل ستائش مواد ملتا ہے۔ ویسے تو بہت سے رسالے آتے ہیں، ورق گردانی کی اور رکھ دیئے۔

اپنا سفر استقلال سے جاری رکھیے۔ اردو ادب کی خدمت کے لیے آپ جیسے محنتی اور ذہین ادیب کی ضرورت ہے ورنہ اردو ادب بالخصوص پاکستان اور ہندوستان میں انحطاط کا شکار ہو جائے گا۔

فخر زمان (لاہور)

برادرم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

آپ کا فقید المثال، جلیل القدر اور رفیع الشان جریدہ ''چہارسُو'' ملتا ہے تو آپ کے لیے دل سے دعا ہی نکلتی ہے۔ اوّل اس لیے کہ آپ گزشتہ ۲۲ سال سے ''چہارسُو'' کو پابندیٔ وقت سے شائع کر رہے ہیں اور یہ ایسی روایت ہے جس پر ادبی رسائل بالعموم عمل نہیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب ماہناموں کے بجائے ''کتابی سلسلے'' شروع ہو گئے ہیں اور تغیّر وتبدل کا وہ تحریکی عمل جو ماہنامہ پیدا کرتا تھا ترک کیا گیا ہے۔ دوم یہ کہ آپ نے اس کا زرِ سالانہ ''دلِ مضطرب، نگاہِ شفیقانہ'' مقرر کر رکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا بنیادی مقصد اچھے ادب کا فروغ ہے ادب کی تجارت نہیں۔ ادبی صحافت میں اس کی ایک ہی مثال ملتی ہے اور وہ ہے مولانا صلاح الدین احمد کی جنہوں نے ''ادبی دنیا'' کی ضخامت قریباً ساڑھے تین سو صفحات کر دی اور قیمت صرف ایک روپیہ رکھی۔ یعنی جب سب کچھ مہنگا ہو گیا تھا، مولانا صلاح الدین احمد نے رسالہ ''ادبی دنیا'' سستا کر دیا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ قاری کو یہ رعایت بھی حاصل تھی کہ سابقہ پرچے مطالعے کے بعد واپس کرنے پر نیا پرچہ مفت مل جاتا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد کی وفات کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا نے ان کی یاد میں ''اوراق'' جاری کیا تو ''ادبی دنیا'' کی روایت کو قائم رکھا۔ یعنی ''اوراق'' کی بڑی تعداد تخلیق کاروں کو بلا قیمت پیش کی جاتی اور سٹال پر پرچہ عام قاری کو بہت کم قیمت میں دستیاب ہو جاتا تھا۔ ''چہارسُو'' کی روش ان سب سے الگ ہے (ماشاءاللہ)

اہم ترین بات یہ ہے کہ ''چہارسُو'' نے اپنی پہلی اشاعت سے ادیبوں کو قرطاسِ اعزاز پیش کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ اس کے بائیسویں سال تک جاری ہے۔ یعنی اب تک چہارسو میں ۲۶۴ ممتاز ادیبوں کے گوشے چھپ چکے ہیں اور ''چہارسُو'' نے تحسینِ سخن شناس کا یہ کارِ لطیف ادیب کی زندگی میں کیا اور اور بہت سے ادبائے کرام اسی ''غم میں دُبلے'' ہو رہے تھے کہ اہلِ ادب نے ان کی قدر افزائی نہیں کی لیکن چہارسو نے ان پر گوشہ چھاپ کر انہیں احساس دلا دیا کہ وہ ادب کی اہمیت شخصیت ہیں۔ مثالیں تو بے شمار ہیں لیکن میں یہاں شہزاد احمد اور قمر علی عباسی کی مثال پیش کروں گا جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ''چہارسُو'' کے گوشے میں زندہ ہیں۔ اور اب ''چہارسُو'' ہی ان کا بہترین حوالہ ہے۔ آپ کے اس اقدام کی تحسین بھی ضروری ہے کہ آپ نے ہر ادیب کے باطن کو اپنے انٹرویو کے سوالات سے کھنگالا اور بہت سی نئی باتوں کو ان کی زبان سے کہلوایا۔ آپ نے انٹرویوز کی ایک کتاب چھاپی تھی جو میری میز پر ہر وقت موجود رہتی اور میرے کاموں میں معاونت کرتی ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ آپ ان انٹرویوز کی دوسری جلد بھی شائع کر دیتے۔ چہارسو کا ایک انٹرویو نمبر بھی چھاپا جا سکتا ہے۔

دکھ کی بات یہ ہے کہ چہارسو کے ایک مستقل قلمی معاون انوار فیروز گزشتہ دنوں وفات پا گئے۔ مئی جون ۲۰۱۳ء کی اشاعت میں ان کی ایک غزل اور ایک مضمون ''الیکشن کا زمانہ'' شائع ہوا تھا۔ گویا لکھنے والا خود فانی ہے لیکن اس کی تخلیق غیر فانی ہے۔ خدا کرے ان کی صاحبزادی نورین طلعت عروبہ ان کے سارے کلام کو محفوظ کر دے۔ میں چہارسو میں بڑی تاخیر سے حاضر ہو رہا ہوں۔ اسّی کا سال عبور کرنے کے بعد کئی اقسام کی بیماریوں نے حملہ کر دیا ہے۔ اس تمام عرصے میں اللہ تعالیٰ نے جتنی نعمتوں سے نوازا تھا اب آہستہ آہستہ ان کی میعاد ختم ہو رہی ہے لیکن میں ہر حالت میں خدا کا شکر ادا کرتا رہا ہوں اور باقی ماندہ نعمتوں سے گزارا کر رہا ہوں۔ زندگی کی ذمہ داریاں پوری کر چکا ہوں۔ ہاں قلم اور قرطاس کا حق باقی ہے۔ اس کی ادائی کے لیے ہی آپ کو خط لکھ رہا ہوں اور

''چہارسُو'' کے قارئین سے دعا کی درخواست کررہا ہوں۔

انور سدید (لاہور)

برادرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

روزے ہور ہے ہیں یا وہ معاملہ ہے ''ایک نہیں ہوا'' اور اگر ہو رہے ہیں تو ہوتی ہے تراویح سے فرصت کس وقت:

سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں

اپنا تو ایک نہیں ہوا، رہی تراویح تو بعد نماز عشا ۸ رکعت پڑھتا ہوں، پہلے بیس ہوتی تھیں۔ پھر مولانا محمد جونا گڑھی کا سعودی عرب کا چھپا ہوا ترجمہ قرآن مجید چند سال ہوئے ملا تو آٹھ رکعت پڑھنے لگا۔ انہوں نے لکھا ہے اتنی ہی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے۔

اتوار ۲۱/ جولائی کو جوگندر پال کی خیریت معلوم کرنے کے لیے دہلی اُن کے گھر فون کیا۔ ٹھیک ہیں، پڑھتے ہیں لکھنا چھوڑ چکے ہیں۔ جب ساڑھے آٹھ بجے شام میں نے فون کیا سو رہے تھے۔ میں نے کرشنا بھابھی سے کہا آپ کی خیریت (فون کرنے کے علاوہ) جب بھی گوپال کرشن مانک ٹالہ کو خط لکھوں معلوم کرتا ہوں۔ وہ بولیں '' وہ تو گزر گئے''۔ اتنا ہی صدمہ ہوا جتنا جوگندر کو ''انشا'' کراچی کے پچھلے شمارے کو پڑھ کر ہوا تھا جس میں محمد علی صدیقی کے انتقال کی خبر پڑھی تھی۔ رہ رہ کر روتے تھے۔ کیا آدمی تھا گوپال کرشن۔ آپ نے تو اُن پر چہارسو میں گوشہ بھی چھاپا تھا۔ زندگی کی تفصیل مجھ سے زیادہ جانتے ہوں گے۔ اگر اُن کے سورگ باشی ہونے کی خبر آپ چھاپ چکے ہیں تو وہ شمارہ مجھے نہیں ملا۔ یا یہ کہ میں نے نہیں پڑھا۔

مانک ٹالہ فکشن نویس بھی تھے اور محقق بھی۔ پریم چند پر ان کا بڑا کام ہے۔ جب ہم نے حیدرآباد (سندھ) میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے کو ہجرت کی تو میری ہندی ''پریم چند گھر میں'' کے ورقے اِدھر اُدھر اڑتے پھر رہے تھے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا تو آخری ورقے نہیں ملے۔ لکھنؤ رام لال کو خط لکھا کہ بھجوایئے۔ انہوں نے مانک ٹالہ کو ممبئی لکھا اور انہوں نے وہ ورقے فوراً روانہ کیے۔ میری اُن سے خط و کتابت پہلے بھی رہی تھی دوبارہ چل پڑی۔ مانک ٹالہ کو میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) کی چھپی ہوئی ''منگل سوتر'' (اردو ترجمہ) عرصہ ہوا بھیج چکا تھا۔ وہ خود اس سے پہلے ''منگل سوتر'' کو اردو کا جامہ پہنا چکے تھے۔ جب انہیں میرا ترجمہ ملا تو انہوں نے اپنا ترجمہ چھپوانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میرے ترجمے اور مقدمے کو انہوں نے ایک مضمون سے آراستہ کیا اور کتاب کو دہلی موڈرن پبلشنگ ہاؤس بھیج دیا۔ جنہوں نے اُسے آب وتاب سے شائع کیا۔ وہ کتاب ڈاکٹر آصف فرخی کو ایک کتابوں کی نمائش میں ملی اور وہ انہوں نے مجھے بطور تحفہ پیش کی۔ میں نے مانک ٹالہ کو اطلاع دی اور جب انہیں میرا نیا پتہ ملا تو انہوں نے پبلشر کو لکھ کر مجھے دس یا بارہ جلدیں بھجوائیں۔

زندگی کے آخری سالوں میں بصارت تقریباً کھو بیٹھے تھے۔ اپنی اردھانگنی کو کھو بیٹھنے کے بعد ممبئی میں تنہا رہ گئے تھے۔ بیٹی بیلجیم میں تھی اور اس کے جوان بچے بھی۔ اسلام آباد کی کسی کمپنی نے میری کہانی (بچوں کے لیے) ''سمندر میں جنگ'' کو فلمی روپ دینے کا ارادہ کیا۔ کینیڈا کی کسی کمپنی کے لیے یعنی انگریزی میں۔ میں نے بغیر لکھا پڑھی کے اس کا اسکرین پلے (انگلش) تیار کیا۔ پتہ چلا وہ یہ کام نہیں کریں گے کیونکہ کینیڈین کمپنی نے اپنا پروگرام بدل دیا ہے۔ محنت اکارت گئی۔ مانک ٹالہ کو خط لکھا ان کا نواسا Documentries بناتا ہے، انہوں نے اس سے لکھ کر معلوم کیا کہ یہ کام کون کر سکتا ہے۔ اس نے چند کمپنیوں کے نام لکھے لیکن ان کا کام ٹھیکے کا تھا کوئی بنوائے تو بنا دیں گے۔ یہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ تو جناب محنت گئی تو گئی۔ مجھے یقین ہے اگر وہ گھر سے باہر نکلنے والے دور کے مانک ٹالہ ہوتے تو یہ کام کر دکھاتے۔

مدن گوپال نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے لیے کلیات پریم چند بائیس جلدوں میں مرتب کی۔ میں نے اپنا سیٹ بائیس کی بائیس جلدیں اجمل کمال اور جوگندر پال کی وساطت سے مکمل کیا لیکن وہ کلیات نہایت ناقص ہے۔ پروف تو خیر ایک بار بھی نہیں پڑھا گیا ہے جتنی تحریر ہندی میں ہے جوں کی توں اردو لکھائی میں منتقل کر دی گئی ہے۔ مثلاً:

''ساتواں پرکرن: شِکچھا سے سمبندھ رکھتا ہے۔ سعدی نے شِکچھوں کے دوش اور گُن شِشیہ اور گرو کے پارسپرک ویوہار اور شِکچھا کے پھل اور وِپھل کا ورنن کیا ہے۔ ان کا سدھانت تھا کہ شِکچھا چاہے کتنی ہی اتم ہو مانو سوبھاؤ کو نہیں بدل سکتی اور شِکچھک چاہے کتنا ہی ودوان اور سچتر کیوں نہ ہو کٹھورتا کے بنا اپنے کاریہ میں سپھل نہیں ہو سکتا۔''

یقین مانیے یہ پریم چند کی زبان نہیں ہے نہ وہ اسے سمجھ پاتے۔ ان کا ''منگل سوتر'' کا اردو لکھائی کا روپ اتنا ہی کھٹن ہے۔ میرا کیا ہوا پریم چند کے اس آخری اور ادھورے ناول کا ترجمہ اگر پاکستان میں چھپے تو اس میں بہتوں کو دلچسپی ہوگی۔ اور تحقیقی کام کرنے والوں کو سہولت ہو جائے گی۔

چہارسو ملا۔ شکریہ۔ عافیہ والی نظم چھاپ کر آپ نے دلیری کا مظاہرہ کیا ہے۔ مگر وہ شمارہ مجھ تک بُری حالت میں پہنچا۔ ضروری نہیں آپ ایک اور کاپی بھیجیں بس لفافہ اس سے بہتر ہو تو اچھا ہوگا۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے امریکہ سے فون کیا۔ اپنائیت سے معمور جی خوش ہو گیا۔

حسن منظر (کراچی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ملا۔ گوشوں کا سلسلہ بہت ہی اچھا اور اہم ہے۔ یہ حوالہ جات کی حیثیت رکھتے ہیں اور اردو ادب پر کام کرنے والے کے لیے ایک خزانے کی طرح ہیں۔ اس بار سرورق پر یارِ دیرینہ فخر زمان کی تصویر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کا گوشہ عمدہ ہے لیکن ان کے اکادمی کے چیئرمین ہونے کے دوران دونوں دفعہ انہوں نے جو حوالہ جاتی کتب مرتب کرا کے شائع کیں ان کا

ذکر بھی ہو جاتا تو اچھا تھا۔ناصر بغدادی کا افسانہ ان کی اپنی طرز میں لکھا گیا اچھا افسانہ ہے۔ چہارسو جب بھی ملتا ہے ایک شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔اس بار اسے کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

رشیدامجد (راولپنڈی)

مکرمی ومحترمی جناب گلزار جاوید، آداب۔

آپ کا ارسال کردہ مجلّہ چہارسو جلد ۲۲، شمارہ جولائی اگست ۲۰۱۳ء وصول پایا ہمیشہ کی طرح دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔اتنی باقاعدگی سے پرچہ نکالنا یقیناً آپ جیسے ادب دوست انسان ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ پرچہ ہمیشہ کی طرح عمدہ معیار کا حامل ہے لیکن اس دفعہ دوسرے ممالک کے ادیب اور شاعر پچھلے پرچوں کی نسبت کم نظر آئے۔اس بار میری غزل میں ایک مصرعہ کمپوزنگ میں بے وزن ہوگیا۔اس میں مصرعہ درج ہے ''بے کراں حزن کی ایک لہر اٹھی تھی دل میں'' حالانکہ اصل مصرعہ ہے ''بے کراں حزن کی اک لہر اٹھی تھی دل میں'' جنابِ مشکور حسین یاد کی غزل کی بحر ہے فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فا۔لیکن ان کے ایک شعر میں مصرعہ درج ہے ''گھڑی میں ماشہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں توپ کا گولہ'' جو بروزن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن ہے شاید اس میں بھی کمپوزنگ کی غلطی ہے۔

اس پرچے میں جناب فخر زمان کا سیر حاصل تعارف مختلف مضامین کی صورت میں اور ان کے اعلیٰ کلام کی مدد سے کروایا گیا ہے جو لائق تحسین ہے۔اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔حصہ ''زنداں کا قیدی'' میں جناب محمود الحسن کے مطلع کا مصرعہ اولیٰ وزن سے گرا ہوا ہے۔شاید ''رہرورہِ الفت'' میں رہرو کی اضافت اس کو بے وزن کر رہی ہے اور شاید اصل مصرعہ یوں ہوگا ''رہروئے رہِ الفت پہ رواں اور بھی ہونگے'' سری واستو رند کا یہ شعر پسند آیا کہ ''ہمارے گھر پہ جو تختی لگی ہے......اسی پر ہے تمہارا بھی پتا کیا'' جناب رؤف خیر کی غزل کی ردیف سے ''باباشاہ گیلانی مرحوم ومغفور'' کی غزل کا ایک مطلع یاد آ گیا۔مطلع کچھ یوں ہے:

''بچوں کی طرح میں نے ترا غم سنبھال کے
یزداں بنادیا ہے اسے پوس پال کے''

جناب حنیف ساحل کی غزل اپنے اندر بڑی روانی لیے ہوئے ہے۔ انہوں نے اس زمین میں اچھے شعر نکالنے کی کوشش کی ہے۔گوشہ ''قیدِ جاں'' میں جناب پروفیسر زہیر کنجاہی کی غزل اس دفعہ عجیب جذباتیت لیے ہوئے ہے اور یوں لگ رہا ہے کہ شاعر محبت کی نوحہ گری اور گریہ زاری کرنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ جناب نور زمان ناوک کی غزل خوب ہے انہوں نے ردیف سناٹا کو خوب نبھایا ہے لیکن معذرت کے ساتھ ان کے ایک شعر کا مصرعہ ثانی بے وزن ہوگیا ہے شعر کچھ یوں ہے ''یونہی صحرا میں رہے سرگرداں......اپنے اندر تھا بلا کا سناٹا'' جناب تصور اقبال نے ''مفاعیلن مفاعیلن'' کی بحر اختیار کی لیکن اکثر شعروں میں خارج از وزن ہو گئے ہیں۔اس تنقید پر معذرت چاہتا ہوں۔لیکن میرا مقصود کسی کی دل آزاری کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ چاہتا ہوں کہ یہ احباب آئندہ اوزان وغیرہ کا خیال رکھیں اور میری تنقید کو مثبت پیرائے میں لیں۔حصہ نظم میں پروین شیر کی نظمیں خوب رہیں۔آپ کا ڈرامہ ''بغل بچے'' بہت پسند آیا اور اس کا ہر سین سکرین پر متحرک نظر آیا۔مجلّے میں موجود افسانے بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

انتظار باقی (جھنگ)

جناب گلزار جاوید صاحب، آداب۔

چہارسو اسکرین پر دیکھا۔سرِ ورق کو فخر زمان صاحب نے پورے کا پورا گھیر رکھا ہے۔شاندار لگا۔ چہارسو کے مابین گوشے کے علاوہ بھی بڑی رونق ہے۔آپ خود بھی اب کی مرتبہ ڈراما آباد کر رہے ہیں۔افسانوں کی آبادی میں آپ بتدریج اضافہ کر رہے ہیں۔ چہارسو آج بھی اردو مجلوں کا سرتاج ہے۔بہر حال آپ کو اور آپ کے ساتھ ''چہارسو'' کے لئے اپنی توانائیوں کو وقف کرنے والے آپ کے صاحبزادوں اور صاحبزادی کو بہت بہت مبارک ہو۔عبداللہ جاوید آپ سب کو خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ہم دونوں علالت کے سبب چہارسو کی محفل میں شریک نہ ہو سکے، میری ہی کوتاہی تھی۔اپنی کہانی اور عبداللہ جاوید کی ایک نظم اور ایک غزل (غیر مطبوعہ) منسلک کر کے آئندہ کی اشاعت میں شرکت کی خواستگار ہوں۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

پیارے گلزار، سدا خوش رہو۔

اس مرتبہ آپ نے اتنی بڑی ادبی شخصیت کو قرطاسِ اعزاز کے لیے کس طرح آمادہ کر لیا۔فخر زمان صاحب بہت پڑھے لکھے اور خوبصورت شخصیت کے مالک انسان ہیں۔شروع شروع میں پنجابی اسکرپٹ پڑھنے میں بڑی دقت ہوئی۔ایک دو بار کی کوشش سے ٹھیک طرح سے پڑھنا آ گیا۔اس سے قبل پنجابی اسکرپٹ پڑھنے کا موقع یا واسطہ صرف وارث شاہ کی ہیر رانجھا پڑھنے کا ملا تھا۔واہ واہ کیا کہنے، سوادآ گیا۔

ڈاکٹر جمال صاحب کا جی آیا نوں، دھرتی زادہ، اکھاں دا چانن، شعر دا بوٹا، پورٹریٹ اور دل نواز دل کا فخر زمان لاجواب ہیں۔براہِ راست میں آپ کے سوالات جس قدر دوٹوک تھے اُسی قدر فخر صاحب نے جوابات بھی لاجواب دیئے۔مضامین بالخصوص چانن دی آس، جہنم کی آگ، یک نفری فوج کا سپہ سالار، جد آپودھا پی پے گئی اور کعبہ میرے آگے فخر زمان صاحب کی شخصیت کو صحیح خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔محمد اقبال بھٹی نے فخر زمان صاحب کے کلام کا انتخاب بھی خوب کیا ہے۔

کہنے کو تو ہر ملک میں گھوما ہوں پھرا ہوں،
سوچوں تو جہاں تھا، وہیں چپ چاپ کھڑا ہوں

وہ اپنے ہاتھ میں آئینہ لے کے پھرتا ہے
وہ شخص جسے کہتے ہیں غنڈا محلے کا

انسان کو جینے کا سلیقہ نہیں آتا
اور آپ کو انسان کی عظمت کی پڑی ہے

واقعی یہ شعر پڑھ کر فخر زمان پر فخر ہونے لگتا ہے۔کیسی صاف اور سچی سوچ کے مالک انسان ہیں۔

ناصر بغدادی صاحب کا افسانہ ''صبح کے قریب'' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔سید سعید نقوی کا ''ذوقِ اسیری'' بھی اپنی طرز کا خوب افسانہ ہے اور جناب آغا گل نے ''کپوت'' میں بڑا تلخ منظر نامہ بلکہ حقیقت پیش کر دی ہے۔شعری حصے میں سریواستو رند کی غزل نذرِ غالب کے تمام اشعار خوب ہیں۔ حنیف ساحل، پنہاں، محمود الحسن، سرور انبالوی، خیال آفاقی، نسیم سحر اور رؤف خیر کے اشعار میں بھی جدت پائی جاتی ہے۔انل ٹھکر صاحب نے ''گمشدہ شناخت کا ایک باب'' تحریر کر کے ہمارے معاشرے کے تلخ حالات کو بے نقاب کیا ہے جسے پڑھ کر طبیعت ملول ہو جاتی ہے مگر دعا کے سوا کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔

اس بار آپ نے ''بغل بچے'' کے عنوان سے عمدہ ڈرامہ تحریر کیا ہے۔یہ بھی ایک طرح سے آج کے سیاسی حالات پر نپی تلی چوٹ ہے جس میں سیاستدانوں کے نت نئے چولے بدلنے پر طنز کیا گیا ہے۔یہ طریقہ عمدہ ہے اسی طرح بچ بچا کر اپنا کام کرتے رہیں۔ہر بار کی طرح اس بار بھی ڈاکٹر فیروز عالم کا ''ہوا کے دوش پر'' بڑا پُر لطف رہا۔آہستہ آہستہ ڈاکٹر صاحب کے قلم کی مشاقی نمایاں ہو رہی ہے۔دیپک کنول صاحب نے لتا منگیشکر جی کے حالات سے روشناس کرا کر بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو آغاز میں کس طرح مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔خط کے اختتام پر حصہ نظم کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔محترمہ پروین شیر کی Mercy Killing اور جھیل پر تیرتے گھروندے کے علاوہ ڈاکٹر حسن منظر کی نظم ''ایک آزاد روح کو خراجِ تحسین'' خاص طرز کی نظم ہے اس طرح کی نظمیں انگریزی ادب میں نظر آتی ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی نظم کا معیار کسی طرح بھی انگریزی نظم سے کم نہیں۔

یوگیندر بہل تشنہ (یو۔ایس۔اے)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چند روز قبل ''چہارسُو'' کا شمارہ جولائی/اگست ۲۰۱۳ء نظر نواز ہوا۔ لگتا ہے آپ کے کمپوزر صاحب انگریزی بالکل نہیں جانتے ورنہ

" It is urdu & only urdu which has given a boost to fully coloured version on its re-release in India"

کا بخیہ اس طرح نہ اُدھیڑتے جس طرح ادھیڑ کر انہوں نے میرے خط کی مٹی پلید کر دی ہے۔براہ کرم پروف بینی کی جانب دھیان دیجیے۔قرطاسِ اعزاز اس بار جناب فخر زمان کے نام کر کے آپ نے ایک بہت ہی اہم کام انجام دیا ہے کہ ہم اردو والوں تک اُن کی خدمات پنجابی ادب کے سلسلے میں پہنچا دیں۔پھر براہِ راست میں پانچ صفحات پر پھیلا آپ کا انٹرویو بھی کچھ کم افادیت کا حامل نہ تھا۔ مبارکباد۔فرخندہ شمیم کا Name Plate جتنا مختصر تھا اتنا ہی پر اثر! دیپک کنول نے اپنی یادداشت کے بل بوتے پر (یا ڈائری سے) ساڑھے چھ صفحے پر ایک صدی کا قصہ لکھ تو دیا لیکن لتا منگیشکر کی زندگی کے اہم واقعات سے چشم پوشی اختیار کر لی۔اُن اہم واقعات میں سے ایک تو بہت ہی مشہور بھی ہوا تھا جب ساحر لدھیانوی مرحوم کا فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' کا (فلم فیئر ایوارڈ) گیت ''جائیں تو جائیں کہاں'' جسے طلعت محمود اور لتا نے الگ الگ گایا تھا لیکن ایوارڈ لتا کے گائے ہوئے گیت کو ملا تو انہوں نے کسی صحافی کے سوال کے جواب میں خود ستائی کی انتہا کرتے ہوئے سارا کریڈیٹ خود لیا اور شاعر کی شاعری کو کوئی اہمیت نہ دی جس پر ساحر لدھیانوی مرحوم نے جو گیت کے خالق تھے، اپنی ہتک سمجھی اور تمام موسیقاروں کو ہدایت کر دی کہ اُن کے لکھے ہوئے نغمے لتا سے نہ گوائے جائیں پھر یہ ہوا کہ ایک نئی مغنیہ، سمن کلیان پور کو موقع مل گیا اور بہت عرصے تک یہ سلسلہ چلا لیکن بعد میں دونوں طرف کے لوگوں نے ان کے درمیان صلح کروا دی مگر ساحر کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔

''بغل بچے'' میں گلزار جاوید نے موجودہ ماحول کے مطابق دفتری ماحول کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔میں رومانہ رومی کا میری شاعری پر تبصرے کا شکر گزار ہوں۔

غالب عرفان (کراچی)

برادرِ محترم جناب گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' مل گیا۔سب سے پہلے ''قرطاسِ اعزاز'' میں فخر زمان کی اپنی تخلیقات اور اُن پر لکھے گئے مضامین پڑھے۔براہ راست میں سوالات بھی عمدہ ہیں اور جوابات بھی دلچسپ اور کچھ کچھ جانبداری پر مبنی ہیں۔اب آیئے دوسرے حصے کی طرف۔دوسرے حصہ میں سب سے پہلے افسانے زیرِ مطالعہ آئے۔پہلے ہی افسانہ پر دل ڈھل گیا۔بدنصیب ہوتے ہیں وہ بچے جو ایسی عورت کے ہاں پیدا ہوتے ہیں جیسے راحیلہ کی ماں۔افسانہ ''ذوقِ اسیری'' کا ہیرو اپنی مستقل مزاجی پر قائم نہ رہ سکا۔بیوی کی بات مان کر غلط راستے پر چل پڑا۔کپوت افسانے میں آغا گل نے آج کی حالتِ زار لفظ بہ لفظ بیان کر دی ہے اور کوئی خوف محسوس نہیں کیا۔سچ لکھنا آسان نہیں آغا گل نے یہ بھی کر دکھایا۔ فرخندہ شمیم نے ''نیم پلیٹ'' مختصر سی کہانی لکھی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نادار آدمی حسرتوں کا مجموعہ ہی ہوتا ہے۔نجیب عمر نے ''گھمن کا گھونسا'' میں معاشرے کی ایک گھمبیرتا کو کہانی کے ذریعے واضح کیا ہے۔آپ نے ۹ سین میں ''بغل بچے'' ڈرامہ خوب لکھا ہے۔غزلیں ساری پڑھ لی ہیں۔آصف ثاقب، غالب عرفان، رؤف خیر اور ابراہیم عدیل کی غزل اچھی لگیں۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسُو'' کا شمارہ مئی جون ۲۰۱۳ء استاذ گرامی ڈاکٹر شباب للت کے کرم سے نظر نواز ہوا۔ حد درجہ مسرت ہوئی کہ پاکستانی رسالہ چہارسو میرے مطالعہ میں آیا۔ آپ حد درجہ لائق مبارکباد ہیں کہ آپ کی ادارت میں اتنا اچھا خالص ادبی معیاری رسالہ شائع ہو رہا ہے اور آپ اردو کے فروغ میں بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔ پیشِ نظر شمارہ گوشۂ ڈاکٹر شباب للت پر محیط ہے۔ جو آپ کی ادبی بالغ نظری کا غماز ہے۔ بے شک موصوف ساٹھ سالوں سے اردو ادب کی شعری و نثری خدمات بے لوث انجام دے رہے ہیں۔ آپ نے ان خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے قرطاسِ اعزاز پیش کر کے بطور خاص اردو دنیا سے متعارف کرایا ہے۔ قرطاسِ اعزاز کے تمام مضامین معیاری اور معلوماتی ہیں۔ گوشہ کے علاوہ تمام مشمولات لائق مطالعہ ہیں بالخصوص آپ کا افسانہ ''ادھ کھائی بوٹیاں'' کافی پسند آیا۔

مقبول منظر (جھارکھنڈ، بھارت)

عزیزی گلزار جاوید صاحب، سلامت رہیے۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ معذرت اور شرمندگی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کہ میں فخر الزماں کے نام یا کام سے واقف نہ تھا۔ مگر چہارسو کا تو مشن ہی یہ ہے کہ وہ ہم جیسے لوگوں کو فخر الزماں جیسے ہمہ جہت شخصیات سے متعارف کروائے۔ اس سلسلے میں میری جانب سے شکریہ۔

افسانوں میں سعید نقوی کا افسانہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ انہوں نے احتیاج اور دیانت داری و اصول پسندی کے درمیان جنگ کو خوبصورت انداز سے پیش کیا ہے جس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔ آغا گل کا افسانہ دل میں تیر کی طرح پیوست ہوا۔ موجودہ پاکستان میں قتل و غارت گری کا جو ماحول ہے انہوں نے اسکی بہت ہی متاثر انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ فرخندہ شمیم کا ''نیم پلیٹ'' بھی خوب ہے اور اپنے اندر طنز کا نشتر لئے ہے۔ آپکا ڈرامہ بغل بچے ایک ہلکی پھلکی تحریر ہے جسے پڑھ کر اچھا لگا۔ اس دورِ آشوب میں کبھی کبھی ہلکی پھلکی چیزیں بھی مزہ دے جاتی ہیں۔ میں کچھ عرصے سے شاعری کے معیار سے عمومی طور پر مایوس ہو رہا ہوں۔ اگر مجھے ایمانداری سے اپنے خیالات کے اظہار کا موقعہ دیا جائے تو یہ عرض کروں کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ

ہر بولہوس نے عشق پرستی شعار کی
اب آبر و' شیوہ' اہل نظر گئی

شاید کہیں پڑھا تھا کہ کراچی میں ایک لاکھ چوبیس ہزار شاعر موجود ہیں۔ چہارسو ہی نہیں بلکہ برصغیر سے نکلنے والے تقریباً ہر مجلّے کا یہی حال ہے۔ میں یہ سطور انتہائی خلوص اور نیک نیتی سے سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ اس سے کسی کی دل آزاری مقصود نہیں۔ اگر ہم دیانت داری کے ساتھ خامیوں کی نشان دہی نہیں کرینگے اور صرف تعریف و توصیف کا ہی چلن اپنائیں گے تو اس سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

اس دفعہ خاص طور سے میں نے نوٹ کیا کہ حصہ غزل ''قید جاں'' کے عنوان کے تحت شائع ہونے والی چند غزلوں کا وہ معیار نہیں جسکا چہارسو متقاضی ہے۔ ''لتا منگیشکر'' پر دیپک کنول صاحب کا مضمون معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ ماسٹر غلام حیدر موسیقی کی دنیا کا بہت بڑا نام تھے اور لتا منگیشکر خود بھی اس بات کی معترف ہیں کہ وہ انہی کی وجہ سے فلم انڈسٹری میں متعارف ہوئیں۔ مسیقارِ اعظم نوشاد کو بھی موقعہ دینے میں ماسٹر صاب ہی کا ہاتھ تھا۔ غلام حیدر نے پاکستان میں فلم ''گلنار'' (جس میں شوکت تھانوی نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا) کی لازوال موسیقی دی تھی افسوس وہ ۴۹ سال کی نسبتاً کم عمر میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

ایک بار پھر ان تمام احباب کا شکریہ کہ جو اس ناچیز کی سرگزشت کو قابل توجہ پاتے ہیں البتہ انوار فیروز صاحب کے بے وقت رحلت نے جو صدمہ پہنچایا ہے وہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کیا خوب آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

فیروز عالم (امریکہ)

محترم و مکرم گلزار جاوید، سلام و رحمت۔

اس بار قرطاسِ اعزاز محترم فخر زمان کے نام رہا بلاشبہ فخر زمان اردو اور پنجابی زبان و ادب کا ایک معتبر نام اور حوالہ ہیں۔ ہر دو زبانوں میں موصوف کی خدمات گراں بہا ہیں۔ براہ راست میں آپ کے شوخ و شیریں اور تند و تیز سوالوں کے جواب قدرے غیر تسلی بخش ہیں۔ بعض سوالوں کے جواب دینا زمان صاحب نے مناسب خیال نہیں کیا اسی طرح کچھ جواب گول مول ہو گئے۔ یوں معلومات کے ذیل میں تشنگی کا احساس باقی رہا۔ البتہ یہ کمی ان کے پنجابی اور اردو کلام نے خاصی حد تک پوری کر دی۔ نثری حصہ بھی خوب ہے۔ ''نورِ وحدت'' کے عنوان تلے دونوں نعتیں عقیدت و حضوری کے جملہ رنگوں سے مزین اور معمور ہیں۔ افسانوی ادب کا انتخاب خاصا جاندار اور پُر وقار ہے۔ زندگی سے بھر پور کردار۔ منجھے ہوئے افسانہ نگار اور کہانی کار اپنی اپنی کہانیوں کو لے کر کامیابی اور کامرانی کے علمبردار ہیں۔ غزلیات کے پہلے حصے بہ عنوان ''زندان کا قیدی'' میں پروفیسر انتظار باقی، محترم سرور انبالوی، جناب پروفیسر آصف ثاقب، جناب محمود الحسن، محترم غالب عرفان، اور جناب صدیق شاہد اپنی اپنی غزل کے جلو میں جلوہ گر اور جلوہ زن ہیں۔ دل بستگی اور دل کشی کے جملہ سامان ان غزل نگاروں کے حقیقی ترجمان ہیں۔ ''قید جاں'' میں البتہ یہ مقبول اور محبوب صنفِ سخن کسی دائرے میں مقید نظر آئی۔ غزل اپنی شناخت آپ ہوا کرتی ہے پھر یہ پستی و پسپائی کیسی؟ نظمیں اپنے موضوعات کا احاطہ بھی کر رہی اور انصاف بھی۔

آپ کا تحریر کردہ ڈرامہ ''بغل بچے'' میں قصداً سب سے آخر میں پڑھا (لیکن بہ اہتمام) سچ پوچھیے تو ڈرامے کے حقیقی معانی آشکار ہوئے۔ آخر

میں حرفِ شکایت۔ کمپوزر نے میری غزل کا مطلع دیدہ دانستہ غلط کر دیا صحیح شعر یوں ہے۔ ''میں اپنا ترجماں ہوں......ولیکن بے زباں ہوں'' اسی طرح تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ ''نشاں'' کی جگہ نشان ہے۔

تصور اقبال (تلہ گنگ)

محترم گلزار جاوید، تسلیمات۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا، ممنون ہوں۔ شمارے میں چھ افسانے شاملِ اشاعت ہیں میں نے بطور قاری پوری ذمہ داری سے افسانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ناصر بغدادی کے افسانے ''صبح کے قریب'' کا مرکزی کردار ایک طوائف زادی ہے جس کا علم اس کے شوہر کو نہیں ہے، افسانہ نگار کہانی کو راہ پر لانے کے لیے اس جوڑے کو ایک محفل میں لے جاتا ہے جہاں ایک اوباش مرد طوائف کے حوالے سے اس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے لیے محفل کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے وہ تو خیر گزری کہ اس کا شوہر بڑے ظرف کا مالک تھا جو اس بجھتے دیے کے لیے فانوس بن گیا اور کہانی ختم ہوئی لیکن کہانی پر بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ عنوان گوارا ہے، متن کا عطا کردہ نہیں۔ ناصر کہنہ مشق افسانہ نویس ہیں یوں کہانی کا نِک سِک سے درست نہ ہونا عجیب سا لگا۔ افسانہ نگار (راوی) کہانی میں ضرورت سے زیادہ Involve ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی کی لذت سطح پر آتے ہی گم ہو جاتی ہے۔

''ذوقِ اسیری'' سید سعید نقوی کی تراشیدہ کہانی ہے۔ پردیس میں کیا کیا صعوبتیں انسان کی راہ تک رہی ہوتی ہیں اس کا علم وہاں پہنچ کر ہوتا ہے، گمان سا ہے کہ اس کہانی کا مرکزی کردار نقوی خود ہیں۔ اصول پرست ہونا بُری بات نہیں لیکن جب حالات انسان کا گریبان چاک کرنے پر تُل جائیں اور اَنا میں دراڑ پڑنے لگے تو سمجھوتہ کر لینا احسن قدم ہے۔ افسانہ مسلسل ہے اور ایک نشست میں پڑھے جانے کی قوت رکھتا ہے۔

لگتا ہے ''کپوت'' آغا گل نے ایک ہی ہلے میں تحریر نہیں کیا بلکہ مختلف وقفوں میں کہانی سے دست و گریباں رہے۔ قاری کو چونکانے کے لیے آپ کپوت جیسے عنوانات جماتے رہتے ہیں، قاری چونکا یا نہیں کم از کم میں نہیں چونکا کہ میں نے پچاس پچپن برس پہلے اپنی دادی سے یہ کہتے سنا تھا ''پوت کپوت پنگھوڑے سے پہچانے جاتے ہیں''۔ آغا صاحب نے کہانی کو Prolong کرنے کے لیے کچھ Unwanted واقعات بھی درج کیے ہیں۔ کہانی کا خمیر چونکہ کوئٹہ کی سرزمین میں اٹھا اس لیے مقامی زبان کے الفاظ کا استعمال اچنبھے کی بات نہیں لیکن اسے اردو لغت میں اضافہ نہیں کہا جا سکتا۔ ''ابا جی پابندی سے نماز پڑھا کرتا تھا'' اردو افسانہ ایسے جملوں کو رد کرتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار لیاقت بی۔اے کرنے کے بعد بے روزگار رہا۔ اس کا والد کریم الدین خودکش حملوں کے ڈر سے گھر میں دبک کر نماز پڑھنے لگا۔ مرزا اقبال اس کا دوست تھا جس نے لیاقت کو صحافت کی راہ سجھائی اور لیاقت نے صحافت کے کیا کیا چمتکار دیکھے۔ اصل کہانی اتنی ہے۔ مزید کچھ لکھوں گا تو آغا گل کہہ اٹھیں گے ''کسی ایسے سے مروایا ہوتا جس نے چار پہلے مار رکھے ہوں''۔

فرخندہ شمیم نے ''Name Plate'' لکھ کر ایوانوں میں ہونے والی ادبی بددیانتی کرنے والوں کے چہروں سے نقاب نوچا ہے۔ اردو ادب میں مترجم کا کردار اتنا ہی ہے کہ وہ کسی فن پارے کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کر دیتا ہے یوں مترجم تخلیق کار نہیں ہوتا، جانے کیوں اس پر واہ واہ کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں اور حقیقی تخلیق کار دُور کھڑا آنکھوں میں حسرت سجائے ان کو تکتا رہتا ہے۔ شب زاد بھی ایسا ہی تخلیق کار ہے، اللہ کرے فرخندہ کی آواز ایوانوں میں گونج اٹھے۔

''گھمن کا گھونسا'' نجیب عمر نے لکھا۔ آپ زود نویس ہیں لیکن کہانی کو Balance میں رکھتے ہیں۔ کرداروں کو سرکش نہیں ہونے دیتے لیکن گھمن کی بغاوت کا شکار ہوئے۔ فی الاصل کردار کہانی کا بے جان حصہ ہوتا ہے لیکن افسانہ نگار اس میں روح کی قوت پھونک دیتا ہے وہ حرکت کرتا ہے، بولتا ہے لیکن کہانی کے فریم میں اپنے خالق کے تابع رہتا ہے، کہانی کے The end کے ساتھ ہی کردار کی موت واقع ہو جاتی ہے مگر گھمن میں روح باقی تھی کہ ناول سے سرک کر کہانی میں آن دھمکا اور اپنے خالق پر اسلحہ تان لیا اور مکالمہ کرنے لگا، یہ مکالمہ کہانی کا اصل ہے۔

عظمیٰ صدیقی کی کہانی '' وقت کی شہزادی'' لندن کی ایک خوبصورت چمکدار صبح کی روداد ہے، احساس کا مکالمہ اپنے ہمزاد کے ساتھ، وقت کی اسیری کو رد کرتے ہوئے کہانی دعوتِ مطالعہ دیتی ہے۔ صفحہ ۵۰ پر دو نعتیں ہیں اور اتفاق سے دونوں مفاعلین x ۴ کے وزن پر ہیں۔ پہلی نعت سید محمد علی مضطر زیدی نے لکھی جس کے مطلع کے مصرعہ اولیٰ میں لفظ (بڑھا) کی جگہ (پڑھا) لکھا گیا اور مصرعہ ثانی میں (مرے) کی جگہ (میرے) چھپ گیا جو وزن میں خلل انداز ہو رہا ہے۔ مقطع کے مصرعہ اولیٰ میں بھی لفظ (پہ) کی جگہ (پر) لکھا گیا جس سے سکتہ کی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ دوسری نعت تشنہ بریلوی کی ہے۔ چوتھے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں لفظ (ہوتی) کی جگہ (ہوئی) لکھا گیا جس سے سقم آ جاتا ہے۔

احسان بن مجید (اٹک)

مدیرِ محترم، سلام و رحمت۔

اس مرتبہ ''چہارسُو'' ساون رُت کا پیامبر بصورت شرابور شمارہ ملا بھیگے بھیگے اوراق سکھانے میں وقت لگا تب کہیں جا کے پلٹنے کے قابل ہوئے اور مطالعے کی صورت ابھری۔

قرطاسِ اعزاز بنام جناب فخر زمان گزشتہ درخشاں روایات کا اعادہ و پیشرفت ہے۔ جملہ تحریریں و تاثرات اُن کی تخلیقی جہات پر بخوبی محیط ہیں اور اُن کی پہلودار شخصیت کی متنوع خصوصیات سے آگہی دیتی ہیں۔ براہِ راست ہمیشہ

کی طرح اپنے معیار و اسلوب کو قائم رکھے ہوئے ہے جبکہ مستقل قریب و بعید میں اُن کی سہ لسانی تخلیقات کے منصۂ شہود پہ آنے کی نوید بھی پائی۔

''ذوقِ اسیری'' کی اختتامی کشمکش کہانی کا کامیاب موڑ لیے ہوئے ہے۔ گھمن کا گھونسا اپنے ہی تخلیق کردہ کردار کا خواب میں جارحانہ انداز کہانی کے لیے دلچسپ و جدت آمیز تکنیک ہے۔ ''بغل بچے'' میں ڈرامائی سچویشنز کے لیے موزوں ترین طرزِ اظہار کے ساتھ آخر میں باس اور اُمیدوار کے مابین قدرِ مشترک کا ادراک منظر کو مزید اُجاگر اور جاندار بناتا چلا جاتا ہے۔

محترم قمر علی عباسی کی ہمہ جہت و باکمال شخصیت کی رحلت دنیائے ادب کے لیے بڑا سانحہ ہے۔ اُن کے سفرنامے کے ایک باب کا عنوان لاشعوری طور پہ یاد آتا ہے۔ قبرستان دیکھ کر مرنے کو جی چاہتا ہے اور بقول جناب مجتبیٰ حسین ''آپ اپنے سفرناموں کے حوالے سے بھی جنت میں داخلہ پانے کے حقدار بن گئے ہیں'' محترمہ شبنم شکیل کی کمی بھی اوراقِ چہارسو میں ہمیشہ محسوس ہوتی رہے گی۔ امید ہے ڈاکٹر شباب للت صاحب احباب کی دعاؤں سے صحت یاب ہو رہے ہوں گے اور اپنی بیش قیمت تحریریں ادب کو سوغات کرتے رہیں گے۔

جناب رب نواز مائل تک تازہ شعری مجموعے ''غزل بنایا اُسے جو نیا خیال ملا'' کی پرخلوص مبارکباد پہنچے۔ ڈاکٹر فیروز عالم صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی نایاب و خوشگوار فرصت کو اپنی پسند کے مطالعے کی نذر کر کے ذہنی سرشاری پائیں گے جو باعث خوشی ہے۔ حصہ نظم بھی موضوعات کی رنگارنگی سے مزین تھا۔ بلاشبہ لتا جی مہان گلوکارہ رہی ہیں مگر دیگر پہلوؤں سے بھی جاننا اچھا لگا۔ بالخصوص فنی لگاؤ اور کمٹ منٹ جواب ناپید ہو رہی ہے۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

اس بار قرطاسِ اعزاز اردو، پنجابی اور انگریزی کے ادیب اور سیاست دان فخر زمان کے نام ہے۔ ''جہنم کی آگ'' میں امرتا پریتم مرحومہ نے کچھ ماضی کو یاد کیا ہے اور اُن کے ناول ''بندی وان'' کی اہمیت اُجاگر کی ہے۔ شریف کنجاہی، محمد انعام الحق، محمد نظام الدین اور شاہین مفتی کے مضامین فخر زمان کی شخصیت، فکر اور پیغام کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوئے۔ شیخ عبدالرشید نے اُن کا تفصیلی تعارف (سوانح و خدمات) سلیقے سے پیش کیا ہے۔ محمد اقبال بھٹی نے کلام کا انتخاب خوب کیا ہے۔

اُن چند اصولوں کو میں چھوڑوں بھی تو کیسے
جن کے لیے اک عمر میں دنیا سے لڑا ہوں

''براہِ راست'' میں آپ کے اہم سوالات اور فخر زمان کے جوابات کہیں کہیں وہ ڈنڈی مار گئے۔ کسی زمانے میں سیاست ''خدمت'' کے لیے کی جاتی تھی مگر اب ''مفادات'' کے لیے میدانِ سیاست میں اترتے ہیں۔ فخر زمان صاحب نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا ''مجھے پیپلز پارٹی نے بہت عزت دی میں۔۔۔۔ وفاقی وزیر۔۔۔ اکادمی ادبیات پاکستان کا چیئرمین اور۔۔۔'' (ص۔۱۷) اس کا مطلب ہے کہ سیاست کے زور پر ایک خالص ادبی عہدہ حاصل کیا گیا۔

''بغل بچے'' ڈرامے میں آپ نے سماج کے نومنظر خوبی سے پیش کیے ہیں جس میں بے تکلفی اور اعتبار کی فضا ہے۔ بہت خوب گلزار بھائی۔ سید سعید نقوی کا افسانہ ہمیشہ متاثر کرتا ہے ''ذوقِ اسیری'' کی پیش کش اور کہانی کی بنت لاجواب ہے۔ فرخندہ شمیم کا افسانہ ''نیم پلیٹ'' میں ایک غریب اور خوددار فنکار کے احساسات کو پیش کیا۔ بین السطور میں ہمارے بے حس معاشرے اور مفاد پرستی پر طنز ہے۔ نجیب عمر کی کہانی ''گھمن کا گھونسا'' کے اختتام نے اسے تخلیقی فن پارہ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم ''ایک عام آدمی کی داستان حیات'' میں سچائی اور دلچسپی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ موجودہ قسط میں ''نجمہ شیخ'' والا واقعہ عجیب ہے کہ آئندہ کی زندگی میں یہ عقدہ کھلا کہ محترمہ نے ایسی حرکت کیوں کی۔

مشکور حسین یاد کی غزل مشکل ردیف سے سجی ہوتی ہے۔ آصف ثاقب غزل میں لفظوں کی نشست کا اہتمام عمدگی سے کرتے ہیں۔ انتظار باقی کا مطلع ہضم نہیں ہوا۔ غالب عرفان، یوگیندر بہل تشنہ، رؤف خیر، صدیق شاہد، رب نواز مائل، مسعود تنہا، عرش صہبائی، ابراہیم عدیل، نورزمان ناوک، اسد اعوان، سیفی سرونجی اور تصور اقبال کی غزلوں میں تازگی ہے۔ ڈاکٹر حسن منظر کی نظم ''ایک آزاد روح'' کو خراج تحسین نظم کیا ہے ہر مظلوم عورت کا نوحہ ہے۔ ڈاکٹر انیس الرحمٰن نے طنز و مزاح کے انداز میں سکھر کی سیر کروائی ہے مگر یہ سیر بہت مختصر ہے اس میں اضافہ کیجیے۔ بہت خوب۔ دیپک کنول نے ''ایک صدی کا قصہ'' میں ہیما یعنی لتا منگیشکر کے حالاتِ زندگی، جدوجہد، مشکل حالات سے صبر کے ساتھ مقابلہ، سُر سے لگن اور پھر کامیابی کو اس خوب صورتی اور جامع انداز میں پیش کیا ہے کہ اس مضمون میں ایک مختصر کتاب کا مواد جمع کر دیا ہے۔ لتا منگیشکر نے بڑی فنکارا بن کر بھی اپنے محسنوں کو ہمیشہ یاد رکھا۔

نوید سروش (میرپور خاص)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا جولائی، اگست ۲۰۱۳ کا شمارہ موصول ہوا جس کے لیے آپ کا بے حد شکرگزار ہوں۔ سب سے پہلے سرِورق پر نظر پڑی جو بہت دلکش تھا۔ اس بار فخر زمان کے حوالے سے ''قرطاسِ اعزاز'' بہت خوب تھا۔ امرتا پریتم کا ''جہنم کی آگ'' شاہ محمد مری کا ''یک نفری فوج کا سپہ سالار'' سید شبیر حسین شاہ کا ''کعبہ میرے آگے'' ڈاکٹر شاہین مفتی کا ''اصحاب کہف کی تمثیل'' اور قرطاسِ اعزاز کے دیگر مصنفین کے مضامین بہت خوب تھے۔ پنجابی ادب کے حوالے سے ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ فخر زمان سے کیا گیا انٹرویو قرطاسِ اعزاز کی جان تھا۔ دیگر مضامین میں ''ایک صدی کا قصہ'' لتا منگیشکر بھی بہت خوب تھا۔

ندیم ہاشمی (کراچی)

۔۔۔۔ جھرنوں سے رکرنیں ۔۔۔۔

ہم آتے ہیں تو حیرت میں ڈوبے ہوئے۔ جاتے ہیں تو یادوں سے لدے ہوئے۔ مگران یادوں کی پیدائش اور پرورش میں بھی ہمارا دخل کم کم ہی ہوتا ہے۔ کس سے ملے؟ کس حیثیت سے ملے؟ کب تک اور کس انداز میں ملتے رہے؟ ان ملاقاتوں نے ہم پر کیا اثر ڈالا؟۔ یہ انتخاب بلکہ اختیار بھی قسمت نے اس طرح اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کہ ہمیں کس زمانے میں، کس ملک میں اور کن حالات میں پیدا کیا اور زندگی کا سفر کن راہوں پر چلتا رہا۔ میؔر نے ویسے ہی تو نہیں کہا تھا۔

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے خودمختاری کی

لیکن میؔر یہ حقیقت فراموش کر گئے کہ ہمہ گیر مجبوری کے اس لق ودق صحرا میں کہیں کہیں ہماری مختاری کے نخلستان بھی آ جاتے ہیں۔ جن کے سبزے اور تازگی کا تناسب ہمارے اپنے طرزِ عمل کے مطابق ہوتا ہے کہ زندگی کی ان ملاقاتوں کو ہم کتنا خوشگوار بنا سکتے ہیں یا کتنا ناخوش گوار۔ اس طرح ہماری مختاری زیادہ تر حقوق العباد کے علاقے میں ہوتی ہے۔ شاید حقوق اللہ کے تحت بھی میسّر ہو۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی محدود سی مختاری کی تاثراتی عکاّس ہے۔ جس میں جھانکنے والے ماضی کے چند چہرے وقت کی زقند بھر کے میرے حال میں شامل ہو گئے تھے۔ ۔۔۔۔مسعود مفتی

اشاعت ۲۰۱۳، قیمت ۳۰۰ روپے، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد

۔۔۔۔ کُچھ دیکھے کُچھ سُنے ۔۔۔۔

جناب نندکشور وکرم اردو ادب کے ایسے افسانہ نگار، محقق، مترجم، مدیر اور ناشر ہیں جو ہمہ وقت تحرک کو زندگی کا جز وگردانتے ہیں۔ آپ نے اب تک اردو ادب کو جس قدر علمی، ادبی اور تحقیقی کتب کا ذخیرہ فراہم کیا ہے اگر اُس کی تفصیل ایک نظر میں ہماری آنکھوں سے گزرے تو تحیّر کی ایسی دنیا ہم پر آشکار ہوگی کہ جس سے صحیح سلامت نکلنا دشوار ہوگا۔ وکرم صاحب کی تازہ تخلیق ''کچھ دیکھے کچھ سُنے'' اردو ادب کی چوبیس انتہائی بلند قامت شخصیات کے حالاتِ زندگی اور فنی آئینہ اس قدر خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ اردو ادب کو اس کارنامے کے لیے نئے معنی اور مفہوم تراشنا ہوں گے۔ آپ کے اشتیاق کے پیشِ نظر سبھی اسمائے گرامی درج کیے جا رہے ہیں۔ جناب احمد ندیم قاسؔمی، پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ، محترم جمنا داس اختؔر، جناب حبیب جالبؔ، استاد دامؔن، شری دلیپ سنگھ، جناب دیوندر اسّر، جناب دیوندر سیتارتھی، جناب ساحؔر ہوشیار پوری، محترم سردار جعفرؔی، ڈاکٹر شباب للتؔ، جناب شرؔر فتح پوری، جناب شورش کاشمیرؔی، شری صابر دتؔ، محترمہ قرۃ العین حیدرؔ، جناب کیلاش ماہؔر، پروفیسر گوپی چندؔ نارنگ، جناب اسرارالحق مجازؔ، محمد طفیلؔ صاحب، منیر نیازؔی صاحب، نارنگ ساقؔی صاحب، ہنس راجؔ رہبر صاحب۔ آخیر میں وکرم صاحب نے بقلمِ خود کے عنوان سے اپنے حالاتِ زندگی تحریر کیے ہیں جو بجائے خود اپنے اندر معلومات کا بے پناہ خزینہ لیے ہوئے ہیں۔ ۔۔۔۔عروب شاہد

اشاعت ۲۰۱۳ء، قیمت ۲۵۰، دستیابی F14/21-D، کرشن نگر، دہلی، بھارت۔

۔۔۔۔ مکاتیبِ مشاہیر ۔۔۔۔

خطوط کی لاثانی، معاشرتی، تاریخی اور تہذیبی اہمیت مسلّم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں خطوط کی تدوین کا کام جاری ہے۔ میں شکر گزار ہوں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے اربابِ بسط وکشاد کا جنھوں نے میرے موضوع کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کرتے ہوئے مجھے ''مکاتیبِ مشاہیر بنام حق نواز خاں'' کی ترتیب وتہذیب اور حواشی وتعلیقات پر ایم۔فل کے لیے مقالہ لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مجھے محترم حق نواز صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جو ضعف اور بیماری کے باوجود خطوط کی فراہمی اور انتخاب کے علاوہ اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ اس مقالے میں پچیس مشاہیر کے ایک سو خطوط ہیں جن کو الف بائی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے۔ تمام مکتوب نگاروں کے خطوط کو توجہ، دقتِ نظر اور محنت سے پڑھنے، نقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۔۔۔۔سید نصرت بخاری

اشاعت ۲۰۱۲، قیمت ۱۰۰ روپے، جمالیات پبلی کیشنز، اٹک۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
فیض شناسی
ڈاکٹر سید تقی عابدی
ڈاکٹر سید تقی عابدی
A Siasat Publication